اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال

یعنی

نذر اخلاص بجناب
ملک اسلم حیات صاحب
از
محمد اجمل خان
نئی دہلی ۲۲ فروری ۵۶ء

پس منظرِ اسلام

ہر چہار حصہ

حصہ اوّل :- اسلام سے پہلے دُنیا کی حالت
حصہ دوم :- اسلام سے پہلے عرب کی حالت
حصہ سوم :- مقدمہ سیرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
حصہ چہارم :- حیات سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم

پروفیسر الحاج محمد اجمل خاں ایم۔اے

ناشر
قومی کتب خانہ۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی
قیمت ۶ روپے

باہتمام مولوی عبداللطیف ہمدرد برقی پریس کوچہ چیلان دھلی میں

چھپ کر

قومی کتب خانہ اُردو بازار جامع مسجد دہلی

سے شائع ہوئی

بار اوّل — چار ہزار

قیمت — چار روپے

حصہ اوّل

اِسلام سے پہلے دنیا کی حالت

فہرست مضامین پہلا حصّہ

تعارف

پس منظر اسلام کے چار حصے ہیں۔ (۱) اسلام سے پہلے دنیا کی حالت (۲) اسلام سے پہلے عرب کی حالت (۳) اسلام سے پہلے مکی زندگی۔ چونکہ رسول کریم ؐ کی وہ زندگی جو مبعوث ہونے سے پہلے کی ہے، وہ بھی ایام جاہلیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بھی یہاں بیان کر دی گئی ہے، لہذا چوتھا حصہ حیات نبوی پر مشتمل ہے جس میں مبعوث ہونے تک کے واقعات و حالات بیان کئے گئے ہیں۔

سیرت نبوی، حقیقت میں نبوت کے بعد کی چیز ہے اور اس پس منظر کے بعد وہ علیحدہ جلد میں مکمل بیان کی گئی ہے۔ یہ پس منظر نہ صرف تاریخ عالم بلکہ تاریخ ادیان جاہلیہ اور خصوصیت سے روحانیت و مادیت کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے جو اسلام سے پہلے دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔

دیباچہ مُصنّف

مسلمانوں نے یورپ میں اسپین سے اسلام اور اسلام کے ساتھ ساتھ آزادی زبان و قلم کا تصور پہنچایا تو مسلمانوں ہی کے بنائے ہوئے کاغذ نے یورپ والوں کو کلیسا کی غلامی سے آزاد کرایا پھر وہ توراۃ و انجیل کو سمجھنے اور یونانی و اسلامی افکار سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ذہنی انقلاب سے سماجی اور سماجی انقلاب سے علمی انقلاب کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اور آخر کار جب امریکہ کی دریافت نے ثابت کر دیا کہ زمین گول ہے، اور بھاپ کی طاقت نے یہ بتلایا کہ مشین سے صنعت و حرفت کی ترقی معاشی انقلاب پیدا کر سکتی ہے، تو پرانے فکری سانچے ٹوٹنے لگے اور نئے تصورات نے انسانی فکر و عمل میں انقلاب پیدا کر دیا حتیٰ کہ روحانیت اور تاریخی مادیت کی وہ بحث جو چارواک دہری اور ویدانتیوں نے ہند میں کی تھی اور ہرقلیطس اور افلاطون نے یونان میں شروع کی تھی پھر نئے رنگ میں سائنس اور مذہبی توہمات کے تضاد کی صورت میں عہد حاضر میں دنیا کے سامنے آ گئی۔

جب مستشرقین یورپ نے قرآن اور اس کے متعلقات کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا تو نصرانی مذہب کے مشنریوں نے یوروپین سامراج کے طلایہ کے طور پر دنیا میں کمزور راویوں اور ضعیف روایتوں کی مدد سے پھر مذہب میں خامیاں نکالنا شروع کیں۔ لیکن مستشرقین کی جماعت مشنریوں کی طرح تنگ نظر نہ تھی وہ اپنے علمی طریقے پر تحقیق کا فرض انجام دے رہی تھی اور اگر کہیں راستہ گم کرتی تھی تو وہ بھی فراخ دلی سے تسلیم کر لیتی تھی اسلام کی بنیادی کتاب قرآن کریم ہے اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہر زمانے میں تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ تفسیریں بھی مسلمانوں اور خصوصاً نامسلمانوں کو اسلام کی حقیقت تک نہ پہنچا سکیں؛ اور مستشرقین بھی مجبور ہو کر اُن ہی نظریات کو ماننے لگے جو اسلام کے نام سے خوش عقیدہ مسلمانوں نے عام کر دیئے تھے۔ لیکن اُنیسویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے میور، کیمر، وائل، نوئل دیکے، گرم اور ہرشفیلڈ نے قرآن کریم کی نزولی ترتیب معلوم کرنے کے لئے سخت

جدوجہد کی جس کا نتیجہ ہوا کہ قرآن اور اسلام کے متعلق مشنریوں کے پھیلائے ہوئے نظریات کہر کی طرح چھنٹ گئے اور باسورتھ سمتھ، ہگنز، کارلائل اور رارونگ جیسے لوگ پیدا ہونے لگے اور ایسے بھی آدمی نظر آنے لگے جو ڈین ڈڈریڈ وغیرہ کی طرح الحاد وانکار کے باوجود اسلام او بانی اسلام کا صحیح درجہ پہچاننے کی کوشش میں تھے۔ حتیٰ کہ خود لینن بھی اپنے آخری وقت میں (بقول ہرحسان سہروردی) بانی اسلام کی زندگی اس نقطۂ نظر سے پڑھا کرتا تھا کہ صنعتی انقلاب کے علاوہ وہ کیا محرکات تھے جنہوں نے محمد (صلعم) کی جاہل قوم کو عالمی انقلاب کا پیش رو بنا دیا تھا۔

بہرحال ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کے چند اہل علم حضرات نے یہ طے کیا کہ حقیقت میں وہ سب مذہب اور فلسفے جو روحانیت کی تعلیم دیتے ہیں ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ اور الہ آباد میں ادارہ ناموس الہیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر یہ طے ہوا کہ روحانیت اور مادیت کے نظری اور عملی پہلوؤں سے کوئی شخص اتنا بہتر واقف نہیں جتنا کہ حضرت الشیخ مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہیں۔ اس لئے راقم الحروف ۱۹۳۵ء کو حضرت مولانا مرحوم سے مکہ میں ملا۔ مرحوم ہمارے ادارہ کے پروگرام سے بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ اس کے ساتھ ساتھ امام ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفے کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اور اس کے بعد ہمارا ادارہ اُن کی وفات تک اُن سے مستفید ہوتا رہا۔

ہمارا پروگرام یہ تھا کہ حقائق و معارف اسلام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تین مختصر مگر جامع کتابیں لکھی جائیں جن کو پڑھ لینے کے بعد ہر مسلمان اور نامسلمان آسانی سے اسلام کے ہر پہلو کو سمجھ لے۔ ان میں سے دوسری کتاب سب سے اہم تھی اور کسی مسلمان نے اس سلسلے میں کوئی عملی کام گزشتہ تیرہ سو برس میں نہیں کیا تھا۔ شاید دور حاضر سے پہلے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لئے کہ غیر اسلامی دنیا کے زبان و قلم پر کلیسا اور پجاریوں کی جماعت نے مہر لگا رکھی تھی۔ بہرحال سالہا سال کی محنت کے بعد ترتیب نزول قرآن کریم پر ایک رسالہ لکھا گیا۔ جس کے متعلق حضرت مولانا عبید اللہ سندھی (مرحوم) نے ان لفظوں میں فرمایا۔

"قرآن عظیم کی ہر سورت کے متعلق مفسرین کے پاس روایتیں موجود ہیں کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی یا مدینہ میں لیکن متعدد سورتوں کے متعلق روایتیں اس قدر مختلف ہیں جن کی تطبیق و ترجیح بآسانی ممکن نہیں۔

بعض احکام کی تاریخ ان روایتوں کی تغلیط کرتی ہے۔ محقق مفسرین اپنے مسلمہ نظریات کی مدد سے ان روایتوں کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ روایتی سلسلہ ناقابل اطمینان ہوگیا ہے۔ مولانا محمد اجمل خاں کا ان مفسروں پر ہمیشہ احسان رہے گا۔ انھوں نے اندرونی شہادت کی مدد سے مکی سورتوں کے معیّن کرنے کا راستہ کھول دیا ہے اور روایات کے اختلاف سے جو اغلاق پیدا ہوا تھا اُسے دور کرنے کی پوری کامیاب کوشش کی ہے۔"

غرضیکہ ہم نے اپنے پروگرام کے مطابق اسلام کے حقیقی اور بنیادی خط و خال نمایاں کرنے کے سلسلے میں تین کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے پہلی کتاب "پس منظر اسلام" ہے اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب "ترتیب نزول قرآن کریم" سنہ ۴۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اور اسی ترتیب کی بنا پر تیسری کتاب "سیرت سیدنا محمد صلعم" ہے جو تیار ہے۔ اسے اردو اور انگریزی میں شائع کرنے کے بعد ایشیا کی متعدد زبانوں اور یورپ کی چند زبانوں میں جلد شائع کر دیا جائے گا۔ اس سیرت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پورے قرآن کو سیرت نبوی کے تاریخی سلسلے میں ترتیب نزول کے مطابق بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اب قرآن و سیرت کا کوئی پہلو تشنۂ تفسیر و تشریح نہیں رہا۔ اور اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال اپنے پس منظر کے ساتھ اس طرح نمایاں ہو گئے۔ کہ ہر شخص بغیر کسی دقت کے اسلام کے مالہٗ اور ما علیہ کو پورے طور پر سمجھ سکتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

محمد اجمل خاں

۱۹۔ اکبر روڈ۔ نئی دہلی
شنبہ ۱۸ر جون سنہ ۱۹۴۹ء ہندی
یوم الاحد ۲۰ر شعبان سنہ ۱۳۶۸ھ

پہلی فصل

ابتدائے آفرینش اور اس کے بعد

عربی زبان میں سورج مونث ہے۔ شاید اس لئے کہ ہمارے نظام شمسی کی ماں سورج ہی ہے۔ یعنی زمین، اور دوسرے سیّارے منگل، بُدھ، برہسپت، شکر اور سنیچر جنہیں عربی میں مریخ، عطارد، مشتری، زہرہ، زحل اور فارسی میں بہرام، تیر، برجیس، ناہید اور کیوان کہتے ہیں۔ سب سورج ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہماری زمین کی تو کیا حقیقت ہے۔ خود سورج اس کائنات کی بے پناہ لامتناہیت میں ایک ذرّہ ہے۔ ذرۂ بے مقدار سورج تو ہم سے ۹½ کروڑ میل کے فاصلے پر ہے، لیکن ہم کائنات کی وسعت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو سورج کی دوری، دوری نہیں رہتی۔ جب زمین سے قریب ترین ستارہ اتنی دُور ہے۔ کہ روشنی کی رفتار (ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سیکنڈ) سے گولی ماری جائے، اور وہ ساڑھے چار سال چلتی رہے۔ تب وہاں تک پہنچے، تو دور کے ستارے کتنے دور ہوں گے!

ایچ جی ویلز نے اس حساب کو چھوٹا کر کے یوں دکھایا ہے۔ کہ "اگر ہم زمین کو ایک انچ موٹا گیند مان لیں۔ تو اس حساب سے سورج ۱۰۸ انچ (تین گز) موٹا اور ۳۲۳ گز کے فاصلے

پر ہوگا۔ اور چاند جو زمین سے بہت چھوٹا ہے۔ زمین سے ڈھائی فٹ کے فاصلے پر مٹر کے دانے کے برابر ہوگا۔ اور اتنے چھوٹے پیمانے پر قریب ترین ستارہ چالیس ہزار میل کے فاصلے پر ہوگا" (تاریخ ص ۵)

زمین کب سورج سے الگ ہوئی۔ یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ لوہے، تانبے، مٹی کے ایک پگھلتے ہوئے کڑھاؤ سے اچھل کر ایک چھینٹ دور اڑ گئی اور اسی کڑھاؤ کے گرد گردش کرنے لگی۔ ہماری طبیعات و طبقات الارض، ہمارا نجوم اور ریاضی ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ محض اندازہ ہے کہ یہ واقعہ دو ارب سال پہلے ہوا ہوگا۔ رفتہ رفتہ یہ پگھلا ہوا مادی ڈھیر ٹھنڈا ہوا ہوگا۔ اور چالیس کروڑ سال کے بعد زمین کی اوپر کی سطح پر چٹانیں بننے لگی ہوں گی۔ پھر اسی کروڑ سال گزرنے کے بعد بھاپ نے پانی کی شکل اختیار کر کے خشکی و تری، دریا و پہاڑ کو الگ الگ کر دیا ہوگا۔

زندگی کی ابتدا

کائنات کی اس حیرت انگیز وسعت و پہنائی میں، اب تک یہ معلوم ہو سکا ہے کہ صرف اس ننھی سی زمین پر زندگی کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی زمین سے پانچ میل اوپر اور تین میل نیچے تک۔ باقی کل عالم بظاہر بے جان ہے۔

غالباً سب سے پہلے کیچڑ میں سورج کی حرارت نے نباتاتی زندگی کو ترقی دی۔ پھر جل کپڑے بنے اور رفتہ رفتہ مینڈک، سانپ اور ایسی مچھلیاں بننے لگیں جن میں ریڑھ کی ہڈی بن گئی تھی۔ آنکھوں اور دانتوں والے جاندار بننے لگے تھے۔ پھر تری سے نکل کر خشکی پر سبزی کا ظہور ہوا۔ اور ایسے کیڑے اور مینڈک بن گئے۔ جو خشکی و تری دونوں میں رہتے تھے۔ اور دو جنمے یا دو گھرے (AMPGIOUS) کہلاتے تھے۔

جیسی ضرورت ہوتی تھی - ویسے ہی حفاظتی اعضا بھی بن جاتے تھے - کسی جانور کی پیٹھ پر سخت کھپری پیدا ہو رہی تھی - کوئی مچھلی اپنے پروں سے زیادہ کام لیتے لیتے پرندہ بن رہی تھی - اور کہیں کہیں پرندوں کے علاوہ ایک دودھ پلانے والے جاندار کا بھی ظہور ہو رہا تھا ؞

انڈا دینے والے جانور، سانپ اور کچھوے وغیرہ اپنے بچوں کو جلد چھوڑ بیٹھتے تھے - لیکن دودھ پلانے والے جانور اپنے بچوں کو اپنا ہی جزو سمجھتے تھے - اور دودھ پلانے کے بعد بھی اُن کی خوراک اور حفاظت کی تدبیریں سوچتے تھے - اور جب یہ سب ساتھ رہنے لگے - تو سانپوں کی سی زندگی ختم ہوگئی - اور سماجی زندگی کی بنیاد پڑ گئی شاید اسی وجہ سے قدیم دُنیا نے سانپ کے قسم کے انفرادیت پسند جانوروں کو ایک ساتھ رہنے والے جانوروں یا انسانوں سے مختلف قسم کا جاندار سمجھا تھا - بہر حال انڈا دینے والے جانوروں کے مقابلے میں دودھ پلانے والوں کو ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانے کا زیادہ موقع ملا - ان کا دماغ بڑھنے لگا - اور دماغی ورزش نے عقل و تمیز کو بھی بڑھا دیا ؞

زمین کی یہ حالت رہی کہ کبھی برفانی طوفان اور سیلاب آجاتے تھے - اور کبھی آتش فشاں پہاڑ آگ برسانے لگتے تھے - برف و باراں میں بڑے بالوں والے گینڈے اژدھے اور شیر فنا ہو جاتے تھے جتنی کہ ریچھ بھی سردی اور بھوک کا شکار بن جاتے تھے - گرمی کے دور میں نئے نئے جانور پیدا ہوتے رہتے تھے جن میں اکثر کا وجود بھی اس دُنیا میں نہیں رہا - کہیں کہیں ڈھانچے پائے جاتے ہیں - زمین کے طبقوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ آج سے چھ لاکھ سال پہلے اس زمین پر پہلا برفانی دور گزر رہا تھا - اور کوئی پچاس ہزار سال پہلے

آخری یا چوتھا برفانی دور گزرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانے کے اواخر میں انسان کی قسم کا دودھ پلانے والا جانور دُنیا میں پیدا ہو چکا تھا۔

لیکن انسان سے بہت پہلے دُنیا میں دودھ پلانے والے جانور موجود تھے۔ ان میں بن مانس، بندر اور لنگوروں کے دماغ میں عقل کی جھلکیاں آ چکی تھیں۔ اور آج سے چار کروڑ سال پہلے اس قسم کے جانور دُنیا کے معتدل ملکوں میں کثرت سے موجود تھے۔

پرانا حجری زمانہ

آج سے تیس چالیس ہزار سال پہلے کے زمانے کو حجری یا پتھر والا زمانہ کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں انسانی عقل نے پتھر کے ہتھیار بنا کر شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پتھر ہی سے وہ چٹانوں پر تصویریں کھودتے تھے۔ جسے عربی میں کتبہ کہتے ہیں۔ اسی کھرد سینچنے سے انسان نے رفتہ رفتہ تصویروں کی ابجد بنالی اور لکھنا یا کتابت وجود میں آ گئی۔ پہلے پتھر کی سلیوں اور مٹی کے ٹھیکروں پر لکھتے تھے۔ پھر کھالوں یا پوست پر لکھنے لگے۔ (جبتک اب تک کتاب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) اور پھر جب مسلمانوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ لیا تو دُنیا بھر میں کاغذ عام ہو گیا۔ اور ہر جگہ علم کی روشنی پھیلنے لگی۔

نیا حجری زمانہ

دس پندرہ ہزار سال پہلے شکاری زندگی کے ساتھ ساتھ لوگوں نے کاشتکاری بھی شروع کر دی تھی۔ اور ایسے اوزار بنانے لگے تھے۔ جنہیں وہ تراش کر سڈول کرنا سیکھ گئے تھے۔ ان گڑھ پتھروں سے اب کام نہ لیتے تھے۔ یہ نیا حجری زمانہ کہلاتا ہے۔

کاشتکاری سے پہلے ہی مویشیوں کو سدھانا شروع ہو گیا تھا۔ اور جب

شکار نہ ملتا تھا تو ان سے خوراک کا کام لیا جاتا تھا۔ کاشتکاری کے زمانے میں اُن سے کام بھی لیا جانے لگا۔ انسان کی قربانی بھی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ سفر اور کاشتکاری کی ضرورتوں نے ستاروں کا علم پیدا کر دیا۔ اور تجربہ نے یہ بتایا کہ خاص خاص موسموں میں خاص خاص ستارے آسمان پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مصر کے اہرام اور بابل کے اُونچے اونچے چبوترے نما مندر اس بات کی یادگار ہیں۔ کہ آسمان سے قریب ہو کر دیکھنے کا فن قدیم زمانہ میں کافی ترقی کر گیا تھا۔ اسی طرح امریکہ میں مایا تہذیب کے آثار میں ہزاروں قسم کی جنتریاں پائی گئی ہیں۔ غرضیکہ نجوم کے علم سے موسم، مہینہ اور سال کا اندازہ ہونے لگا۔ اور اکثر قوموں میں دنوں اور مہینوں کے نام سورج، چاند اور دوسرے سیّاروں کے نام پر رکھے جانے لگے۔ جو یورپ اور ہندوستان میں اب تک جاری ہیں۔ البتہ عربی اور ایرانی زبان سے اسلام نے ان ناموں کو ہٹا کر دوسرے نام رکھ دئے ہیں۔

اِنسان کا جنّت سے نکلنا

اس زمانے میں انسان کی حالت بچوں کی سی تھی۔ نہ آج کا غم تھا نہ کل کی فکر۔ ہر طرف خودرو پھلوں اور جانوروں کی بہتات تھی۔ مچھلی، مینڈک، سانپ اور چڑیاں۔ چوپائے پھلوں اور ترکاریوں کا کام دیتے تھے۔ کسی کو سانپ نے ڈس لیا۔ تو اُس کی موت کو گہری نیند سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ کسی کی ٹانگ درخت سے گر کر ٹوٹ گئی تو درخت کا قصور سمجھا گیا۔ اور اُسے مرنے کے لئے پڑا رہنے دیا۔ اور اُس درخت پر پتھر مارے گئے یا ڈر کر اُدھر سے گزرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔ سب کی حالت یہ تھی کہ نہ جینے کی خوشی تھی نہ مرنے کا غم۔ کبوتروں کی طرح پیدا ہوتے تھے۔ اور اُسی طرح مر جاتے تھے۔

لیکن جب سے انسان نے اپنے تجربوں کو پرکھنا شروع کیا اور یہ دیکھا کہ دُنیا میں خاص خاص چیزوں کا خاص اثر ہوتا ہے۔ اور اُس پر عمل کرنے سے ہمیشہ وہی نتیجہ نکلتا ہے۔ تو وہ اپنی بے خبری کی نیند، اُس فارغ البالی کی بے خودی اور بے فکری کی جنت سے نکال دیا گیا۔ اب وہ اپنے تجربوں پر عمل کر کے کل کی فکر کرنے لگا۔ اُس کا آج، کل کی تیاری ہی میں لگ گیا۔ یہی محنت کی ابتدا تھی۔ اور یہی ترقی کی بھی پہل تھی ۔

پہلے انسانوں کی حالت

آج سے تیس چالیس ہزار پہلے ابتدائی انسان طرح طرح کے ہتھیار بنا کر شکار کھیلتے تھے۔ جانوروں کو سدھار کر کام لیتے تھے۔ اور سیپ اور گھونگھوں کے زیور بنا کر پہنتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے غاروں کی چٹانوں پر جانوروں کی تصویریں بھی بناتے تھے اور کھالیں پہنے ہوئے یا ننگے پھرا کرتے تھے ۔

سائنٹیفک تجربہ

(ہر چیز ہمیشہ ایک اثر رکھتی ہے (سلسلہ علت و معلول) ابتدائی انسانوں کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو جانوروں اور بچوں کی حالتوں کا مطالعہ کیجئے۔ اپنی حفاظت اور آرام کے لئے انسان سب کچھ کرتا ہے لیکن آرام کے مقابلے میں اپنی حفاظت کا خیال سب سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ یہ خیال تکلیف کے ڈر سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے بچوں اور جانوروں میں شاید ڈر اور خوف کا جذبہ سب سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں سوچتا ہے۔ سب سے پہلے نگہبان اور نیک مشورہ دینے والے ماں باپ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ یہ قانون بن جاتا ہے۔ کہ "ماں باپ کی عزت کرو"۔

ماں باپ پہلے اُستاد ہوتے ہیں۔ اور اُن کے تجربوں کا نچوڑ یہ ہوتا ہے۔ کہ بچے شروع ہی سے یہ جاننے لگتے ہیں کہ ہر چیز ایک اچھا یا بُرا اثر رکھتی ہے۔ اور اگر بتانے کے لئے ماں باپ موجود نہ بھی ہوں تو بچے کبھی کڑوے پھل نہیں کھاتے۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے دُور رہتے ہیں۔ سانپوں کو نہیں پکڑتے اور کمزور شاخوں پر نہیں چڑھتے یعنی وہ یہ سیکھ لیتے ہیں۔ کہ ہمیشہ اچھے پھل کا مزہ اچھا اور بُرے پھل کا مزہ بُرا ہی ہوتے ہیں۔

قدامت پرستی انسان کی دماغی ترقی کی تاریخ میں علت و معلول (سبب اور اُس کا اثر) کے سلسلہ پر کام کرنے کی جب سے ابتدا ہوئی۔ اُسی وقت سے انسان کی مصیبتوں اور ترقی کا آغاز ہوا۔ مصیبت یہ آئی کہ دماغی ترقی کو روکنے کے لئے یا یوں کہئے کہ صرف اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے ہر ملک میں ایک جماعت سی بن گئی۔ جو علم اور تجربہ کی ٹھیکہ دار بن گئی۔ یہ جماعت نجومیوں، طبیبوں اور کاہنوں کے روپ میں ظاہر ہوئی اور انسانی ترقی کو روکنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے تجربوں کو بھی ایک دوسرے سے چھپانے لگی۔ لیکن یہی جماعت سائنس اور مذہب کی ترقی کا بھی سبب بنی۔ اور انسان کو ڈراتے ڈراتے یعنی قدامت پرستی کے اصولوں پر آگے بڑھانے لگی۔

قدامت پرستی کے یہ معنی ہیں کہ بغیر کافی عرصہ تک تجربہ کئے ہوئے کسی نئی چیز کو نہ اختیار کیا جائے۔ انسان فطرتاً نئی چیز یا نئے اثر سے ڈرتا ہے۔ اور ناتجربہ کار انسان کے دل سے یہ ڈر دیر میں نکلتا ہے۔ اس کے دو خاص عنصر ہوتے ہیں۔ (۱) موجودہ حالت سے محبت اور (۲) نامعلوم چیز کا ڈر۔

موت کے بعد بھی زندگی ہوگی

آج سے سات یا چھ ہزار سال پہلے مصر شمالی ایران، مغربی ترکستان، جنوبی عرب، سندھ اور ہند ضرورت سے زیادہ زرخیز ملک تھے۔ دریاؤں نے کاشتکاری کو مدد دی۔ کاشتکاری نے انسان کو ایک جگہ رہنے کا عادی بنایا۔ اور گاؤں اور شہر کی زندگی نے ضروریات زندگی کو بڑھا دیا۔ اب آرام و آسائش کی چیزیں بھی بننے لگیں اور زندگی سے محبت بھی پیدا ہوگئی۔ لوگ سوچنے لگے کہ یا تو آب حیات، اکسیر زندگی ملے، یا اگر مرنا ناگزیر ہے۔ تو ہماری زندگی مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے۔

زراعت پیشہ اور مہذب لوگ تو فلسفی بن چکے اور زندگی بڑھانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ لیکن وہ لوگ جو خانہ بدوش زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کے پاس نہ تو زندگی کی لذتیں تھیں۔ اور نہ زندہ رہنے کی اتنی شدید تمنّا تھی۔ موت اُن کے لئے تکلیفوں سے نجات کا ایک قدرتی اور بہترین ذریعہ تھا۔ (عرب۔ تاتاری۔ کالی اپا کرنے والے جو ٹھگوں کی صورت میں ہندوستان میں اُنیسویں صدی تک باقی تھے) اور وہ سمجھتے تھے کہ زندہ جانوروں حتیٰ کہ انسانوں کو قربان کرنا دیوتاؤں اور معبودوں کو اسی لئے پسند ہے کہ خون، جو جوہر حیات ہے، بہترین غذا ہے۔

مسیح سے ہزار سال پہلے تک انسانی قربانی کی رسم کم ہو چلی تھی۔ اور اسیریا میں بالکل بند ہوگئی تھی۔ انسان کی جگہ جانور نے اور بعض مقامات پر جانور کی جگہ آٹے کا جانور بنا کر قربان کر دیا جاتا تھا۔ فونیشیا اور خصوصیت سے کارتھیج (قرطاجنہ) کے باشندوں میں انسانی قربانی عرصے تک جاری رہی۔

اسی لئے بعض قوموں میں موت کے بعد زندہ ہونے کی، بعض میں موجودہ

زندگی بڑھانے کی، اور بعض میں جلد موت کا مُنہ دیکھنے اور بالکل فنا ہوجانے کی خواہش تھی۔ حتیٰ کہ اب تک دو قسم کے خیالات دُنیا میں موجود ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ موت کے بعد یقیناً زندگی ہے۔ جیسا اس دُنیا میں کریگے اُس کا نتیجہ اُس دُنیا میں ملے گا۔

برہمن کا مذہب کہتا ہے کہ مرتے ہی انسان پھر اپنے اعمال کے نتیجہ کو حاصل کرنے کے لئے اچھے یا بُرے حال میں پیدا ہوجاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

لیکن بُدھ مذہب ہمیشہ زندہ رہنے کو ایک عذاب سمجھتا ہے اور فنا کے سکون کا طالب ہے۔ اور اُس کو حاصل کرنے کے طریقے بتاتا ہے۔

مصر آج سے چھ سات ہزار سال پہلے سمیریا (عراق) کا تمدّن شروع ہوا تھا۔ تقریباً اسی زمانہ سے مصر کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ وہاں تصویروں نے ترقی کی اور انسان کا ایک رسم خط بن گیا۔ ولز کہتا ہے "انسانی جماعتوں کے لئے تحریر کی ایجاد بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے معاہدے، قوانین اور احکام محفوظ ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوگیا کہ شہری سلطنتوں سے بڑی سلطنتیں بن سکیں۔ اس سے یہ بھی ممکن ہوگیا کہ تاریخی شعور کا سلسلہ باقی رہے۔ کسی مذہبی رہنما یا بادشاہ کا حکم یا مہر اُس کی آواز یا نظر سے دُور جاسکتی تھی اور اُس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہ سکتی تھی۔ قدیم سمیریا میں مہریں بہت استعمال ہوتی تھیں" (تاریخ عالم صفحہ ۵۰)

مصر میں فرعون یا بادشاہ کا درجہ پجاریوں سے اونچا تھا۔ اُسے مصر کے خاص دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔

سمیریہ سمیریہ یا عراق سنہ ۲۵ قم سے بہت پہلے ایک غیر سامی قوم سمیری

کے قبضہ میں تھا۔ تا آنکہ سامی قوم بابلیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ (ثمود ؟)

(ثمود) اس زمانہ میں دجلہ اور فرات خلیج ایران میں الگ الگ گرتے تھے۔ ان کے درمیان قوم (ثمود ؟) کا ملک سمیریہ آباد ہو رہا تھا۔ اور زراعت اور مذہب اور شہروں اور بلند عبادت گاہوں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ جن پر سے آسمان کے سیاروں کا معائنہ ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک رسم خط ایجاد کیا تھا۔ جسے وہ مٹی کے پتھروں پر لکھ کر پکا لیا کرتے تھے۔ ان کے مٹی کے کتب خانے سمہء میں نکلے ہیں اور خط پڑھا جا چکا ہے۔ وہ ایک قسم کی پچر سے گیلی مٹی کو دبا کر نشان کر دیتے تھے۔ اسی کو عربی میں کتبہ یا کتاب کہنے لگے۔ اور اس خط کو میخی خط کہتے ہیں۔

ان کا ہر شہر ایک آزاد سلطنت تھی اور اُس کا دیوتا یا معبود بھی ہر ایک میں ہوتا تھا۔ مصر اور سمیریا دونوں جگہ برنج تانبا۔ سونا۔ چاندی اور آسمانی لوہا سب جانتے تھے۔

یہ لوگ انی مزم یا ہر شے جان رکھتی ہے کا مذہب رکھتے تھے۔ اس سے بابل والوں کی جن بھوت کی تفصیل بنی۔ جادو اور منتر کی ایجاد ہوئی۔ جن سے بھوت خوش کیے جاتے یا قبضہ میں رکھے جاتے تھے۔

صحرانورد

خانہ بدوش قومیں اپنے مویشیوں کو لئے لئے ہر جگہ پھرتی تھیں۔ اور زراعت پیشہ جماعتوں سے زیادہ مضبوط اور سفر کرتے کرتے زیادہ تجربہ کار ہو گئی تھیں۔ ان میں سامی قبیلے، شام و عرب میں اور جنوبی ایران کے سیاہ فام اسلامی چرواہے۔ تجارت اور حملوں کے ذریعہ سے زراعتی تمدن سے آن ملے تھے۔

سارغون ایک سامی چرواہا تھا۔ جو ۲۷۵۰ ق م میں سمیریہ کو فتح کر کے عراق سے بحر مڈی ٹرینی ان تک کا عکادی حاکم ہو گیا تھا۔ انہوں نے سمیریہ کی زبان اور رسم خط سیکھ لیا۔ یہ سلطنت دو سو سال میں زوال پذیر ہو گئی۔

پہلی بابلی سلطنت

سمیریہ پر ایلامیوں کا کچھ دنوں کے لئے دور دورہ ہوا لیکن اموری (Amorites) اس ملک پر رفتہ رفتہ قابض ہو گئے۔ یہ بھی سامی نسل کے تھے انہوں نے بابل کو جو فرات کے کنارے ایک گاؤں تھا۔ شہر بنا دیا۔ اور دنیا کا سب سے پہلا قانون ساز حکمران حمورابی (HAMMURA BI) یہاں حاکم تھا۔

مصر پر سامی چرواہوں کا قبضہ

حمورابی کے زمانہ ہی میں سامی قوم کے خانہ بدوش چرواہوں نے، جو گھوڑوں کو جنگ میں استعمال کرتے تھے مصر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ (حی عکس) HYXKSOS راعی ملک یا (چرواہے شاہ) کئی صدیوں تک مصر پر حکمراں رہے۔ اور آخرکار B.C ۱۶۰۰ میں اہل مصر نے ان کے خلاف بغاوت کی اور انہیں ملک سے نکال دیا۔

نئی مصری سلطنت

یہ واقعہ بعد کے آنے والوں بنو اسرائیل کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ (مصر میں ان کی تصویریں آثار میں موجود ہیں مصریات کے ماہر اسے سلطنت نو کہتے ہیں۔ اس کے بعد مصریوں نے اپنی سلطنت فرات تک بڑھالی تھی۔

نئی اسیرین سلطنت

ایشیائے کوچک، شام اور عراق میں سامیوں کی مختلف حکومتیں قائم ہو گئی تھیں اور مصر سے مسلسل لڑائیاں جاری تھیں

آخر کار تلغاث پلیزر ثالث نے سنہ ۷۴۵ ق م میں بابل کو فتح کر لیا۔ اور نئی اسیرین سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے پوتے آشور بانی پال نے سنہ ۶۷۰ ق م مصر فتح کر لیا۔

آریوں کا جنگل سے خروج

سنہ ۱۶۰۰ سے سنہ ۶۰۰ ق م کے درمیان آریہ قوم وحشی حالت میں تاریخ میں جنگلوں سے برآمد ہوئی۔ بابل اور نینوہ میں جو شاندار عمارتیں اور سنگ تراشیاں۔ مصوری وغیرہ ہوئی۔ وہ ان ہزار برسوں کی یادگار ہے۔ مصر میں البتہ اہرام کو ۳-۴ ہزار سال ہو چکے تھے۔ پھر سترھویں اور اٹھارھویں خاندان نے کافی یادگاریں چھوڑیں۔ اس زمانہ میں جب مصر میں سترھواں خاندان حکمران تھا۔ ملک چین میں شنگ خاندان کا دور دورہ تھا۔ یہ شہنشاہ پجاری بادشاہ تھے اور موسمی قربانیاں کرتے تھے۔ اس زمانے کے خوبصورت برنجی برتن اب تک موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس سے کئی صدیوں پہلے وہ کافی مہذب ہو چکے تھے۔

دوسری بابلی (یا نئی خالدی) سلطنت

سارغون کے ڈیڑھ صدی بعد تک نئی آشوری سلطنت بابل پر حکمران رہی۔ حتیٰ کہ جنوبی مصر تک اُس کا قبضہ تھا۔ آخر کار عراق کے جنوب مشرقی (سامی عرب) باشندوں نے میدی (آریوں) اور ایرانیوں سے مل کر نی نوہ کو سنہ ۶۰۶ ق م میں فتح کر لیا۔ یہ عرب خالدی کہلائے۔ اشوریہ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شمالی حصہ میں میدیوں (آریوں) کی حکومت بن گئی۔ نی نوہ (جو دجلہ کے کنارے تھا) اور اک بتانہ (دارالسلطنت) میدیہ کے بڑے شہر تھے۔ بابل اور آشور خالدیوں کی سلطنت میں تھے۔ اور دجلہ اور فرات کے آس پاس کا علاقہ مصر تک ان کے قبضے میں تھا۔ میدیہ کا بادشاہ گیا کزریس

(CYAXARES) اور خالدیہ کا بخت نصر تھا۔ بابل میں دیوی دیوتاؤں کی کثرت تھی۔ بعل مردوک شاہی دیوتا تھا۔

داریوش اوّل

باب ایلون (دیوتاؤں کا باب) (بابل) دیوتاؤں کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ شاہ بنونی دوس نے اپنی رعایا کو خوش کرنے اور سلطنت کو مستحکم بنانے کے لیئے ہر شہر کے دیوتا کو بابل میں جمع کر دیا تھا۔ بعل کے پجاریوں کو یہ سخت ناگوار تھا۔ انہوں نے میدیوں کی ہمسایہ سلطنت سے سازباز کر کے بلا لڑے بھڑے شہر اُن کے حوالے کر دیا۔ (۵۳۸ ق م) کا ئرس (CYRUS) فارسی کی فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ اس وقت پیغمبر دانیال دربار خالدی میں موجود تھے۔ اور انہوں نے ہی بتایا تھا کہ اس سلطنت کا پیمانہ حیات لبریز ہو گیا ہے۔ کیکاؤس کے بیٹے نے مصر تک فتح کر لیا تھا۔ اور جب کائرس مرا تو اُس کے مشیر ہشتاسپ کا بیٹا داریوش (دارا) اوّل تخت پر بیٹھا اور ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک ہوا۔ یہ پہلی آریائی سلطنت تھی اور مصر سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ شہنشاہ نے نقل و حرکت اور ڈاک کی چوکیوں کا زبردست انتظام کیا تھا۔ اور بڑی بڑی سڑکیں مسرطرط (STRATA STRASSESTREET) ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملاتی تھیں۔ پارس اور اکبتانہ ترقی پر تھے۔ اور مرکز سلطنت سوسا پارس کے شمال مغرب اور اکبتانہ کے جنوب مشرق میں خلیج پارس کے قریب واقع تھا۔

دوسری فصل

تمدن و تہذیب کی لہریں

تاریخ پر فلسفیانہ نظر ڈالنے والوں کا پہلے یہ خیال تھا کہ افراد سے خاندان۔ اور خاندانوں سے قومیں بنی ہیں۔ اب یہ نظریہ مقبول ہو چلا ہے۔ کہ پہلے انسانوں کے غول در غول خوراک کی تلاش میں پھرا کرتے تھے۔ اشتراکیت عام طور پر رائج تھی۔ سب عورتوں کے سب خاوند اور بچوں کے سب مشترک باپ تھے۔ اور چونکہ دودھ پلانے والے جانوروں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ماؤں کے تعلق سے ایک گروہ بنا لیں۔ اس لئے پہلے گروہ بنے پھر شادی بیاہ کے رواج نے ایک مرد کی کئی خادمائیں بنا دیں۔ اور خاندان کے ساتھ ساتھ غلامی کی بنیاد پڑی ؎

"یہ انسانی خاندان بلند مقامات یعنی پہاڑوں پر پیدا ہوئے۔ اس لئے کہ نشیبی زمینیں پانی اور دلدل کی کثرت سے اس قابل نہ تھیں کہ غلے کی باقاعدہ کاشت کی جائے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ پہاڑی تمدن کو میدانی تمدن پر اولیت حاصل ہے۔ یہ بھی جدید نظریہ ہے۔

تیسرا نظریہ یہ بھی بنایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تمدن کے ابتدائی مرکزوں میں سے ایک اہم مرکز یمن کے کوہستانوں میں تھا۔ غالباً سامی قوم کی نشو و نما یہیں ہوئی۔ اور اسی

جگہ سے وہ عراق (سُمیریہ) سندھ (موہنجو داڑو) اور پنجاب (ہڑپا) میں پھیلی۔ موہنجو ڈاڑو اور ہڑپا کی مہریں ابھی تک پڑھی نہیں جا سکیں۔ لیکن یہ تمدن پانچ ہزار سال پرانا مانا گیا ہے اور مصر و سمیریہ سے ہزار دو ہزار سال بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ اور مہروں، مجسموں اور پرستش کے طریقوں میں بھی بابلی یعنی سامی معلوم ہوتا ہے۔ سامی تمدن کے متعلق سرغون اول عکادی (۲۷۵۰ ق م) کے زمانے سے قرطاجنہ کی تعمیر (۸۰۰ ق م) تک مسلسل سامیوں کی کوئی نہ کوئی شاخ دنیا میں نمایاں رہی لیکن مسیح سے ہزار سال پہلے آریہ نسل کے لوگ بھی متمدن ہونے لگے تھے۔ اور تمدن و تہذیب ترقی کرنے لگی تھی۔

جنگ

دُنیا کے پہلے دور میں جنگ نے تمدنی و تہذیبی ترقی میں نمایاں مدد دی پہلے چھوٹے چھوٹے گروہ ایک دوسرے سے لڑے اور طاقتور گروہ نے کمزور کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ پھر قومیں ایک دوسرے کو ہضم کرنے لگیں اور اپنے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ساتھ اپنا طرز زندگی بھی مفہوم قوموں کو سکھا گئیں۔ کبھی مصر کے دیوتاؤں کی (جی عکسوس کا چرواہوں) کے ہاتھوں شکست ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ آزاد ہو کر اپنی مذہبی تثلیث کا ڈنکا بجانے لگتی تھی۔ اور بنو اسرائیل کے بچوں کے قتل کا اعلان کر دیتی تھی۔ اس لئے کہ یہ بھی اُسی سامی قوم کے تھے جنہوں نے صدیوں تک اُنہیں پامال کر رکھا تھا۔ آخر کار بنو اسرائیل ہجرت یا خروج پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور الوہیم کی بجائے یہوداہ کا نام لیتے ہوئے کنعان کے سامیوں سے بھڑ جاتے ہیں۔ یہاں اُنہیں بابل کی روایات کے متعلق "تحقیق عالم" ملتی،

ہیں - اور حمورابی (دو ہزار قبل مسیح) کا قانون بھی مل جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور سمسون کے قصے بھی ایسی یکسانیت رکھتے ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ماخذ بھی ایک ہی ہے جتی کہ ہندوستان کے آریوں میں بھی سری کرشن کی ولادت بھی ظلم و انتقام کے قدیم پہلو پر اُسی طرح قائم ہے۔ جس طرح مندرجہ بالا قصے کنعان اور بابل میں پائے جاتے ہیں۔

زمانے کی نیرنگی دیکھئے جب ۷۲۲ ق۔م میں اشوریہ کے بادشاہ تِلغاث پلیزر ثالث نے بابل کو فتح کر کے نئی اشوری سلطنت کی بنیاد رکھی اور اپنی فوج کو لوہے کے ہتھیاروں سے مسلح کیا تو اُس نے طالوت و داؤد کے نام لیواؤں پر حملہ کر دیا - اور ۷۲۱ء ق م میں بنی اسرائیل کے دس قبیلے جلاوطن کر دئے گئے۔ اسی زمانے میں یہ اسرائیلی مدینہ (یثرب) اور افغانستان کی طرف منتشر ہو گئے تھے۔ اور بابلیوں نے ۶۸۰ ق م میں مصر کے ۲۵ ویں حبشی حکمرانوں کو شکست دے کر شہر ثیبز پر قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ سولہ سال بعد آزاد ہو گئے اور یہوداہ کے بادشاہ پر مصریوں نے ۶۰۸ء ق م میں دھاوا بول دیا۔ اور شکست دے دی۔

لیکن اسی زمانے میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا۔ یعنی آریہ (میدیہ والے) اور سامی ایک قوم بن گئے۔ اور ۶۱۲ء ق م میں نینوہ پر قبضہ کر کے خالدی سلطنت بنالی۔ مصری بادشاہ کو جو فرات تک گھس آیا تھا۔ بخت نصر ثانی نے ۶۰۶ء ق م میں شکست دی اور یہودی قوم کے دو پس ماندہ قبیلوں کی حکومت کا چراغ گل کر کے اُنہیں بابلوں میں قید کر دیا۔ جہاں اُنہوں نے اپنی تورات کو مرتب کیا۔ اور اپنی پوری تاریخ لکھ ڈالی - اسی جگہ ان کے پیشین گو (نبی) تیار ہوئے۔ اور ان کے پاس ایک ایسا نوشتہ ہو گیا جس نے یہودیوں کو بغیر یروشلم اور بغیر کینہ کے کل دُنیا میں متحد کر دیا۔

یہیں انہیں اپنی بادشاہت کے احیا کا خواب دکھائی دیا اور ایک آنے والے بادشاہ (مسیح) کا انتظار شروع ہو گیا۔

غالباً سامی مذہب کی پرستش اتنی ہمہ گیر اور عوام پسند تھی کہ آریوں سے بعل کے پجاریوں کا سمجھوتہ ہو گیا۔ بعل کے پروہتوں نے سازش کر کے ایک آریہ بادشاہ کو شہر پر قابض کرا دیا جس کے جانشینوں میں داریوش بن ہلشتاسپ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ داریوش کی حکومت کل سامی ملکوں پر پھیل گئی۔ یہ میدی آریہ تھا۔ اُس نے بابل کی بجائے سوسا کو دار السلطنت بنایا۔ اور سامی و ایرانی مذہبی خیالات نے مل کر اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرنے کے بعد ایشیا میں ترقی شروع کی۔

غالباً مسیح سے پندرہ سو سال کے لگ بھگ آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اور غالباً ہندی آریہ ہوں یا یوروپی آریہ۔ یہ سب کسی مذہبی لڑائی کے بعد اپنے مرکز سے علیحدہ ہوئے تھے۔ ہندی آریوں میں آسور شیطان کو کہتے تھے۔ اور خدا یا فرشتے کو "دیو" یا دیوتا کہتے تھے۔ اسی طرح یونانی اور یوروپی آریہ ڈیوس (دیو) خدا کے لئے بولتے تھے۔ لیکن مرکزی آریوں میں اہور (یا آسور) کا لفظ خدا کے لئے اور دیو کا لفظ شیطان کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ایک عجیب بات یہ ہے۔ کہ یورپ میں ڈیول کا لفظ شیطان کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یوروپی آریوں میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ جو شیطان کو بھی دیو سمجھتے تھے۔ اور خدا کے لئے بھی یہی لفظ مثل ہندی آریوں کے استعمال کرتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ قدیم آریوں کی دو جماعتیں تھیں۔ جو ایک دوسرے کے خدا کو شیطان کہتے تھے۔ اور غالباً ایک دوسرے سے نفرت کی وجہ سے اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

آریوں نے ایک طرف تو ہندوستان کے قدیم دراوڑ تمدن سے ٹکرا کر یہاں کی بہت سی مذہبی رسموں کو اپنی مذہبی رسموں کا جزو بنا لیا۔ اور پتھر پرستی کے ساتھ موہنجے ڈارو اور ہڑپا کی سامی دیوی "مہا مائی" کی پرستش اور شیو پرستی سیکھی۔ اور مقامی باشندوں سے چھوت چھات کا سبق لیا۔

اسی زمانے کے قریب قریب یعنی مسیح سے بارہ چودہ صدی پہلے آریوں کی ایک شاخ یونان پہنچ گئی۔ اور چھوٹے چھوٹے شہر بن گئے۔ اور ان میں جمہوری یعنی پنچایتی طریقے پر حکومت کے فرائض ادا ہونے لگے (اگرچہ غلاموں کی ایک بڑی تعداد اس حق سے محروم تھی)۔ اور چھٹی صدی مسیحی تک یونانی حکما اس کائنات کے متعلق غور و فکر میں منہمک نظر آنے لگے۔

دار یوش اوّل نے ۵۲۱ھ ق م میں ایک وسیع سلطنت حاصل کر کے یونانی آریوں پر حملہ کر دیا۔ اور ۴۷۹ھ ق م میں سخت شکست کھا کر واپس ہوا۔ اور ۴۶۵ھ میں قتل ہوا۔

۳۵۹ھ ق م میں فلپ مقدونیہ کا امیر ہو گیا جہاں تربیت یافتہ سوار اور تیر انداز تیار کئے گئے۔ اور پورے یونان نے متحدہ طور پر فلپ کو اپنا جرنیل بنا کر ایران پر حملے کی تیاری شروع ہوئی۔ لیکن اس کی بیوی نے سوت کے جلاپے کی وجہ سے اُسے قتل کرا دیا۔ سکندر اعظم تخت پر بیٹھا۔ اور دار یوش ثالث کو شکست دے کر ۳۳۲ھ ق م مصر چھینا اور اربیلا (متصل نی نے وا) پہنچ کر دارا کو پھر شکست دی اور سکندر نے بابل، سوسا اور پارس پور کو فتح کر لیا۔ اور قصر دارا جلا دیا گیا۔ جہاں نایاب قلمی کتابیں (جو کھالوں پر لکھی جاتی تھیں) جل کر خاک ہو گئیں۔ اور ہندوستان تک فتح کر کے اور وہاں تک یونانی

تمدن کے آثار چھوڑ کر سنہ ۳۲۴ ق م میں سوسا پہنچا۔ اور ایک سال بعد بابل میں مرگیا۔ سلیوکس نے ایرانی سلطنت سنبھالی۔ بطلیموس مصر کا بادشاہ بن بیٹھا۔ جہاں اُس نے یونانی دیویوں (میوزوں) کے نام پر ایک میوزیم اور کتب خانہ قائم کیا۔ اور سکندریہ علم و ہنر کا مرکز ہوگیا۔ یوک لڈ نے ہندسہ اور اپولونی اس نے مخروطات، ہپارقوس نے نجوم کا نقشہ بنایا۔ لیکن سو سال کے اندر ہی اندر یہ شمع علم بھی قدامت پرستی پر قربان ہوگئی۔ حتیٰ کہ ہزار سال بعد نئے سرے سے مصری مسلمانوں نے افکار انسانی کو آزاد کیا اور پھر افلاطون و ارسطو پیدا ہونے لگے۔

بہرحال جنگ کے سلسلے میں سب سے آخر میں رومی قوم کا ذکر ضروری ہے۔ رومہ کی بنیاد مسیح سے ۷۵۳ سال پہلے پڑی۔ آریہ قوم کے لوگ یہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ اور جنوب میں یونانی بھی تھے۔ رومہ شہر کے باشندوں نے یونانی شہری جمہوریت کے نمونے پر ایک شہری سلطنت بنائی تھی۔ اور حکومت شیوخ (پیٹریشن) کے ہاتھوں میں تھی۔ غریب عوام کا اس سے تعلق نہ تھا۔ یہ گویا ہندوستان کے شودر تھے۔ لیکن ہندوستان میں ذاتیں پیدائشی بن گئی تھیں۔ رومہ میں عوام بھی شیوخ میں داخل ہو سکتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ نہ صرف شہر روما کے عوام بلکہ پورے باشندگان اطالیہ کو رومی شہریت کا حق مل گیا تھا پہلے تو رومیوں نے پرہس کو ۲۷۵ ق م میں پسپا کیا۔ پھر بحری ڈاکوؤں کی مدد کے خیال سے فنیقی شہر قرطاجنہ پر حملہ کیا۔ یہ شہر سنہ ۸۰۰ ق م میں آباد ہوا تھا۔ اور شہر طائر کی نوآبادی کے طور پر بحر روم کی پوری تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ آریہ قوم کے رومی نمائندوں نے سامی قوم کے تجارتی شہر پر پہلا حملہ سنہ ۲۶۴ ق م میں کیا۔ اور انہیں شکست دی۔ لیکن چند سال بعد سنہ ۲۱۸ ق م میں حنی بعل نے دُنیا کی تاریخ میں اپنا نام پیدا کر دیا۔ اور رومیوں پر

اسپین کے راستے سے حملہ کر کے پیہم شکستیں دینا شروع کیں۔ لیکن آخر کار اُسے گھر کی بغاوت فرو کرنے واپس آنا پڑا۔ اور رومیوں نے سنہ ۲۰۲ ق م میں شکست دے کر اُسے بھگا دیا اور وہ دشمنوں سے بچنے کے لئے فرار ہو گیا اور جلا وطنی کی حالت میں دشمنوں میں گھر گیا تو گرفتاری پر موت کو ترجیح دی اور زہر کھا کر جان دے دی۔ آخر کار ۱۴۶ ق م میں قرطاجنہ نے تین سال کے محاصرے سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دئے۔ دو لاکھ آدمی قتل ہو چکے تھے بقیہ پچاس ہزار غلام بنا لئے گئے اور شہر میں آگ لگانے کے بعد ہل چلا دیا گیا۔

اسی طرح کنعان کا وہ مقدس شہر جو کاروس کی عنایات سے پھر آباد ہو گیا تھا۔ رومیوں کی دست درازیوں سے نہ بچ سکا۔ سنہ ۷۰ عیسوی میں بیت المقدس یروشلم (دار السلام) رومی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اور مسجد و قربان گاہ مسمار کر دی گئی۔ اور آخر کار ۱۳۳ء میں جب یہودیوں نے بغاوت کی تو پورا شہر تباہ کر دیا گیا اور مسجد یہود کی جگہ جو پیٹر کا مندر بن گیا۔ اور یہودی جلا وطن کر دئے گئے۔

رومی سلطنت ابتدا میں جمہوریت تھی۔ سینیٹ اونچی پنچایت تھی۔ عام شہریوں کی پنچایت نیچے درجے کی تھی۔ لیکن سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ غلاموں کو ترقی ہوئی۔ عوام کو شہری حقوق ملے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے نمائندے منتخب نہیں کرتے تھے۔ لہذا عام شہری پنچایت کا ایک جگہ جمع ہونا ناممکن ہو گیا صرف سینیٹ رہ گئی۔ اور وہ مالدار طبقے کی جماعت یا حکومت اشراف (ARISTOCRACY) بن گئی۔ قرطاجنہ کی دوسری لڑائی کے بعد ماریوس نے تنخواہ دار فوج کی بنا ڈالی اور نام نہاد جمہوریت فوجی جرنیلوں کے زیر اثر آ گئی۔ آخر کار جولیوس قیصر نے ۴۸ ق م اپنے رقیب پمپے کو شکست دے کر آمریت کی بنیاد ڈالی۔ خود قتل ہوا۔ اور قلوپطرہ کا عشق

اور اُس کے پیدا کردہ فرعونیّت اور الوہیت کے خیال کسی کام نہ آئے۔ آکٹے وی ان قیصر نے چند سال بعد ۳۱ ق م میں مارک انٹانی کو شکست دے کر رومی سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور سینیٹ نے ۲۷ ق م اُسے آگسٹس (عظیم الشان) کا خطاب دے دیا۔ اور رومی جمہوریت شہنشاہیت میں بدل گئی۔ جس میں نیرو جیسے ظالم اور مارکس آریلیس جیسے فلسفی شہنشاہ ہوئے۔ سینیٹ ختم ہو گئی۔ اور سامراج اپنی معراج کو پہنچ گیا۔ اور جو سلطنت سپین سے عرب تک، اور انگلستان سے افریقہ تک پھیل گئی تھی۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

مغربی سلطنت، جس کا مرکز روما تھا۔ فرانک، ونڈال اور وسی گاتھ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونے لگا۔ حتیٰ کہ قرطاجنہ کی تباہی کے سات سو سال بعد پھر اُسی مقام ہسپانیہ کے ونڈال آگے بڑھے۔ روما کو ۴۵۵ء میں لوٹا۔ اور بحرِ روم کے مغربی جزائر پر قبضہ کر لیا۔ پھر مغل نسل کے ہن دُنیا میں اپنی فوجی غارتگری کے لئے مشہور ہوئے۔ جرنیل اٹلاؔ نے فرانس و اٹلی وغیرہ کو تباہ کیا۔ اور ۴۵۳ء میں مر گیا۔ ۴۹۳ء تک مغربی رومی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ اور روما میں ایک گاتھک قوم کا بادشاہ حکومت کرنے لگا تھا۔

چھٹی صدی مسیحی کی ابتدا تھی۔ بقول ولز "اس صدی میں مغربی دنیا میں تفرقہ اور ذہنی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اگر عیسائی مبلّغین اور راہب نہ آڑے آتے تو لاطینی علم بالکل ہی فنا ہو گیا ہوتا" (تاریخ عالم ص ۱۵۵)

مذہب

جنگ نے انسانی تمدن کو ترقی دی۔ ایک نسل کے لوگ دوسری نسل والوں سے

ملے۔ ان کے طرز زندگی سے قریب آئے۔ ایک نے دوسرے کی صنعت کو سیکھا۔ جنگ کے طریقوں اور فوجوں کی راہوں نے تجارت کے راستوں کو ترقی دی۔ پہلے سامیوں نے سندھ سے بابل۔ بابل سے ایشیائے کوچک و مصر۔ مصر سے قرطاجنہ اور وہاں سے اسپین تک اپنی تہذیب تجارت اور زبان کو پھیلا دیا۔ پھر آریوں کی باری آئی۔ دارایوش اوّل کے زمانے میں عراق میں سامی اور آریہ مل گئے۔ ہندوستان میں آریوں نے سندھی سامیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ پھر سکندر کی فوجی چھاؤنیوں نے یونانی رنگ میں آرین تہذیب، فلسفہ و صنعت کو دُنیا بھر میں پھیلایا۔ اور آخر میں رومی آریوں نے قانون جمہوریت، آمریت و شہنشاہیت کے ذریعے سے انسانی خیالات میں روانی و شگفتگی پیدا کی۔ اور چھٹی صدی عیسوی تک سامی اور آرین خیالات نے مل جل کر تین قسم کے مذہبوں کو دُنیا میں پھیلایا۔

(الف) تعدد آلہہ (کثرت خدایان) یعنی انسان کی زندگی پر خارجی اثرات حکمراں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں تو بھلا ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں تو برا ہوتا ہے۔ یہ خدا انسانوں کی طرح آپس میں ایک دوسرے سے محبت و نفرت، جنگ و صلح کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک سے ڈرنا چاہیئے۔ شیطانی دیوتا اور رحمانی دیوتا۔ دونوں دیوتا ہیں۔ دونوں یعنی ایسے ہزاروں دیوتا ہیں۔ کسے اچھا کہیں کسے بُرا۔ سب کو مانو۔ سب کو خوش کرو۔ جانوروں کا گوشت کھلاؤ۔ شراب پلاؤ۔ پھل پھول پیش کرو۔ انسانی قربانی کرو۔ کنواری لڑکیاں کو دریائے نیل کے دیوتا کو چڑھاؤ۔ سوم رس پی کر خود دیوتا بن جاؤ۔ غرضیکہ درخت۔ پہاڑ، دریا، سمندر، آگ، پانی، مٹی، ہوا، چاند، سورج، تارے، سانپ، شیر، مگرمچھ، مچھلی،

بیل سب میں ایک قوت ہے۔ جو پرستش کے قابل ہے۔ شیطانی قوتوں کو اس لئے خوش رکھو کہ وہ شریر ہیں، اچھے دیوتاؤں کو اس لئے مناؤ کہ وہ شیطانی دیوتاؤں کے شر سے تمہیں بچا سکیں۔ اس قسم کے مذہبی خیالات سامیوں، آریوں اور دنیا کی دیگر قوموں میں رائج تھے۔ اور اب بھی ہیں۔

ان ہی خیالات کی ایک کڑی وہ ہے، جس میں اچھے اور بُرے دیوتاؤں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور دونوں طبقوں کا ایک ایک سردار ہرمز و اہرمن کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ آخر میں یزدان کی فتح ہو گی۔ اور دنیا میں ظلمت کا نام نہ باقی رہے گا۔

مصری مذاہب

مصر ایک زراعتی ملک تھا۔ اس کا خدا اوسی رس بھی ہرے بھرے کھیت کے تخیل کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ کھیتی کی طرح بار بار مرتا اور زندہ ہوتا رہتا تھا۔ اور گویا قُقنوس پرندہ تھا۔ جو ہزار سال زندہ رہنے کے بعد خود لکڑیاں جمع کرتا ہے۔ اور اپنی منقار سے موسیقی کے مختلف سر پیدا کرتا ہے۔ جب وہ سر جسے ہندوستان میں دیپک یا آتشین کہتے ہیں پیدا ہوتا ہے۔ تو لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور اس کی خاکستر سے ایک انڈا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے وہ پھر نمودار ہوتا ہے۔ اوسی رس کی علامتوں میں سے ایک ققنس اور دوسرا سورج ہے۔ موٴخر الذکر اس لئے ہے کہ وہ ہر قوم میں جان بخش سمجھا جاتا ہے۔ اوسی رس کو ایپس (بیل) بھی مانا جاتا۔ اس بیل دیوتا کی ایک گائے دیوی (آئی سس) تھی۔ اس کا خطاب ہلال شب اور ستارہ دریا بھی۔ اوسی رس دیوتا کے مرتے ہی، گائے دیوی حاملہ ہو جاتی تھی۔ اس کا بچہ ہورس کہلاتا تھا (یعنی عقاب یا صبح صادق) جب یہ جوان ہوتا

تھا۔ تو پھر بیل دیوتا یا اوسی رس ہو جاتا تھا۔ اور یہ سلسلۂ بقا و فنا مسلسل جاری رہتا تھا۔

ان دیوتاؤں کی تثلیث کے پیچھے ظلماتی یا شیطانی دیوتا تھے۔ شب تاریک، سگ سرانوبس، بھوت، غول وغیرہ۔

اوسی رس کے ماں باپ زمین و آسمان (سیب اور نت) تھے۔ جی مکسوؤں (HYKSOS) کے داخلۂ مصر کے بعد اوسی رس کا نام ہی "را" ہو گیا تھا۔ جی عکسو سامی النسل چرواہے تھے۔ ممکن ہے کہ اُن کی زبان کا رب بھی را یعنی سورج کا ہم معنی رہا ہو۔ سنسکرت میں را کے لئے روی اور ربی کا لفظ ہے۔

را (یعنی اوسی رس) ابتدا میں صرف ایک حیات بخش دیوتا تھا۔ وہ آسمان کو روزانہ ایک کشتی میں عبور کیا کرتا تھا۔ اور ہر روز تاریکی کے دیوتا پر ایک نئی فتح حاصل کرتا تھا۔

شہر ممفس کا خاص دیوتا پتاح (فتاح کھولنے والا) تھا۔ یہ کل دیوتاؤں کا والد مانا جاتا تھا۔ اور خود بخود یعنی انڈے سے پیدا ہوا تھا۔ یہی کائنات کا خالق بھی تصور کیا جاتا تھا۔

توث (THOTH) یعنی چاند دیوتا بہت اہم تھا۔ وقت کی پیمائش کا دیوتا تھا۔ مصر والے بھی چاند دیکھ کر نیا مہینہ شروع کرتے تھے۔

شہر تھیبز (THE BES) کا دیوتا عمون (یا راعمون دہستی پوشیدہ) تھا۔ یہ بھی سورج دیوتا تھا۔ ممکن ہے کہ اسی سے راحمٰن اور پھر رحمان بنا ہو۔ جو غیر عربی لفظ ہے۔ اور جسے رسول عربی نے قریشی زبان میں پہلے پہل استعمال کیا۔ عمون را ایک قوت تھی۔ جو ہر جگہ پوشیدہ طور پر موجود تھی۔ سورج میں اس کا خاص طور پہ ظہور ہوتا تھا۔

مصری شیطان کا نام شیط (SET) تھا۔ لوگ اس کی عبادت بھی اس کے ڈر سے کرتے تھے۔ لیکن جب اُس کی شرارت کافی طور پر متعین ہو گئی تو اس کی عبادت ترک کر دی گئی۔ اور لوگ اُسے غیر قوموں کا دیوتا خصوصاً بابل کا بعل، یا شر محض سمجھنے لگے۔

اس کی پیدائش بھی عجیب طرح ہوئی تھی۔ زمین کو رانے بد دعا دی کہ کسی مہینے یا سال میں اُس کے اولاد نہ ہوگی۔ چاند دیوتا درمیان میں پڑا۔ اور سال کے علاوہ پانچ نئے دن بنائے گئے۔ جن میں زمین کے چار بچے اوسی رس، شیط۔ آئی سیس اور پتھ تھائس پیدا ہوئے۔

(۱) اوسی رس نے مصریوں کو زراعت اور مبادیات تمدن سکھائے۔

(۲) شیط فطرتاً پاجی تھا۔ اُس نے حسد سے اوسی کو نیل میں غرق کر دیا۔

(۳) آئی سس اُس (اوسی رس) کی بہن اور بیوی دونوں تھی۔ وہ اُسے تلاش کرکے اپنے بیٹے حورس کے پاس لائی۔ شیط نے لاش کے ۱۴ ٹکڑے کرڈالے۔ جن میں سے تیرہ کو آئی سس نے دفن کر دیا۔ اور حورس کو شیط سے لڑنے کا حکم دیا۔ وہ اسے گرفتار کر لایا۔ لیکن نہ معلوم کیوں آئی سس نے اُسے رہا کر دیا۔ حورس نے یہ دیکھ کر اپنی ماں (جو بھیڑیئے کی صورت میں تھی) کا سر کاٹ ڈالا۔ لیکن چاند دیوتا نے اُس کی گردن پر گائے کا سر لگا دیا۔

مصری دیوتاؤں کی تثلیث، باپ، ماں اور بیٹا تھی۔ جب عیسائیت مصر میں آئی اور اسکندریہ میں، اس کی یونانی اور مصری فلسفہ و مذہب کی روشنی میں تدوین ہوئی تو عیسوی تثلیث کی بنیاد پڑی۔

مصر میں ہر دیوتا فانی تھا۔ اُس کا بیٹا اُس کا عکس ہوتا تھا۔ اور بڑا ہو کر اپنی

ماں کا شوہر بن جاتا تھا۔ اسی لئے مصری اپنے خدا کو خود پیدا شدہ، لافانی اور اپنی ماں کا شوہر کہتے تھے۔ دیوی یا ماں البتہ باقی رہتی تھی۔ جو زمین سے مشابہت رکھتی تھی۔

مصر میں مختلف جانوروں کی بھی مثلاً بیل، گھڑیال اور ققنس وغیرہ کے پرستش ہوتی تھی۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شیط اور حورس کی جنگ میں سب دیوتا جانور بن کر شریک ہوئے تھے۔

خدا کا نمایاں اوتار فرعون مانا جاتا تھا۔ اور وہ پجاریوں کی جماعت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ پجاریوں کا یہ کام تھا کہ مقدس کتابیں پڑھیں۔ امرا کو ان کی اور جادو کی تعلیم دیں۔ کہانت، قربانی اور خواب کی تعبیریں اور مختلف تہواروں اور جنتری کا متعین کرنا بھی ان ہی کا کام تھا۔ دوا کے علاوہ جادو منتر سے بیماریوں کو دور کرنا اور شعبدے دکھانا ان کا خاص کام تھا۔

سحر یا جادو کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری تھا۔ وہ بقائے روح کے قائل تھے۔ اسی لئے وہ جسموں کو ممی بنا کر محفوظ بھی رکھتے تھے۔ اور ان کا مقبول خدا (را) روحوں کی آخری قیام گاہ مانا جاتا تھا مرنے کے بعد روحیں رات کے بارہ برجوں میں سورج کے ساتھ محض جادو کے زور سے گزرتی تھیں۔ اور آخر کار سورج (را) کے ساتھ رہنے لگتی تھیں۔ جو روح جادو نہ جانتی تھی۔ وہ کسی ایک برج میں پھنس جاتی تھی اور تاریکی میں پڑی رہتی تھی۔ غالباً اس قسم کے توہمات کو جو سحر و جادو کے نام سے مصریوں میں رائج تھے حضرت موسیٰ نے دور کرنا چاہا تھا۔ اور سحر کے مقابلے میں عقل و فکر یعنی سائنس کو بلند کر کے یہ بتایا تھا کہ ڈنڈے سے مار کر سانپ بھگائے جا سکتے ہیں۔

باب الون (بابل) کا مذہب

ہم دیکھ چکے ہیں کہ بابلی تہذیب سے پہلے سُمیری تہذیب سرزمین عراق (باسمیریہ، بابلونیہ، خالدیہ) میں رائج تھی۔ یہاں ہر شہر کا دیوتا الگ تھا۔ پھر ایک ہی قسم کے دیوتاؤں کو مدغم کر کے اُسی قسم کا ایک دیوتا بھی بنا لیا جاتا تھا۔ آسمان (ہوا) زمین (مٹی)، سمندر (پانی)، تین عنصر تھے۔ غالباً آگ، یا سورج کو ایک علیحدہ عنصر اس لئے نہیں تسلیم کیا گیا تھا کہ وہ آسمانی مانے جاتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں کئی کئی دیوتا ہوتے تھے۔ اور ہر شہر میں مختلف قسم کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔ آرین دیوتاؤں سے ان کا مقابلہ اس طرح ہو سکتا ہے:۔

سُمیری	بابلی	ایرانی	ہندی	یونانی	
ان نا	انو	باد۔ خورشید	وایو۔ سوریہ (اندر)	ذی اُس	خدائے آسمان
ان لیل	بعل	خاک	دھرتی ماتا	پوسی دون	خدائے ارض
ان کی	اِی	آب و باران	ورُن	ہے دِس	خدائے بحر

شہر ایرخ کا دیوتا انو تھا، یہ کل دیوتاؤں کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بیوی اناتُم تھی۔

شہر نپور کا دیوتا بعل تھا۔ بابل کا بعل میرو داخ تھا۔ یہ دونوں مل کر بعل میرو داخ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ خدائے سمندر (عقل یعنی اِی کا بیٹا تھا)۔

نبو بعل کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ (بعل) کی مرضی اور اُس کے حکموں کو انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ بابل میں اس سے پہلے بھی کہانت، پیشین گوئی اور خبر رسائی غیب (نبوت) جاری تھی۔ اسی لئے اس کا نام نبو تھا۔

سین (یا نن نار) سورج دیوتا سے زیادہ عظیم مانا جاتا تھا۔ لیکن مصر کی طرح شمش (رہا)، بھی ایک آسمانی دیوتا تھا اور اُسے قاضیٔ زمین و آسمان مانا جاتا تھا۔

رامن (رم مون)، برق و باد کا آسمانی دیوتا تھا۔ لیکن چونکہ طوفان و برق سے زراعت وغیرہ کو نقصان ہوتا تھا۔ اس لئے ان افعال کو طوفانی روحوں سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ اور وہ صرف ہوا کا دیوتا مانا جاتا تھا (دیکھئے عربی رحمان اور مصری رع امون)۔

اشتر (زہرہ) اور تموز برابر کے درجے کی تھیں، آخر کار اشتر نے جو ملکۂ آسمان سمجھی جاتی تھی، کل دیویوں کو اپنے اندر ھضم کر لیا۔

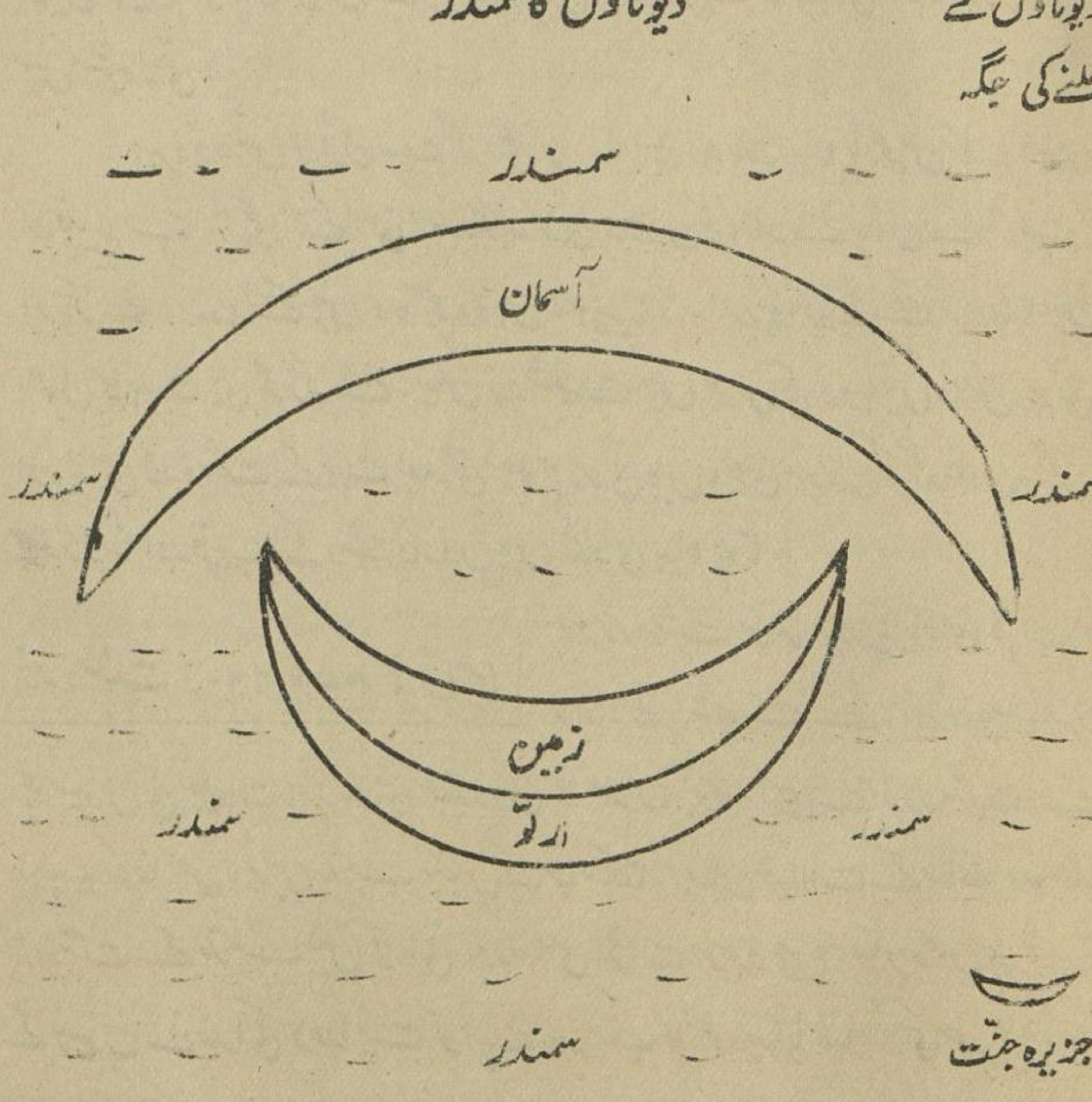
بابل میں دیوتاؤں کی کثرت کی وجہ سے پجاریوں کی بھی کثرت تھی۔ بادشاہ سب کا سردار پجاری مانا جاتا تھا۔ اور ہر مندر کے پجاریوں میں بھی ایک ایک سردار پجاری ہوتا تھا۔ دیوتا کے حاجب و دربان شن گتو اور خزانچی شتمو کہلاتے تھے۔ انہیں تیل سے غسل دینے والا لپشی شو، اور کاہن اِسشو کہلاتا تھا۔

ہر شخص ہر طرف روحوں اور بھوتوں سے گھرا ہوا تھا۔ آسمانی روحیں انونکی اور ارضی روحیں اِگی گی کہلاتی تھیں۔

سحر و جادو کے خاص قوانین تھے اور جزو مذہب تھے۔ تعویذوں کا زور تھا۔ اور مقدس پانی مریضوں اور سحر زدوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

انسان کی پیدائش، جنت سے نکلنا، طوفان آبی، گل گمیش کے کارنامے توریت میں بابل اور سمیریہ والوں سے لئے گئے ہیں۔ اور بہت دلچسپ ہیں۔ انہوں نے زمین و آسمان کا خیالی نقشہ بھی کھینچا تھا۔ زمین کے اوپر ہوا اور آسمان۔ آسمان کے اوپر سمندر۔ زمین کے نیچے ارلّو یا وہ سرزمین جہاں مرنے کے بعد روحیں جاتی تھیں الات

یہاں کی ملکہ تھی۔ بداعمالوں کو یہاں سزا ملتی تھی۔ لیکن نیک اعمال بھی تاریکی و دوزخ میں رہتے تھے۔ اس کے نیچے بھی ایک سمندر تھا۔ اور مشرق میں دور، ایک جزیرہ تھا جس میں اسرا کی روحیں رہتی تھیں۔ اور اسی کے اوپر آسمان میں سورج نکلنے کی جگہ دیوتاؤں کا کلب قائم تھا۔ نقشہ یہ ہے۔ جس میں زمین ایک کشتی کے طور پر سمندر میں تیر رہی ہے۔



ایرانی مذہب

مجوس ایران میں اور خصوصیت سے آریوں میں جو مذہب رائج تھے۔ وہ سب تقریباً یکساں تھے۔ خواہ وہ ہندوستان کا ویدک مذہب ہو۔ یا یونان کی ڈی اُس پرستی۔ عام طور پر مسلمانوں کا خیال ہے کہ مجوس زردشت کے پیرو تھے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بلکہ یہ میدیہ کے باشندوں کی ایک شریف ذات تھی۔ اور سحر و جادوگری میں مشہور تھی۔

ہیروڈوٹس کا قول ہے کہ مجی (MAGI) یا مجوس ایک میدیہ کا قبیلہ ہے۔ "مجی" کے معنی "مددگار بری روحوں کو اُتارنے یا اُن کے اثرات کو دور کرنے والے" کے ہیں وہ منجم، کاہن، طبیب و ساحر ہوا کرتے تھے۔ اوستا میں ان اعمال کا بہت ہی کم ذکر ہے۔ لیکن زردشتیت میں مجوس کی دو باتیں داخل ہو گئی ہیں اور یہ بھی زردشت کے بہت بعد کی معلوم ہوتی ہیں، یعنی مُردوں کو گدھوں کے لئے چھوڑ دینا اور قریب کے رشتہ داروں میں شادی بیاہ ہونا۔

زردشت (۶۶۰ تا ۵۸۳ ق م) خود زردشت سپتما میدیا یا اسی قرب و جوار کے باشندے تھے۔ اور اُنہیں ضرور مجوسیوں کی تعلیمات اور مذہبی عقیدوں کا علم رہا ہوگا۔ اسی لئے زردشت کے مذہب کو خالص ایرین مذہب نہیں کہا جا سکتا۔ ایرین خیالات کے ساتھ ساتھ زردشت کے مذہب میں تورانی اور سامی اثرات موجود ہیں۔ لیکن جس طرح اسرائیل کے نبیوں نے خدا کی وحدانیت کو اپنے مذہب کا محور بنایا تھا۔ اُسی طرح یا اُس

سے بھی بلند تخئیل وحدانیت الہٰی زردشت کا تھا ۔

بعد میں ثنویت کا مذہب چل نکلا ۔ اور یزدان و اہرمن کی کشمکش جزو مذہب بن گئی ۔ اس کی تفصیل یہ ہے :۔

زردشت کا مذہب آریہ نسل کے قدیم ترین کتبوں کی ابتدا اُن میخی خط کے کتبوں سے ہوتی ہے ۔ جو بیستون میں پائے گئے ہیں اور کیکاؤس (خسرو) اور داریوش اوّل کے زمانے کی یادگار ہیں ۔ ان کی صحیح تاریخ یقین کے ساتھ متعین ہو چکی ہے ۔ اور مکمل طور پر پڑھ لئے گئے ہیں ۔

ژند اوستا کا علم بہت بعد میں ہوا ہے ۔ لیکن اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے ۔ جو مندرجہ بالا کتبوں کی طرح اُسی زمانے میں لکھا گیا ہو ۔ جب کہ وہ تصنیف ہوا ۔ اور یہ امر مسلمہ ہے کہ غیر مربوط اور نامکمل ہے ۔ اور جو حصہ مناجاتوں (گاتھا گیت) پر مشتمل ہے ۔ اُس میں بعض حصے زبان کے لحاظ سے نہایت قدیم معلوم ہوتے ہیں ۔

اوستا کا پہلا حصہ ون + دی + داد (مخالف + دیو + دیا) ہے ۔ یعنی دیوؤں اور بری روحوں کو بھگانے کے منتر ہیں ۔ یہ اُس زمانے کی چیز ہے ۔ جب کہ مزدیت (یا مذہب زردشت) کو خراب کر کے عوام کے خیالات کے مطابق اوستا میں بعض باتیں داخل ہو گئی تھیں (مسلمانوں کا (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) وندیداد کا خلاصہ سمجھنا چاہئے ۔

اوستا کا دوسرا حصہ وِس پَرَد ہے ۔ اس میں مختلف زمانوں کی دعائیں جمع کر دی گئی ہیں ۔ تیسرا یشنا (جشن = یگ = قربانی) ہے اور چوتھا خرد اوستا ہے ۔ جو مختلف یزدانوں کے نام پر دعائیں ہیں ۔

اوستا یا آلستہ قانون کو کہتے ہیں یہی معنی تورات اور کتاب کے بھی ہیں یعنی اوستا زندگی کا قانون ہے۔

کتبوں کی زبان قدیم ایرانی زبان کی ہے۔ اور داریوش اول کے کتبۂ بے ستون سے ملی ہے۔ اسی زبان میں اوستا بھی لکھی ہوئی ہے۔ اس زبان سے پہلوی اور پہلوی سے موجودہ فارسی بنی ہے۔ کتبوں اور گاتھا کے مذہب میں خاصا اختلاف ہے (دیکھیے ص ۱۴۵ دی اولڈ جنرآف ریلیجین اینڈ لینگویج۔ از گگ۔ جان مرے لندن ۱۸۸۴)

کتبوں میں خدائے واحد کا ذکر ہے۔ جس کا نہ کوئی رقیب ہے۔ نہ مخالف۔ اسی سے ہر شے پیدا ہوئی ہے۔ اور اسی کو منبع خیر مانا گیا ہے۔

لیکن اوستا میں توہمات کی بھرمار ہے۔ اہرمن کا خاص ذکر ہے۔ مُردے سے ہر چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کتبوں میں دفن کرنا ہی بہترین بات مانی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتبوں کے زمانے میں مزدیت کی جو صورت تھی وہ بعد میں تبدیل ہو گئی۔ اور اہو مزدا کے ساتھ اہرمن کو بھی ایک توام روح اور خالق شر تسلیم کر لیا گیا۔

رگ وید میں فطرت پرستی موجود ہے۔ یہی حالت وسط ایشیا کی قوموں کی بھی تھی مسیح سے تین چار ہزار سال پہلے ویدک اور اوستائی قومیں ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ اور ان کی زبان اور عقاید ایک ہی تھے۔ بعد میں اصلاحی تحریکیں اُٹھیں اور زردشت نے اُس فطرت پرستی کی اصلاح شروع کی تھی۔ جو رگ وید میں اب تک بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ یعنی آکاش (ہوا) دھرتی ماتا (زمین) سوریہ (خورشید) سوم (ماہ) اگنی (آتش) سمندر (پانی (آب) کو دیوتا کہتے ہیں اور سوم رس (سوم شراب) کو آب حیات مانتے ہیں۔

کتبوں میں صرف اورافردا (اہورامزدا) کا ذکر ہے۔ زردشت نے اسی روحانی توحید کی بنا رکھی تھی۔ اور عقلمند رب (ہرمز) کی عبادت کا حکم دیا تھا۔ اور دروغ (دیو۔ اہرمن) کو ناپسند کیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ہرمز کے قانون (اشا) پر چلنے والے ہرمز کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی پاکر مکان نغمہ میں رہیں گے ۔

حقیقت میں مجوس نے زردشت کے مذہب میں دوئی (ثنویت) پیدا کی ہے۔ یہ برہمنوں کی طرح ایک پجاری قبیلہ تھا اور اہرمن (دشمن روح) کو ہرمز کے مقابلے میں اسی جماعت نے لا کھڑا کیا تھا۔ پھر بھی یہ ثنویت حقیقی نہیں ہے۔ آخرکار ہرمز (نور) کی اہرمن (تاریکی) پر فتح ہوگی۔ ہرمز کا آلۂ جنگ "دعا" ہے۔

مزدیت اور یہودیت

یورپین محققین کی کثرت رائے اس امر پر متفق ہے۔ کہ یہودیوں نے ساسانی عہد حکومت میں بہت سی باتیں مزدیت سے سیکھیں۔ اور جب عزرا نے توراۃ کو دوبارہ لکھا تو اُس میں یہ خیالات بھی داخل ہوگئے :۔

(۱) شیطان ایک طاقت ور بد روح ہے جس طرح اہرمن (ابلیس) مزدیت میں موجود ہے۔ اور وہ جہنم کا فرماں روا مانا جاتا ہے ۔

(۲) خدا روحانی ہے۔ اور واحد ہے۔ نہ کہ جیسا کہ یہودیوں کا خیال تھا کہ وہ صرف ان کے قبیلے کا خدا ہے۔ دوسری قوموں کے دوسرے خدا ہیں ۔

(۳) مرنے کے بعد پھر زندگی ہوگی (فراشاکرے تی)

(۴) خدا کی بادشاہت میں فرشتے اور چھوٹی بڑی پاک روحیں کارفرما ہیں۔ جس طرح امیش سپنتا (فرشتے) یا ایزد)

(۵) بائبل کی کتاب توبت) میں مزدیت کا گہرا رنگ موجود ہے۔

یہی نہیں بلکہ فلسفہ رواقیین (STOICS) کا قانون اخلاق یا قانون فطرت وہی ہے۔ جو مزدیوں کا اشا (ارتا) ہے۔ اور جو آتش میں ظاہر ہوتا ہے رواقیت کے بانی شہر طرسوس واقع صقلیہ کے باشندے تھے۔ جو عرصہ تک ایرانی قبضہ کی وجہ سے ایرانی خیالات کو یونان اور یہودیوں تک پھیلاتے رہتے تھے۔

اہرمن اور مار اہرمن کو زردشتی مذہب میں ایک طاقتور ہستی مانا جاتا ہے۔ جو خدائے خیر سے بالکل آزاد ہے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ یہ خیال تورانی اقوام کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو۔ خالدی اور بابلی آثار میں ایسے برتن برآمد ہوئے ہیں۔ جن پر ایک عورت اور سانپ کی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ اور سانپ کے دھوکے کے قصے بھی اُسی طرح کے ہیں۔ جیسے کہ بعد میں بابل کے اثر یہودیوں نے توراۃ میں داخل کر لئے۔

فارسی میں سانپ کو مار کہتے ہیں۔ بعینہ یہی لفظ ایک دھوکے باز اور لالچ دلا کر عبادت ترک کرانے والے کے لئے ہندو اور بدھ مذہب کی روایات میں ملتا ہے۔ مار دیو۔ کام دیو کو بھی کہتے ہیں۔ یہ شہوت کا دوسرا نام ہے۔ سنسکرت میں ار کے معنی زہر دوش یا بس) اور دھتورے کے بھی ہیں۔

عربی میں سانپ کو جانّ بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بابل ایران یہود، مصر۔ عرب اور ہند میں ہر جگہ شیطان، اہرمن، شیط۔ جان، مار، سانپ سب ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی فریبی، دھوکے باز، غائب ہو کر زہر پھیلانے والا وغیرہ وغیرہ اس خیال کا ماخذ قدیم دُنیا میں کس قوم میں سب سے پہلے پیدا ہوا؟

یورپین تحقیق جو بابل کے اثری انکشافات سے متاثر ہے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ یہ خیال سب سے

پہلے بابل میں شروع ہوا تھا۔

شرک

غالباً ایرانی اور بابلی اثرات سے یہودیوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا ایک ہے۔ بابل کی اسیری کے زمانے میں انہوں نے اپنی بائبل (کتاب و تاریخ قوم یہود) مرتب کی اور گو بہت سے خیالات بابلیوں سے لے کر اس میں ملا لئے۔ لیکن انہوں نے قبائلی خدا کے بجائے کل قوموں کا ایک ہی خدا تسلیم کر لیا۔ پھر دوسری قوموں کے اثر سے یہ بھی مان لیا کہ اس خدا کے یہاں دوسرے لوگ بھی (مثل نبی یا اولیاء اللہ کے) سفارشی ہو سکتے ہیں یعنی انہیں بھی خدائی حکمت و قدرت میں دخل ہے۔ اسی کو شرک کہتے ہیں۔

عیسوی مذہب، یہودی مذہب کو زندہ کرنے کی ایک تحریک تھی۔ حضرت عیسیٰ (سنہ ء تا سنہ ۳۰ء) نے یہودیوں کو اس قومی جذبے کے ماتحت کہ ایک مسیح (بادشاہ) پیدا ہونے والا ہے۔ جو یہودیوں کی قوم کو تاج و تخت دلا دے گا، اپنی تبلیغ شروع کی تھی۔ اور بتایا تھا کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جو تمہیں بادشاہت کی خوشخبری (انجیل) سناتا ہوں۔ لیکن ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ رومی سلطنت کے خلاف وہ یہودیہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہیں۔ بہرحال عیسائیت بھی یہودیت کی شاخ تھی۔ لیکن جب یہ تعلیم مصر پہنچی، اور وہاں کے فلسفیوں نے مصری تثلیث کے رنگ میں اسے رنگا۔ تو یہودیت نہ رہی۔ بلکہ ایک عجیب قسم کی ہمہ اوستی، مشرکانہ، اور موحدانہ تعلیم کا معجون مرکب بن گئی۔ بہت دنوں اس پر جھگڑا رہا کہ خدا اگر باپ ہے تو بیٹا بعد کے زمانے میں آیا ہوگا۔ اکثریت کی یہ رائے تھی کہ رشتہ تو باپ بیٹے کا ہے۔ لیکن دونوں ازل سے ساتھ

تھے۔ آگے پیچھے نہ ہٹتے۔ آخر کار ایک مشرک شہنشاہ قسطنطین کی صدارت میں اس کا ایک حل سوچا گیا۔ اور مذہب مشرکانہ ہو گیا۔

رومن سامراج میں بھی مشرکانہ مذاہب رائج تھے۔ اور سلطنت کا ایک مذہب نہ تھا۔ رومی شہروں میں ہر قسم کے مذہبوں کو آزادی تھی۔ عموماً مصری تثلیث (سیراپس ایپس) کا مذہب پھیل رہا تھا۔ ابتدائی مذہب متھراس دیوتا کی پرستش تھی۔ یہ الٰہانی دیوتا تھا۔ اور اس پر بیل کی قربانی کی جاتی تھی۔ اور اس کا خون حیات بخش سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ اپنے منہ اور جسم پر اسے ملتے تھے۔ پھر فرعونوں کی نقل میں خود شہنشاہ دیوتا اور غیر فانی بننے کی ہوس میں اپنے نام کا مجسمہ تبخانوں میں رکھواتے تھے۔ آئی سس (ملکہ جنت) کے تبخانے میں بھی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اُس کے گود میں ہورس نامی ایک بچہ بھی ہوتا تھا۔ اور جو پیٹر قومی خدا مانا جاتا تھا۔

حضرت عیسیٰ

(۴ء تا ۳۳ء) کے متعلق انجیلوں سے بہت کم حالات معلوم ہوتے ہیں پھر بھی انہوں نے تین سال تک محبت، بردباری اور عفو کی جو تعلیم دی وہ نئی نہیں تھی۔ بنو اسرائیل کے نبی یہی تعلیم دیتے تھے۔ اور یسوع مسیحؑ خود یہودی تھے۔ مذہبی رسوم کی تقلید کے خلاف جہاد اور غریبوں کی ہمدردی و تسکین پرانے نبیوں کی طرح کیا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پرانے نبی اس دُنیا میں جزائے اعمال کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن یسوعؑ کی توقعات دنیا کی بجائے دین سے زیادہ وابستہ تھیں۔ انجیل بتاتی ہے۔ کہ اس دُنیا میں شیطان کی حکومت ہے۔ اور مسیحیوں کی یہ دعا تھی کہ "جس طرح تیری بادشاہت

(اے خدا) جنت میں بنے۔ اسی طرح اس زمین پر بھی ہو"۔ اسی لئے جتنے مالدار آدمی تھے۔ وہ شیطان کے منظور نظر اور مسکین خدا کے دوست سمجھے جاتے تھے۔ غریب اور مسکین اس دُنیا میں مسافرانہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اصلی گھر دوسرا تھا۔ جہاں جانے کا سب کو انتظار رہتا۔ پھر بھی جب یسوع مسیح نے اس نئی زندگی اور نئی حکومت کا اعلان کیا۔ تو اُن پر یہودیہ میں ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا الزام لگا کر دو چوروں کے ساتھ سولی پر چڑھا دیا گیا +

مذہب عقلی

دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی عقل بھی ترقی کر رہی تھی۔ اور دُنیا کے عناصر پر جتنا انسانی اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ اُتنا ہی، انسان اپنے دیوتاؤں کو کم کرتا جاتا تھا۔ آگ پہلے خدا یا دیوتا تھی۔ پھر انسانی خوف کم ہؤا اور وہ دیوتا کے درجے سے گر کر انسانی لونڈی بن گئی۔ اسی طرح جو جو قدرتی قوتیں زیر ہوتی جاتی تھیں۔ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر انسان کی پرستش کے قابل نہ رہتی تھیں۔

اس قسم کے سائنٹیفک سوچ بچار کی ابتدا تو بہت قدیم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تاریخی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان عرب اور یونان میں یہ علم باقاعدہ مدون ہوا تھا۔ ہندوستان میں منطق و فلسفہ نے ویدک زمانے کے بعد ترقی کی تھی اور فلسفہ اور منطق کے مختلف مذاہب بن گئے تھے۔ عرب میں بھی ملحدوں کی کافی تعداد موجود تھی، جو بعث بعد الموت کے قائل تھے نہ خدا کے۔ وہ اپنی عقلی دلیلوں کی بنا پر کہتے تھے کہ اتفاقات زمانہ نے ہمیں پیدا کر دیا ہے۔ اور مرنے کے بعد زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا

ہے۔ موجودہ زندگی میں یہ دیوی دیوتا یا تو محض بے کار ہیں یا عوام کو دھوکے میں رکھ کر روپیہ کمانے کا ذریعہ ہیں۔

حکمائے یونان وہند و چین

یونان میں مسیح سے سات سو سال پہلے رزمنامے (ایلیڈ و اوڈیسی) لکھے جا چکے تھے۔ اور جس طرح بائبل نے بعد کے زمانے میں اور ویدوں نے اس سے پہلے یہودیوں اور آریوں کو ایک کتاب کی وجہ سے ایک متحدہ قومیت کا سبق دیا تھا۔ اسی طرح ان رزم ناموں نے یونانیوں کو ایک قوم بنایا۔ اور اپنی تاریخ میں دلچسپی پیدا کی۔ آخرکار ۴۳۸ھ ق۔م میں ہیروڈوٹس نے دنیا کی پہلی تاریخی کتاب لکھی۔ اور یونان میں سقراط جیسا حکیم پیدا ہوا۔ جس نے یہ سکھایا کہ نظریات بنانے سے پہلے اس چیز کو عقلی معیار پر جانچ لینا چاہئے۔ کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ وہ ہمارے عقل و تجربہ کے مطابق ہے یا نہیں مخالفین نے شور مچایا کہ سقراط ہمارے جوانوں کو غلط راستے پر لے جا رہا ہے۔ اس لئے ۳۹۹ھ ق م میں اُسے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ لیکن اُس کی فکری میراث ضبط نہ ہو سکی۔ افلاطون (۴۲۷ھ + ۳۴۷ھ ق۔م) نے اکیڈمی قائم کی اور نظریہ تخیلات و عالم مثال کے فلسفہ کو پیش کیا۔ اور ایک خیالی جمہوریت میں مشترک زندگی کا خاکہ کھینچا ارسطو (اُستاد سکندر اعظم) نے منطق اور سیاسیات کو مدون کیا۔ اور اخلاقیات کو بنیاد سیاست قرار دے کر انسانی افکار کو تجربہ و تعقل کی دعوت دی۔ اور عالم حیوانات و نباتات کا سائنٹیفک مطالعہ سکھایا۔ اور سکندر کے بعد اُس کے ایک امیر نے سکندریہ میں علمی تحقیق کو زندہ رکھنے کے لئے ایک میوزیم و کتب خانہ قائم کیا۔ ان سب تحریکوں کا یہ اثر ہوا کہ انسانی

فکر آزاد ہو کر کائنات کی گتھی کو سلجھانے میں مشترک کوشش کرنے لگی +

ابتدا میں یونانی آریوں کا خدا زیوس (دیو یا دیوتا) تھا۔ اور کوہ آلمپس پر اُس کا قیام مانا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ عوام تو اُسے اور اُس کے ساتھ متعدد خداؤں کو مانتے رہے لیکن حکما اپنی عقلی دلائل سے اس سے بلند ہو گئے تھے +

(۳) یونان میں رائے کو آزادی تھی۔ حتیٰ کہ زینوفن نے مصری دیوتا اوسی رس کا خوب مذاق اُڑایا۔ کہ عجیب قسم کا خدا ہے۔ جو زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ پھر مرتا ہے اور زندہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ آدمی ہے تو اُس کی پرستش فضول ہے۔ اور دیوتا ہے۔ تو اُس کی تکلیفوں پر ماتم کرنا بے جا ہے۔ اُسی نے لوگوں کو ہومر کی حماقتوں پر آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ اُس نے اپنی نظموں میں دیوتاؤں کو بالکل انسانوں کی طرح جذبات کا بندہ دکھایا ہے۔

ہاں ایتھنز میں مذہبی رواداری نہ تھی۔ آزاد خیالی اس لئے ناپسند کی جاتی تھی۔ کہ وہ دوسرے ملکوں سے آئی تھی۔ خود ملکی پیداوار نہ تھی۔ جبکہ ایک فلسفی نے یہ کہنا شروع کیا کہ سورج ایک زندہ دیوتا (HELIOS) نہیں بلکہ جلتا ہوا لوہا ہے۔ اور ستارے آسمانی روحیں نہیں۔ بلکہ پتھروں کا ڈھیر ہیں جو گردش کر رہے ہیں۔ اور جوپیٹر۔ ڈیانا اپالو، مریخ، اجونو اور منروا سب شاعروں کی خیالی پیداوار ہیں۔ اور اگر وہ واقعی زندہ روحیں ہیں تو کسی عزت کی مستحق نہیں۔ اور اندھی قسمت کی جگہ ایک سُنتا دیکھتا نفس سب کا مالک ہے۔ تو عوام میں غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ایک کاہن اس کے خلاف سڑکوں پر شور مچاتا ہوا پھرنے لگا۔ اور ایک قانون پاس کرا لیا۔ کہ اگر کوئی شہر کے دیوتاؤں کے خلاف زبان کھولے گا یا اُن کا فلسفہ بیان کرے گا۔ تو وہ باغی سمجھا جائے گا۔ اس قانون پر جلد ہی عمل بھی شروع ہو گیا۔ دامون اور انکساغورث جلاوطن کر دیے گئے۔ اپساسیہ پر کفر کا فتویٰ لگا اور پیر کلیز کے

آنسوؤں نے اُس بیچاری کی جان بچائی۔ سقراط (سنہ ۴۷۰ ۔ سنہ ۳۹۹ ق م) کو ایتھنز والوں نے نوجوانوں کے بہکانے کے جرم میں قید کر دیا۔ اور پھر یہ سزا دی کہ وہ جلاوطن ہو جائے یا موت کو پسند کرے۔ اُس نے باوجود اپنے دوستوں کے اصرار کے یہ پسند کیا کہ جلاوطن ہو یا جیل سے بھاگ نکلے۔ اس نے بتایا کہ ادائے فرض کے لئے یہاں رہنا ضروری ہے۔ اور موت سے بھاگنا بزدلی ہے۔ آخر کار اُسے زہر کا پیالہ پلا دیا گیا۔ جرم یہ تھا کہ دھوکے باز فلسفیوں (سوفسطائیوں) کو یہ بتاتا تھا کہ جو تم کہتے ہو کہ ہمیں "علم" ہے۔ یہ غلط کہتے ہو۔ تم خود بھی دھوکے میں ہو اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیتے ہو۔ اس لئے کہ جو کچھ تم جانتے ہو۔ وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ جزئیات و اعراض کی بجائے کلیات و جواہر کا جاننا علم کی غایت ہے۔ اس کے فلسفہ کو افلاطون (سنہ ۴۲۷ ۔ سنہ ۳۴۷ ق م) نے مدون کیا۔ اور مجبور ہوا کہ خالص عقل کی باتوں کو مخصوص احباب تک محدود رکھے۔ ورنہ اُس کا بھی وہی حشر ہوتا جو سقراط کا ہوا تھا۔ عام شاگردوں کے لئے وہ ایک طرح کی الہامی تعلیم اس میں ملا دیتا تھا۔ ارسطو (سنہ ۳۸۴ ۔ سنہ ۳۲۲ ق م) نے موت پر جلاوطنی کو ترجیح دی۔ اُس کے ہزاروں دشمن ہو گئے تھے۔ اور جب سکندر مرا تو مقدونیہ والوں نے اُس پر فوراً مقدمہ چلا دیا۔ کہ اس نے ایک قصیدے میں شاہ ہرمیاس کو دیوتا بنا دیا ہے۔ اور اُس کے حکم سے ہرمیاس کا بُت ڈلفی کے مندر میں رکھا گیا ہے۔ یعنی ارسطو نے قومی دیوتاؤں کی توہین کی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ اسے بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ لیکن یونان کا قانون تھا کہ اگر کوئی ملزم مقدمہ کی تاریخ سے پہلے جلاوطنی اختیار کرلے تو وہ بچ سکتا تھا۔ اس لئے وہ فرار ہو گیا۔ اور کہا کہ مَیں اس لئے فرار ہوا ہوں کہ اہلِ ایتھنز کو دوبارہ فلسفہ و حکمت کے خلاف جرم کرنے کا موقعہ نہ دوں۔ جیسا کہ وہ سقراط کو زہر دے کر ایک دفعہ گنہگار ہو چکے ہیں۔

گوتم بدھ (GAUTAM BUDDHA) کے وجود کے متعلق مؤرخوں میں اختلاف ہے۔ لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ برہمنوں کے مذہب اور ذات پات کے خلاف ایک نئی تحریک چھٹی صدی مسیحی میں اُٹھی تھی جس نے ذات پات کو مٹایا۔ اور برہمنوں کے انفرادی نجات کے عقیدے میں ہر اُس شخص کو داخل کر لیا جو ہشت برگ (آٹھ راستوں) پر عمل کرے۔ اور لوبھ، موہ، کام، ہوس تکبر و کینہ کو دل سے نکال ڈالے۔ ایسا شخص فراغت کاملہ یا نروان (بے خودی) کے درجے پر پہنچ کر آواگون سے نجات پا جاتا ہے۔

کن فوشے (CONFUCIUS) بھی اسی زمانے میں جبکہ چین میں کئی ہزار سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اور طوائف الملوکی تھی۔ اپنی اکیڈمی میں حکمت و فلسفہ کی تعلیم دے رہا تھا۔ وہ امرا کے لئے ایک شایان شان اخلاقی و سیاسی طرزِ عمل بتاتا تھا۔ گویا وہ طبقہ امرا کا معلم تھا۔ افسوس ہے کہ اُس کی زندگی میں اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ کہ کوئی بادشاہ اُسے اپنا استاد یا گرو تسلیم کرتا۔ مرنے کے بعد اُس کی تعلیم بدھ مت اور تاؤ مت کے ساتھ چین میں حصّہ اول تھی۔

لاؤ تزے (LAOTZE) چین کے شاہان چاؤ کا ناظم کتب خانہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قدیم زمانہ دُنیا کا زرّیں زمانہ تھا۔ لوگ بچوں کی طرح رہتے تھے۔ نہ کل کے لئے اندوختہ کرتے تھے۔ نہ لڑنے کے بعد کینہ رکھتے تھے۔ بلکہ مرنجان مرنج زندگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ بچوں کی طرح سادہ، بے فکر اور بے غم ہو جائیں۔

مانی (۲۱۵ء تا ۲۷۳ء) کا مذہب ہر مذہب کی اچھی باتوں کو قبول کر لیتا تھا۔ وہ زردشت۔ گوتم بدھ اور یسوع مسیحؑ کو حقانیت کا علمبردار مانتا تھا۔ اور اپنے آپ کو ان کی تعلیم کا مکمل کرنے والا بتاتا تھا۔ (تاریخ البیرونی۔ ترجمہ سخاؤ صفحہ ۱۹۰) اس قول کی تائید دوسرے ذریعوں سے بھی ہو چکی ہے (دیکھئے پروفیسر اے۔ وی۔ ولیم جیکسن کی تحقیقاتیں۔ کولمبیا یونیورسٹی۔ نیویارک ۱۹۳۲ء) وہ کل دنیا کو ایک مذہب سکھانا چاہتا تھا لیکن زردشتی موبدوں نے اُسے "شیطان مجسّم" قرار دیا۔ اور شاپور نے اُسے ایران بدر کر دیا۔ وہ بیس سال تک جلا وطن رہا اور شمالی ہند۔ چینی ترکستان، تبت اور خراسان میں پھرتا رہا۔ وہ ہُرمز بن شاپور کے زمانے (۲۷۳ء ۲۷۳ء) میں ایران واپس آیا۔ آخرکار اس کو موبدوں کی ریشہ دوانی سے بہرام نے بُری طرح قتل کیا۔ وہ زندہ جلایا گیا۔ اور اُس کی کھال میں بھوسا بھرا گیا۔ اور اُس کا سر کاٹ کر شاہی دروازے پر اس لئے لٹکایا گیا کہ آئندہ کوئی "کفر" نہ بکے۔

مانی کا نظریہ کائنات قدیم ثنویت پر مبنی تھا جس میں نور و ظلمت اور خیر و شر میں کشمکش کا ہونا مانا گیا تھا۔ اس عقیدہ میں مانی نے روحانیت بھر دی۔ مانی نور کو روح اور ظلمت کو مادہ قرار دیتا تھا۔ اس نے دُنیا میں تین زمانے مانے تھے۔ ابتدائی درمیانی اور آخری پہلے زمانے میں اوپر نور ہی نور تھا۔ اور نیچے تاریکی تھی۔ اور دونوں جگہ نور و ظلمت کی اپنی اپنی حکومت قائم تھی۔ پھر ظلمت نے نور پر حملہ کیا۔ اور پہلا دور حیات ختم ہو گیا۔ دوسرا زمانہ موجودہ دور کا ہے جس میں نور و ظلمت میں جھگڑا جاری ہے۔ پھر انسان اول (آدم سے مراد نہیں ہے) نے روحانی طور پر ظلمت سے جنگ شروع کی۔ جو شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اور آخرکار چھوٹا لیکن اس کا کچھ نور دیووں نے نگل لیا۔ اس نور کو حاصل

کرنے کے لئے دُنیا پیدا کی گئی۔ جس کی نقل میں دیوؤں نے انسان پیدا کیا۔ لیکن انسان کا جسم مادی یا شیطانی ہے۔ اُس میں وہ نُور موجود ہے۔ جو روحانی انسان یہاں چھوڑ گیا۔ اور اگر انسان نیک زندگی بسر کرے تو اُس کے نورانی ذرّات اپنے اصلی مرکز پر واپس جا کر ازلی نور سے داصل ہو سکتے ہیں ⁂

تیسرا زمانہ قریب ہے۔ جب پوری دُنیا ۱۴۶۸ سال تک جلتی رہے گی۔ اور نور کا آخری ذرّہ دُنیا سے نجات حاصل کر کے اپنے مرکز پر پہنچ جائے گا۔ اور نور کی حکومت پورے عالم پر ہو گی ⁂

مانی کی شہادت کے بعد اُس کا مذہب رومن سام راج کے آخری حدود تک پھیل گیا۔ اور مشرق میں مرکزی ایشیا اور چین تک پہنچا ⁂

مانویت اب باقی نہیں ہے۔ لیکن ایک فرقہ یزیدی اب بھی موجود ہے۔ جو اس کی تعلیمات کو خفیہ طریقے پر مانتا ہے۔

براون مانویت کو نصرانی مزدیت (CHRISTIANISED ZOROASTRIANISM) کہتا ہے یعنی مزدیت پر تصوف کے اضافے سے مانویت بنی ہے۔ مزدیت میں روزے کا وجود نہیں مانی نے روزہ فرض قرار دیا۔ شادی بیاہ کو ختم کرنا چاہا تا کہ نسل انسانی ہی باقی نہ رہے ⁂

مانی کا خیال تھا کہ اصلی یسوع مسیح صرف رُوح ہی رُوح تھے۔ نقلی مسیح ایک "بیوہ کا لڑکا" تھا۔ اور اُسی کو سولی دی گئی تھی۔ مسیح دنیا میں صرف روحانی شکل میں بحیثیت پیغمبر خدا آئے تھے۔ اور خود مانی اپنے آپ کو وہ فارقلیط یا مسیح موعود کہتا تھا۔

مزدک (۴۷۰ء تا ۵۲۹ء)

مانی کے تین سو سال بعد، اُس کا ایک قسم کا ہمنوا مزدک بن بامداد پیدا ہوا۔ وہ ایک طرح سے افلاطون کا بھی شاگرد کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ملکیت مشترک۔ حتیٰ کہ زمین و زر ہی نہیں بلکہ زن کو بھی مشترک بنانا چاہتا تھا۔ ان خیالات نے نہ صرف زردشتی مذہب کو بلکہ حکومت ایران کو بھی اُس کا مخالف بنا دیا۔ لیکن اُس کا مقصد زیادہ تر تصوف یا ترک دُنیا سے تھا۔ اور وہ زر، زمین، زن کو ناقابل اعتنا سمجھ کر اُن کو آزاد کر دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ دولت اور عورت ہی جھگڑے کی بنا مانی جاتی تھیں۔ وہ زردشتی کی ثنویت کو مانتا تھا اور آتش و آب و باد و خاک کو پاک اور مقدس رکھنا چاہتا تھا۔ شہزادۂ نوشیروان کے حکم سے اُس کو اور اُس کے ساتھیوں کو غدر و فریب سے قتل کر دیا گیا۔ اور جب وہ خسرو اول کے نام سے تخت پر بیٹھا تو پھر ۵۳۱ء میں مزدکیہ کو قتل کیا گیا۔

شہرستانی کا قول ہے کہ مزدکیہ اور ہندو مذہب والوں کی طرح تناسخ کے قائل تھے۔ حالانکہ یہ تعلیم ژند اوستا میں قطعاً موجود نہیں ہے۔

اُس نے مانی کی تعلیم سے نور و ظلمت کے فلسفہ کو سیکھا تھا۔ اور کہتا تھا کہ نور کو عقلمند اور ظلمت کو بے وقوف و گمراہ سمجھتا تھا۔

مزدک کا خیال تھا کہ رُوحانی دُنیا بھی موجودہ دُنیا کی طرح چلتی ہے۔ یعنی آسمان کا بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے۔ اور اُس کے سامنے چار قوتیں، تدبر، عقل، حافظہ اور مسرت کھڑی رہتی ہیں۔ اور سات وزیروں کے ذریعے سے کام کرتی ہیں۔ یہ وزیر

بارہ روحوں کے اندر گردش کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنے اندر چار قوتوں، سات وزیروں اور بارہ روحوں کو جمع کر لیتا ہے۔ وہ خدا سے ایسی دُنیا میں واصل ہو جاتا ہے۔ اور اُس پر سے جملہ پابندیاں اُٹھ جاتی ہیں +

مزدک کی ایک کتاب تھی جو اب ناپید ہے۔ عرب اس سے واقف تھے۔ ابن المقفع اور ایک اَور شخص نے اس کا عربی ترجمہ کیا تھا۔ دیکھئے ہو آرٹ۔ این شنٹ پرسٹیا ص ۱۸۳-۱۸۴ +

تیسری فصل

توراۃ یا عہد نامہ قدیم

حاجی خلیفہ کا کشف الظنون میں قول ہے کہ "توراۃ ایک الہامی کتاب ہے۔ جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے تین مشہور ایڈیشن ہیں:-

(۱) توراۃ السبعین۔ اسے ۷۲ یہودی حبروں نے عبرانی سے یونانی میں ترجمہ کیا تھا۔ اب اس کا ترجمہ سریانی و عربی میں ہو گیا ہے:-

(۲) توراۃ القرائیین و ربّانیین

(۳) توراۃ السامرۃ۔

حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے یہ تینوں کتابیں مطالعہ کی ہیں۔ ان کی رائے ہے۔ یہودیوں نے ان میں تحریف کی ہے"۔ (کشف الظنون۔ فلوگل جلد ۲ صفحہ ۴۵۹)

سنڈرلینڈ اس رائے کی تائید میں لکھتا ہے:- یہ خیال محض ایک روایت ہے۔ کہ توراۃ کے مصنف حضرت موسیٰؑ تھے۔ اور یہ روایت بھی بہت بعد کی ہے۔ خود توراۃ میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ موسیٰؑ اس کے مصنف تھے۔ اس مجموعۂ کتب میں بہت سے مصنفوں کی تصنیفیں ہیں۔ جن میں سے بعض بہت بعد کی ہیں۔

فارلانگ کا قول ہے۔ کہ "توراۃ السبعین (LXX) اس معیاری کتاب کا ترجمہ

سمجھی جاتی ہے۔ جو یروشلم کے معبد میں تھی۔ اور سنہ ۲۵۸ ق م سے سنہ ۲۳۰ ق م تک یونانی میں ترجمہ ہوئی۔ وہ "معیاری کتاب" جسے عزرا (عزیر) نے مرتب کیا تھا۔ اور جس میں بعد میں اضافے بھی ہوتے تھے۔ سنہ ۷۰ء میں یروشلم کی تباہی کے وقت ضائع ہو گئی تھی۔ یہ تباہی شہنشاہ روما کے بیٹے طیطوس نے کی تھی۔ حقیقت یہ ہے۔ اصلی کتاب دنیا میں موجود ہی نہیں" ف۔ س (۱۴۳) "اس کے بعد پوری یہودی قوم فلسطین سے جلاوطن کر دی گئی تھی۔ یروشلم کے ساتھ ساتھ اُس کا معبد بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔ اور مقدس چیزوں کے ساتھ ساتھ "مقدس کتابوں کی معیاری نقلیں" ہمیشہ کے لئے دنیا سے ناپید ہو گئی تھیں۔ طیطوس نے یوسفاروکی وطن دشمنی کا یہ انعام دیا تھا۔ کہ اُسے اجازت دیدی تھی۔ کہ مقدس مکتوبات کو وسپاسین کے پاس روانہ کر دے۔ جو اس وقت روما میں قیصروں کے محل میں مقیم تھا۔ اس کے بعد اُن کی کوئی خبر نہیں سنی گئی" (ف س ۱۴۸)

اُس زمانے میں توراۃ کی تین قسم کی کتابیں موجود تھیں:۔

معیاری توراۃ یروشلم | مصنّفہ عزرا (عزیر) از سنہ ۴۴۴ ق م تا سنہ ۳۶۰ ق م یہ موسیٰ ثانی مانے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے بذریعہ الہام پوری توراۃ کو جو سنہ ۵۹۹ ق م سے سنہ ۳۷۰ ق م تک بالکل ضائع ہو گئی تھی۔ کاتبوں کو لکھوا دیا تھا۔

قوم موسیٰ پر اس وقت تک دو بڑی تباہیاں آ چکی تھیں۔ حضرت سلیمان کے بعد شمالی فلسطین آزاد ہو کر اسرائیلی سلطنت بن گیا تھا۔ اور یروشلم یہودیوں (یہوداہ) کا دارالسلطنت باقی رہ گیا تھا۔ سنہ ۷۲۱ ق م میں اسرائیلی سلطنت کو تباہ کر کے ان کے دسوں قبیلوں کو آشوریوں نے سارگون ثانی کے حکم سے جلاوطن کر دیا۔ اُن کی بابت اب دُنیا

کو کوئی یقینی معلومات نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ افغان اُن ہی اسرائیلیوں کی نسل سے ہیں ؂

اس کے بعد بخت نصر نے باقی ماندہ دو یہودی قبیلوں کو قید کر کے ۶۰۴ھ ق م میں بابل بھیج دیا۔ یہاں ان لوگوں نے اپنی قدیم تاریخ اور روایات کو مدون کیا۔ اور بابل کی تہذیب سے آراستہ ہوئے ؂

سائی روس نے ۵۳۹ھ ق م میں بابل فتح کر لیا۔ اور ایرانی سلطنت کا بانی ہوا۔ اُس نے یہودیوں کو یروشلم واپس جانے کی اجازت دی ؂

۲۔ توراۃ السبعین دوسری اہم توراۃ ہے۔ یہ بھی ضائع ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ ۴۷ھ ق م میں بروخیئم (BRUCHIUM LIBRARY) کے کتاب خانہ میں جو آگ لگی تھی۔ اس سے یقیناً یہ نہیں بچی ؂

۳۔ توراۃ السامرہ (SAMARITAN ROLL) ہی اب اصلی توراۃ سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہ بھی بعد کی محرّف نسخہ کی نقل کہی جاتی ہے۔ اس لئے اصلی توراۃ السامرہ جو کوہ گرازِم کے معبد کے لئے تیار کی گئی تھی۔ وہ اُس معبد سے بہت پہلے تباہ کر دیا گیا تھا۔ جو کوہ موریہّ پر تھا۔ یہ توراۃ السبعین سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اور سامرہ کے حبروں نے اس میں بہت کچھ تحریف کی ہے (دیکھئے ف۔ س۔ ۲۲۰)

انسائیکلوپیڈیا برطانکا کی جلد سوم کے صفحات ۸۵۵ سے ۸۶۶ تک اسی تحریف کا تذکرہ ہے۔ یعنی توراۃ کا سب سے پرانا نسخہ دسویں صدی مسیحی (۹۱۶ء) سے پہلے کا موجود نہیں۔ اور کاتبوں نے اس کی نقل میں بہت کچھ آزادی برتی ہے جتیٰ کہ خود یہودی قائل ہیں کہ اٹھارہ مقامات پر اصل زبان کو بدل دیا گیا ہے۔ اور اس میں تو ذرا شبہ نہیں کہ موجودہ

مسودہ تورات اصل کتاب کا کسی طرح نمائندہ نہیں ؛

بہرحال موجودہ توراۃ کی پہلی پانچ کتابوں کو یہودی توراۃ ۔کتاب یا قانون کہتے تھے ۔ اور مسیح سے دو سو سال پہلے جب اس کا یونانی ترجمہ ہوا ۔ تو اس کا نام پنتا توشش (PENTATEAUCH) رکھا گیا ۔ ان نام نہاد کتب موسوی میں چار نظام قانون پائے جاتے ہیں ۔ ان کی ترتیب یہ ہے :۔

(۱) کتاب معاہدہ (یعنی وہ معاہدہ جو خدا نے بنو اسرائیل سے کیا) یہ کتاب خروج فصل ۲۰ سے ۲۳ : ۳۳ تک کی کتاب کا نام رکھا گیا ہے ۔ اسی سے متعلق کتاب خروج ۳۴ ویں فصل کی ۱۱-۲۶ آئتیں ہیں :۔

(۲) کتاب (AEULERS) کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۶۲۱ھ ق م میں یروشلم کے سردار پروہت کو معبد میں ملی تھی ؛

(۳) قانون پاکیزگی (LENITIOS) فصل ۱۷ تا ۲۴ ۔

(۴) قانون پروہتان یعنی بقایائے قانون موسوی ؛

اگر موجودہ تنقید کو صحیح فرض کر لیا جائے کہ کتاب خروج آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوسیہ ، اموس اور میکہ نبیوں کے زمانہ میں تیار ہوئی تھی اور احکام عشرہ بعد میں بڑھائے گئے ہیں ۔ تو یہ کتاب حمورابی کے زمانے سے بہت دور ہو جاتی ہے ۔ لیکن بابل کے اُن اثرات سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے ۔ جو آشوری فتوحات کی وجہ سے اُس زمانے میں مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے ۔ کہ کتاب معاہدہ "قانون حمورابی سے کافی حد تک مماثلت رکھی ہے ۔ بہرحال ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں ۔ موسوی قانون بابل کے قانون سے اتنا ملتا جلتا ہے ۔ کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُسی سے نکلا ہے ۔ اس

تمہید کے بعد ہم ذیل میں توریت کی تاریخ کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ تاکہ جن لوگوں کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اُن کے متعلق ناظرین یہ اندازہ لگا سکیں۔ کہ خود مذہب موسوی و عیسوی کے ماننے والے اپنی قدیم تاریخ کس طرح بیان کرتے ہیں۔

خلاصہ تاریخ توریت

(یہود و نصاریٰ اپنی قدیم تاریخ مندرجہ ذیل طریقہ پر بیان کرتے ہیں)

تکوین | (۱) سب سے پہلے خدا نے آسمان اور زمین پیدا کی۔ اور دُنیا چھ دن میں پیدا ہوئی۔ (بقول میک لیر یہ "چھ دن" نہیں بلکہ "چھ زمانے" یا دور ہیں)

(۱) پہلے دن روشنی پیدا کی گئی اور تاریکی سے الگ کی گئی۔

(۲) دوسرے دن آسمان، یا وہ ہوا جو زمین کے گرد ہے۔

(۳) تیسرے دن خشکی کو تری سے الگ کیا گیا۔ اور نباتات پیدا کی گئی۔

(۴) چوتھے دن سورج چاند اور ستاروں کو حکم دیا گیا کہ زمین کو روشنی دو۔

(۵) پانچویں دور میں مختلف قسم کی مچھلیاں اور پرندے بنے۔

(۶) چھٹے دن مویشی۔ رینگنے والے جانور اور درندے بنے۔ اور خدا نے کہا "بہت خوب ہے"۔ ... پھر خدا نے انسان کو اپنی شکل کا مٹی سے بنایا۔ اور اُس کی ناک میں پھونکا۔ تو وہ زندہ جان دار ہو گیا۔

ساتویں دن خدا نے آرام کیا۔ اور انسان کے لئے بھی وہ دن آرام کا دن قرار پایا۔

(قرآن اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ خدا تھک جاتا ہے۔ اور اُسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے یہاں یہ نوٹ کر لیجئے۔ کہ قرآن یہود و نصاریٰ کی بیان کردہ باتوں میں سے اکثر کا انکار کرتا ہے۔ یا

اُن کی اصلاحی صورت پیش کرتا ہے۔ اس لئے آئندہ جب تفصیل سے قرآن کو سیرت نبوی کے سلسلہ میں بیان کیا جائے گا۔ وہاں یہ سب اختلافات سامنے آجائیں گے)

آدم وحوّا اور باغ عدن آدم کے رہنے کیلئے خدا نے مشرق میں ایک باغ (جنّت) بنایا۔ یہ مقام وہی ہے۔ جہاں آرمینیہ تھی۔ چار دریا اسے سیراب کرتے تھے۔ جن میں سے دجلہ و فرات اب بھی باقی ہیں۔ پیسون اور جیحون کا مقام اب مفقود ہے۔ آدم تنہائی سے گھبرائے تو گہری نیند میں خدا نے اُن کی ایک پسلی نکال کر اُس سے حوّا کو بنایا۔ ان دونوں سے پوری نسل انسانی پھیلی *

اچھائی اور بُرائی بتانے والا پیڑ اُس باغ میں اُنہیں صرف ایک حکم ملا تھا کہ سب پیڑوں کے پھل کھا سکتے ہیں۔ لیکن شجر علم کا پھل نہ کھائیں (ورنہ کھاتے ہی مرجائیں گے) یہ درخت باغ کے بیچوں بیچ تھا *

(اس کے پھل کی یہ خاصیت بتائی جاتی ہے۔ کہ جو شخص اس کا پھل کھا لے گا۔ وہ ہر فعل یا ہر شے کے حسن و قبح یا اچھائی اور برائی سے واقف ہو جائے گا۔ اور جب وہ جان لے گا کہ فلاں کام نیک ہے اور فلاں بد ہے۔ تو لا محالہ وہ بچوں کی طرح سادہ لوح نہیں رہیگا بلکہ عقلمند اور صاحب تمیز انسان ہو جائے گا۔ عقل، تمیز اور سمجھ کے ذریعے سے کام کرنے لگیگا۔ اور بچوں یا جانوروں کی طرح صرف اپنے رجحانات طبعی کی وجہ سے کام نہ کرے گا۔ لہٰذا جب خود اپنے اختیار اور عقل سے کام کرے۔ تو اُس کو ان کاموں کا جواب دہ بھی ہونا پڑیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ توریت کا یہ بیان محض تمثیلی ہے۔ اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب تک انسان کی عقل بچوں کی سی تھی۔ اس وقت تک وہ جنّت میں تھے۔ اور اُن کے اعمال کی باز پرس اُن سے نہ ہوتی تھی۔ جب عقل آئی تو مختار ہو گئے۔ اور نیکی بدی کی جزا سزا ملنے لگی۔ اور اُس

جنت سے نکل کر اپنا راستہ سوچنے پر مجبور ہو گئے)

لالچ اور شیطان

انسان کی پیدائش کو ایک شخص دیکھ رہا تھا۔ یہ بہت ہی چالاک مکار تھا۔ خدا اور ہر بھلی بات کا دشمن تھا۔ تورات میں اسے سانپ (عربی "حیان") کہا ہے۔ اور بعض جگہ شیطان (یعنی دشمن) اور دیو (یعنی چغل خور) بھی لکھا ہے۔ وہ حوّا کے پاس آیا۔ اور حال پوچھا تو انہوں نے کہا ہر پھل کھانے کی اجازت ہے لیکن اس پھل کے کھانے کی اجازت نہیں جس سے "نیکی بدی کا علم" ہو جاتا ہے۔ بہکانے والے (سانپ) نے کہا۔ کہ کھاتے ہی نہ مرو گی۔ البتہ یہ ہو گا کہ نیکی اور بدی کے علم سے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ اور تم دونوں کا شمار دیوتاؤں میں ہونے لگے گا۔

آزمائش کے بعد ناکامی یعنی اُفتادگی یا ہبوط (گرنا)

حوّا دھوکے میں آ گئیں انہوں نے دیکھا درخت خوبصورت ہے۔ پھل کھانے کے لائق ہے۔ اس سے عقل پیدا ہوتی ہے۔ پھل توڑا۔ خود کھایا اور آدم کو کھلایا۔ اور آنکھیں تو کھل گئیں۔ مگر نافرمانی کے احساس سے دل دُکھی ہو گیا۔ علم ملا لیکن خوشی جاتی رہی۔ (گویا آدم لالچ کی بدولت امتحان میں ناکام ہو گئے)

خدا نے حوّا سے کہا تو اب رنج اور دُکھ میں رہا کرے گی۔ بچے دُکھ سے پیدا ہونگے۔ اور تیرا شوہر تجھ پر حکم چلائے گا۔

آدم سے کہا اب تمام عمر روزی کے لئے مشقت کرنا پڑے گی۔ انجام موت اور قبر کی خاموشی ہو گا۔ تو مٹی سے بنا اور مٹی ہی میں چلا جائے گا۔ زمین پر کانٹے پیدا ہونگے اور زندگی مشکل ہو جائے گی۔

سانپ (شیطان) سے کہا عورت میں اور تجھ میں دائمی دشمنی قرار دی جاتی ہے

تو اس کی ایڑی ڈسے گا وہ تیرا سر کچلے گی۔ اور وہ لعنتی قرار پایا۔ ہر مویشی اور درندہ اُس کا دشمن ہو گیا۔

شجر زندگی کی وجہ سے باغ عدن سے نکالا جانا | باغ میں ایک اور درخت تھا جس کا پھل کھانے کے بعد ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جاتی تھی۔ پھر موت کبھی نہ آتی تھی۔ خدا نے اس خیال سے آدم کو باغ سے نکال دیا۔ کہ کہیں اس پھل کو کھا کر وہ ہمیشہ کی زندگی نہ پا جائے۔ اور شجر زندگی کی حفاظت کے لئے ایک تلوار مقرر کر دی۔ جو اُس کے چاروں طرف گھومتی تھی۔ اور موت کے ڈر سے کوئی اُس کے قریب نہ جا سکتا تھا۔

ہابیل وقابیل | آدم وحوّا کے دو لڑکے تھے۔ قابیل (حاصل کیا ہوا) اور ہابیل (سانس ناپائیداری) یہ نیک تھا اور قابیل شریر۔ لہٰذا دونوں میں لڑائی رہتی تھی۔ ایک دن خدا نے ہابیل کی قربانی قبول کر لی۔ اور قابیل کی نہ کی۔ اس نے طیش میں آ کر ہابیل کو قتل کر دیا۔ اور عدن کے ملک سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا گیا۔

جلا وطنی میں قابیل کے بہت سی اولاد ہوئی۔ اور اس نے دنیا کا سب سے پہلا شہر انخ (ENOCH) اپنے بڑے بیٹے کے نام پر آباد کیا۔ اسی انخ کی چوتھی پشت میں لامخ پیدا ہوا جس نے کئی شادیاں کیں۔ اس کے تین بیٹوں نے نئی نئی باتیں ایجاد کیں۔ جبل نے خیمہ بنایا۔ جوبل نے باجے بنائے۔ اور طوبل نے دھاتوں کا استعمال شروع کیا۔

شیث (بدلا) | ہابیل کے بدلے میں خدا نے آدم کو شیث دیا۔ اور اس

سے جو اولاد ہوئی وہ قابیل کی اولاد سے مختلف قسم کی تھی۔ اس کی دسویں پشت میں نوح پیدا ہوئے۔

ای نخ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا شیث کی چھٹی پشت میں ای نخے بہت نیکوکار آدمی تھا۔ اور ایک دن وہ غائب ہوگیا۔ یعنی خدا نے اسے موت کے بغیر زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔

نوحؑ (راحت یا آرام) سنہ ق م جب نوح کی عمر پانسو برس کی ہوئی۔ تو اُن کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ سام۔ حام اور یافث۔ نوحؑ بھی ای نخے کی طرح نیکوکار تھے۔

طوفان لیکن دنیا میں ظلم اور بدکاری بڑھنے لگی۔ اور جب اس کی حد ہوگئی۔ تو خدا نے ہر جاندار کو مار ڈالنے کے لئے ایک طوفان بھیجنے کا ارادہ کیا۔ اور نوحؑ سے کہا کہ ایک تین سو ہاتھ لمبی، پچاس ہاتھ چوڑی اور تیس ہاتھ گہری کشتی بناؤ جس میں پاک جانوروں (جو قربان کئے جاتے ہیں) اور ناپاک جانوروں (جو قربان نہیں کئے جاتے) کے جوڑے اور تم اپنے خاندان والوں کے ساتھ سوار ہو جاؤ۔

جزا (JUDG MENT) جانچ عربی میں قیامت کے دن کو یوم الدین و یوم جزا کہتے ہیں "دین" یعنی نیکی بدی کی جزا (کیا جزا۔ جانچ۔ جج ایک ہی مادہ سے ہیں؟)

بہر حال جزا کا دن آگیا۔ اور سمندروں کے چشمے اور آسمانوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اور زمین کی سب سانس لینے والی چیزیں مر گئیں۔ ایک سو پچاس دن تک پانی موجیں مارتا رہا۔ حتیٰ کہ ساتویں مہینے کے سترھویں دن کو وہ اراراٹ پر کشتی لگی۔

دسویں مہینے کے پہلے دن نوح نے ایک پہاڑی کوّا اڑایا۔ جو واپس نہیں آیا۔ ایک ہفتہ بعد ایک فاختہ کو روانہ کیا۔ لیکن میدان میں اُسے بیٹھنے کی جگہ نہ ملی۔ اور وہ واپس آئی۔ پھر دوسرے ہفتے میں اُسے چھوڑا تو وہ ایک زیتون کی پتی لے کر واپس آئی۔ تیسرے ہفتے میں پھر نوح نے اُسے چھوڑا۔ لیکن وہ واپس نہ آئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ زمین خشک ہوگئی ہے۔ اور وہ سب اُترے اور پاک جانوروں اور پرندوں کی "جلنے والی قربانی" کی (دیکھئے بابلی افسانہ طوفان۔ کتاب ہذا)

قوس وقزح کا معاہدہ ۲۴۰۰ ق م خدا نے قربانی منظور کی اور وعدہ کیا۔ کہ آئندہ نوعِ انسانی پر ایسا آبی طوفان نہ آئے گا۔ اور ہمیشہ قوس وقزح (دھنک) اس معاہدے کی یادگار بن نکلتی رہے گی۔

حضرت نوحؑ کی نبوت ایک دن حضرت نوحؑ نے انگور کی شراب پی اور بدمست ہو گئے۔ اس حالت میں ننگے لیٹے ہوئے تھے۔ تو حام نے دیکھ کر مذاق اڑایا۔ لیکن سام اور یافث نے منہ پھیر کر کپڑا اُڑھا دیا۔ اور جب اُنہیں اپنے بیٹوں کا حال معلوم ہوا تو نبوت (پیشین گوئی) کے طور پر حام کو بددعا اور یافث و سام کو دعائیں دیں۔ (اسی لئے حبشی نسل کے لوگ اب تک غلامی کی حالت میں ہیں)

شہر بابل کی تعمیر پھر نوحؑ نے وادئ شنار (عراق یا دوآبہ دجلہ و فرات) میں رہنا اختیار کیا۔ اور خدا کے حکم کے خلاف دُنیا میں نہ پھیلے۔ بلکہ وہیں ایک شہر بنانا شروع کیا۔ اور ایک بڑا مینار بھی بنانا چاہا۔ لیکن خدا نے ان کی زبان میں اختلاف پیدا کر دیا۔ کوئی کسی کی بولی نہ سمجھتا تھا۔ مجبوراً وہ مینار بنانا بھول گئے۔ اور دُنیا میں منتشر ہو گئے۔ اسی لئے بابل کے معنی اختلاف یا گڑبڑی کے ہیں۔

نوحؑ کی نسل

(۱) یافث (بڑائی وسعت) کی اولاد بحر اوسط (مڈی ٹرائے نین) ایشیائے کوچک اور یورپ اور ایشیا میں پھیل گئی۔

۲۔ حام (گرمی) کی اولاد جنوب کی طرف افریقہ، جنوبی ایشیا ہند و عرب میں پھیلی۔ بابل سے حبشہ تک کُش کی سلطنت تھی۔ ایک نے مصر دوسرے نے لیبیا اور کنعان نے کنعان میں سکونت اختیار کی۔

(۳) سام کی اولاد وسطی ایشیا میں بڑھی۔ ارم نے سیریا پر قبضہ کیا۔ ایک نے خالدیہ پر اشور نے اسیریا پر۔ ایلام نے فارس۔ یوقطان نے عرب کے ایک حصے پر قبضہ کیا۔

نمرود ۲۲۳۳ ق م

بن کش بن حام نے عراق میں بڑی سلطنت قائم کی۔ بابل۔ ایرخ (واڈ ستہ) عک عاد (فشی لیس) اور کلنہ (تبیبی فول) بڑے شہر تھے۔ سام کی اولاد نے نی نے وہ، سلے ہو بوث، قلہ اور رسن آباد کئے۔

شرک و کفر

لوگوں میں بت پرستی، کواکب پرستی، مردہ بزرگ کی رُوح پرستی، جانور پرستی شروع ہو گئی۔ اور وہ لوگ اسی لئے ظالم اور شہوت پرست ہو گئے۔

بطریق ایوب ۲۲۳۳ ق م

کتاب ایوب میں ابتدائی بت پرستی کا ذکر ہے۔ اس کا مصنّف مشکوک ہے۔ ایوب عرب کا ایک شیخ تھا۔ یہ سرزمین عُزّ (ی) کہلاتی تھی۔ وہ بڑا فیاض تھا۔ اور خود خدا نے اس کی تعریف کی۔ لیکن سخت آزمائشوں میں ڈالے جانے کے بعد خدا نے پھر اسے بیٹے، بیٹیاں مال و جاہ عطا کی۔

بطریقوں یعنی شیخوں کا زمانہ (PATRIARCH)

حضرت ابراہیم ١٩٢١ء ق م

سام کی آٹھویں پشت میں ابرام دوالدِ ملیند) تھے۔ یہ بمقام اُر (خالدیہ) رہتے تھے۔ اُر غالباً موجودہ عرفہ ہے۔ یہاں سے وہ حاران میں مع اپنے والد تیراح کے آ گئے۔ اور پھر خدا کے حکم سے آگے بڑھے۔ اور خدا نے وعدہ کیا کہ "میں تیری قوم کو بڑھاؤں گا۔ اور اُس سے دُنیا والے برکت حاصل کریں گے۔" وہ اپنی بیوی سرئی (سارہ) اور بھتیجے لوط کے ساتھ ٧٥ سال کی عمر میں آگے بڑھے ❊

فلسطین

جب وہ فلسطین میں مقام شیخیم پر پہنچے تو خدا نے کہا کہ یہی موعود سرزمین ہے۔ وہاں قحط پڑا تو آگے بڑھے اور مصر پہنچے۔ خدا نے آزمائش میں ڈالا۔ کیونکہ بغیر امتحان کے خدا کوئی درجہ نہیں دیتا۔ اور اس خوف سے کہ لوگ سارہ کی خوبصورتی سے اس کی طرف رجوع نہ ہوں۔ سارہ سے کہا کہ مجھے اپنا شوہر نہ بتانا بلکہ بھائی کہنا۔ اس پر مصری تو باز آ گئے۔ لیکن سارہ کو فرعون کے پاس لے گئے۔ مگر خدا نے فرعون پر بڑی بلائیں نازل کیں۔ اور جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ سارہ ابرام کی بہن نہیں ہے تو اُسے واپس کر دیا اور ابرام پر ناراضگی کا اظہار کیا ❊

مصر میں کافی دولت، اونٹ، بھیڑ، بکریاں ابرام کے پاس ہو گئیں۔ وہ پھر کنعان واپس آئے۔ لوط ساتھ تھے۔ چرواہوں میں لڑائی ہوئی۔ تو لوط کو اختیار دیا کہ جو پسند کرو لے جاؤ۔ وہ مویشی لے کر اُردن کے جنوب میں میدانی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اس دوران میں اپنے ٣١٨ غلاموں کے ذریعہ سے ایک ایلامی (عراقی) بادشاہ سے مقابلہ کیا اور

اُس کو شکست دی اور لوط کو گرفتاری سے چھڑایا۔ اور تلخ زدک سردار کنعان کو بہت ادب سے خراج (عشر) ادا کیا۔ یہ سردار خدا پرست تھا۔

معاہدے کی قربانی

ابرام کو اولاد نہ ہونے کا افسوس تھا لیکن خدا وعدہ کر چکا تھا کہ تیری اولاد کنعان کی حکمران ہوگی۔ اور سمندر کے ریت کے ذرّوں سے زیادہ ہوگی۔ خدا نے اُسے مایوس دیکھ کر فرمایا کہ میں ایک نظر آنے والی نشانی (آیت) دکھاتا ہوں۔ تاکہ تیرا قلب مطمئن ہو جائے۔ لہٰذا تو:۔

"ایک بچھڑا، ایک بھیڑ کا بچہ، ایک بھیڑی، تین تین سال کے۔ اور ایک فاختہ اور ایک کبوتر کا پٹھا لا۔ اور اُن کے (سوائے پرندوں کے) ٹکڑے کر کے ایک دوسرے پر رکھ۔"

ابرام نے اُنہیں ذبح کیا اور اسی ترتیب سے رکھا اور شام تک ان کی نگہبانی کی اور گوشت خور چڑیوں کو ہانکتا رہا۔ شام کو خوفناک تاریکی میں ایک جلتا ہوا چولہا اور مشعل دکھائی دی۔ جو ان ذبیحوں کے درمیان میں گذر رہی تھی۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔

"تیری اولاد ایک غیر ملک میں چار سو سال مصیبت اٹھائے گی۔ اور پھر موعود سر زمین میں آئے گی۔" یہ دیکھ کر ابرام اطمینان سے فلسطین میں رہنے لگا۔

ولادت اسمٰعیل ۱۹۱۱ ق م

سارہ نے یہ سمجھا کہ میرے کوئی اولاد نہ ہوگی۔ اس لئے ابرام کو مجبور کیا کہ وہ ہاجرہ (ھ) ایک مصری باندی سے نکاح کر لے۔ لہٰذا ہاجرہ کو بیوی بنا لیا۔ اور وہ حاملہ ہوگئی۔ اور غرور میں آکر سارہ پر طعنہ زنی کی۔ سارہ نے اُس پر سختی کی۔ ہاجرہ اپنے وطن کی طرف جنوبی صحرا کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ ایک کوئیں پر ٹھہری۔ وہاں ایک خدا کا فرشتہ ملا۔ جس نے کہا کہ تیرے

بیٹا ہوگا۔ جس کا نام اشمع ایل (جس کی بات خدا سنتا ہے) ہوگا۔ ہاجرہ نے اُس چشمہ کا نام بیرالٰہی روئی (کنوان اللہ کے رویت کا) رکھا۔ اور سارہ کے خیموں میں واپس آگئی جہاں اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ اس وقت ابرام کی عمر ۸۶ سال کی تھی۔

خدا کا ابرام پر دوبارہ ظاہر ہونا

اسماعیلؑ کی عمر ۱۳ سال کی ہوگئی۔ اور ابرام کے کوئی اولاد بیاہتا بی بی سے نہ ہوئی۔ تو خدا پھر اُن پر ظاہر ہوا۔ اور ابرام (والد بلند) کی بجائے ان کا نام ابرہام (والد قوم) رکھ دیا۔ اور اطمینان دلایا کہ اب وقت آگیا ہے۔

ختنے کا عہد

لیکن اس رحمت کے بدلے خدا ابراہام اور اُس کی اولاد سے ہمیشہ کے لئے ختنہ کرانے کا وعدہ لے لیا۔ اور ابراہام اور اسماعیل نے ختنہ کرایا۔

خدا نے سرئی کا نام بدل کر سارہ (شہزادی) رکھا اور بتایا کہ لڑکے کا نام اضحاک (ہنسی) رکھنا۔

سودوم اور غمرہ کی تباہی

ان شہروں میں بداعمالی بڑھ گئی تھی۔ اور دس آدمی بھی نیکو کار نہ تھے۔ خدا نے اس پر آگ برسا کر تباہ کر دیا۔ صرف لوط اور ان کی دو لڑکیاں بچیں۔ لوط کی بیوی آخر وقت پر بھاگی مگر جل کے نمک کا ستون بن گئی۔ پھر لوط کی اولاد سے دو قبیلے موآب اور بن عمّ پیدا ہوئے۔

ولادت اضحاک ۱۸۹۲ سنہ ق م

جرار میں یا بئیر شیبہ میں اضحاک کی ولادت ہوئی۔ اور آٹھویں دن ختنہ کیا گیا۔ اور حسب وعدہ اضحاک (ہنس مکھ) نام رکھا گیا۔ دودھ چھڑانے کے وقت دعوت میں اشمع ایل نے بچے پر طعنہ زنی کی سارہ نے خفا ہو کر اشمع ایل اور اُس کی ماں ہاجرہ کو نکال دینے کا حکم

دیا۔ اور وہ صحرا کی طرف نکال دی گئی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا۔ اور بچہ پیاس سے مرنے لگا تو اُسے صحرائی جھاڑیوں کے نیچے رکھ کر خود ایک تیر کے فاصلے پہ بیٹھ گئی۔ اس مایوسی کی حالت میں ایک فرشتہ ظاہر ہوا۔ اور اُس نے دیکھا کہ ایک چشمہ جاری ہے۔ شکر کیا۔ اور مشک میں پانی لے جا کر بچے کو پلایا۔ اور اشمع ایل فاران کے جنگل میں کوہ سینا کے قریب پروان چڑھا اور تیر اندازی میں کمال حاصل کیا۔ جوان ہونے پر ایک مصری عورت سے شادی کی۔ اور بارہ لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ عرب قبائل کے مورث تھے ۔

دوسرا امتحان۔ اضحاک کی قربانی خدا نے حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو موریاہ کی سرزمین میں، جو بیرشیبہ سے تین دن کے فاصلے پہ ہے۔ لے جاؤ۔ اور اُس کو ذبح کر کے جلانے والی قربانی پیش کرو۔ ابراہام اضحاک کو لے گئے۔ اور ہاتھ پاؤں باندھ کے لٹایا۔ چھری نکالی کہ آسمان سے آواز آئی: "ٹھہرو"۔ ابراہام پھر امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اور دیکھا کہ ایک بھیڑ جھاڑی میں پھنسا ہوا ہے۔ اُسے لا کر قربان کر دیا۔ اور خدا نے پھر یقین دلایا۔ کہ میں تجھے برکت دوں گا اور اپنی حفاظت میں رکھوں گا ۔

سارہ اور ابراہام کی وفات ایک سو ستائیس سال کی عمر میں سارہ کا انتقال ہو گیا۔ اور مکفیلہ کی قبر میں رکھی گئی۔ اس جگہ اب مسجد ہبرون ہے ۔

تین سال بعد ابراہام نے اپنے بھائی ناحور کی پوتی سے اضحاک کی شادی کر دی۔ ناحور حرّان میں رہتا تھا۔ لڑکی کا نام "ربے کا" تھا ۔

پھر ابراہام نے قطورا سے نکاح کیا جس سے چھ بچے ہوئے۔ اور ایک سو

پچھتر سال کی عمر میں وفات پائی (۱۸۹۲ ق م)

اضحاک از ۱۸۹۲ تا ۱۷۶۰ ق م

اُنیس سال بعد اضحاک کے جڑواں (توام) لڑکے پیدا ہوئے۔ عیساؤ (بالدار) اور مضبوط تھا۔ یعقوب (پاؤں چھونے والے یا سازش سے کسی عہدے پر پہنچنے والا) خاموش اور اپنی ماں کا چہیتا تھا۔

اُس زمانے میں بڑے بیٹے کو میراث کا دُگنا حصہ ملا کرتا تھا (جیسا کہ اب بھی ہندوستان میں بعض قوموں میں ہے) ایک دن عیساؤ شکار کھیل کے بعد واپس آیا۔ اور دیکھا کہ یعقوب مسور کی دال کا سالن پکا رہا ہے۔ اُس نے مانگا۔ یعقوب نے اس شرط پر دیا کہ وہ قسم کھا کر اپنا میراثی حق اُسے دے دے۔ عیساؤ اپنے حق سے دست بردار ہو گیا۔

اضحاک بوڑھا ہو گیا تو اُس نے دستور کے مطابق اپنے بڑے بیٹے کو برکت دینے کے لئے بلایا۔ اور کہا کہ شکار کا گوشت مار لاؤ۔ اور مجھے کھلاؤ۔ یہ بات اسحاق کی بیوی نے سن لی۔ اور چونکہ وہ یعقوب کو زیادہ چاہتی تھی۔ اس لئے اس سے کہا کہ دو بھیڑ کے بچے ذبح کرو۔ پھر یعقوب کو عیساؤ کے کپڑے پہنائے۔ اور بھیڑ کے بچوں کی کھالیں اُس کی گردن اور ہاتھوں پر منڈھ دیں۔ اور کہا جاؤ۔ باپ سے برکت اور دعا لے لو۔ اضحاک کو اس کی آواز پر شبہ ہوا۔ اور قریب بلا کر ہاتھ پھیرا تو وہ بالدار تھا۔ اور گوشت منگا کر کھایا پیا۔ اور پھر پوری برکت کی۔ دعا پڑھ دی۔ اتنے میں عیساؤ آ گیا۔ اور دعا چاہی۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ سازشی بھائی نے چالاکی سے دُعا حاصل کر لی تھی۔ عیساؤ نے کہا کہ ایک دعا بھی باقی ہو تو دے دیجئے۔ تو اضحاک نے اُسے یقین دلایا کہ وہ تلوار کے بھروسے زندہ رہے گا۔ اور خوشحال ہو گا۔ اور صرف اس وقت اپنے بھائی کی خدمت کرے گا۔ جب تک کہ وہ حکومت

نہ حاصل کر لے۔

بہرحال عیساؤ کو اتنا غصہ آیا کہ یعقوبؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس کی ماں نے یعقوبؑ کو اس کے ماموں لابان کے پاس بھیج دیا۔

یعقوبؑ کا رؤیا

جب شام ہوئی تو یعقوبؑ ایک پتھر کو سرہانے رکھ کر سو گیا۔ اور خواب میں دیکھا زمین سے آسمان تک ایک سیڑھی کھڑی ہو گئی ہے۔ جس پر فرشتے اُتر چڑھ رہے ہیں۔ اور اوپر سے ایک ندا آئی کہ تو محفوظ رہے گا۔ اور جلا وطنی سے وطن واپس آئے گا۔" یعقوبؑ ڈر کے اٹھ بیٹھا۔ اور اس پتھر پر تیل ڈالا کہ یادگار رہے۔ اور اس جگہ کا نام بیت ایل (بیت اللہ) رکھا اور عہد کیا کہ وطن واپسی ہوئی تو اُس جگہ بیت ایل بنائے گا۔ اور اپنی دولت کا دسواں حصہ خدا کو دے گا۔

یعقوبؑ کی غلامی

جب وہ پدم آرم پہنچا تو راحیل کو دیکھا۔ وہ اس کے ماموں لابان کی بیٹی تھی۔ لابان نے اُسے اپنے مویشی چرانے پر رکھ لیا۔ اور یہ شرط ہوئی کہ سات سال بعد وہ اپنی بیٹی اُسے بیاہ دے گا۔ سات سال بعد لابان نے اپنی بڑی بیٹی لیاہ کو رات کی تاریکی میں یعقوبؑ سے بیاہ دیا۔ صبح کو یہ راز کھلا تو لابان نے کہا بڑی بیٹی کی موجودگی میں چھوٹی کیسے بیاہی جا سکتی ہے۔ اب اگر تو راحیل کو چاہتا ہے۔ تو سات سال پھر خدمت کر۔ آخر راحیل اسے ملی۔ اور اس سے یوسفؑ پیدا ہوا پہلی بیوی اور دو لونڈیوں سے دس لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

یعقوبؑ کی فرشتے سے کُشتی

یوسفؑ کے پیدا ہونے پر چھ سال تک یعقوبؑ نے پدم آرم میں قیام کیا۔ لیکن لابان نے

حسب وعدہ اپنے گلوں میں سے اُسے حصہ نہ دیا۔ اس لئے ایک دن یعقوب نے اپنا مال متاع، جورو بچے جمع کئے۔ اور فرات پار اُتر گیا۔ تیسرے دن لابان آپہنچا۔ لیکن سختی نہیں کی۔ کیونکہ خدا نے خواب میں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس پر چند بتوں کی چوری کا الزام لگایا۔ جو راحیل نے محل میں چھپا دئے تھے۔ (یعنی وہ بت پرست تھا) بہرحال معاملہ سلجھ کر چراگاہیں آپس میں تقسیم ہوگئیں۔ اور یعقوبؑ آگے روانہ ہو گیا۔

لیکن عیساؤ کے ڈر سے وہ رُکا اور پہلے ایلچی بھیجے، عیساؤ چار سو غلام لے کر بڑھا اور یعقوب رات بھر خدا سے دعا کرتا رہا۔ اور اپنا مال اور کنبہ دریا پار بھیج دیا۔ صبح تک ایک ایسی ذات سے کشتی لڑا کیا جس نے اپنا نام نہ بتایا۔ (ہوشیا ۱۲: ۳، ۴ فرشتہ) لیکن اس نے یعقوب کی جانگھ کو چھوا تو گھٹنا اُتر گیا۔ اور یعقوب کا نام بدل کر اسرائیل کر دیا۔ یعنی شہزادۂ خدا۔

صبح کو عیساؤ پہنچ گیا۔ اور یعقوب اُس کی طرف بڑھا اور سات مرتبہ زمین تک جھک کر سلام کیا۔ عیساؤ نے اُسے گلے لگا لیا۔ اور فلسطین کو چھوڑ کر سیر کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اور یعقوب شخیم کے قریب رہنے لگا۔ اور ابراہیم کی طرح ایک قربان گاہ بنائی۔

یعقوبؑ کی بیٹی کی آبروریزی

یعقوبؑ کی ایک ہی بیٹی دینا نامی تھی۔ یہ لیاہ کے بطن سے تھی۔

ایک دن وہ جبکہ ۱۳ سے ۱۵ تک کی عمر تھی پڑوس کے علاقے کی عورتوں سے ملنے نکلی۔ شخیم حتّی نے اُسے بے آبرو کر دیا۔ شخیم کے باپ حامور نے کہا کہ لڑکی کے ماں باپ کو کچھ مال جرمانے کے طور پر دے دیا جائے۔ اور اُس لڑکی سے شخیم شادی کر لے۔ اور اس کے بعد دونوں قبیلوں میں عام طور پر شادی بیاہ ہونے لگے۔ دینا کے بھائی راضی ہو گئے۔

اور بولے تم سب کو ختنہ کرانا ہوگا۔ اسے شخیم والوں نے منظور کر لیا۔ ان کا ختنہ ہوا۔ اور جب وہ اس حال میں پڑے تھے۔ اس ختنے کے تیسرے دن بنو اسرائیل نے حملہ کر کے اُن سب کو قتل کر دیا۔ اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا (تکوین ۳۴)

حتیوں کے ڈر سے یعقوب بیتیل چلا گیا۔ اور وہاں ایک قربانگاہ بنائی۔ اور وہاں سے بیت لحم چلا گیا۔ یہاں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا راحیل کے بطن سے پیدا ہوا۔ ماں اس ولادت کی وجہ سے مر گئی۔ اور اُسے وہ بن اونی (درد کا بیٹا) کہتی تھی۔ لیکن یعقوب نے اس کا نام بن یمیں (داہنے ہاتھ کا بیٹا) رکھا۔

یوسفؑ کے خواب ۱۷۱۶ ق م

یوسفؑ سے یعقوبؑ کو بہت محبت تھی۔ اسی لئے یعقوبؑ نے اُسے رنگین عبا دی تھی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یوسفؑ ہی کو بڑے بیٹے کا حق، یعنی جانشینی اور دگنی میراث ملے گی۔ دوسرے بھائی اُس سے جلنے لگے۔ پھر اُس نے دو خواب دیکھے۔ اور اُنہیں سُنا دیئے۔

(۱) ایک میں دیکھا کہ کھیت میں سب پولے باندھ رہے ہیں۔ اور اُس کا پولا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اُن کے پُولوں نے اُس پولے کو سجدہ کیا۔

(۲) دوسرے خواب میں دیکھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے اُس کے سامنے جُھک رہے ہیں۔

جب یعقوبؑ نے یہ خواب سُنے۔ تو اُس نے یوسفؑ کو اس خودستائی پر تنبیہ کی۔

یوسفؑ کا غلامی میں بیچا جانا

ایک دن یوسفؑ اپنے بھائیوں کو دیکھنے کے لئے چراگاہ کی طرف گیا۔ وہاں ان لوگوں نے اُسے قتل کر دینا چاہا۔ لیکن رُوبن نے منع کیا۔ تو اس کی عبا اُتار کر اُسے ایک خالی گڑھے میں ڈال دیا۔ اور کھانا

کھانے لگے۔ اس درمیان میں اسماعیلی عربوں کا ایک قافلہ تیل اور مصالحوں کو لئے ہوئے پہنچا۔ یہوداہ کی تجویز پر بیس روپے میں اُسے بیچ ڈالا۔ پھر ایک بھیڑ کے بچہ کے خون سے اُس کی عبا کو رنگین کیا اور باپ سے آکر کہا کہ اُسے جنگلی جانور لے گئے۔ یعقوب نے بوریے کا لباس پہن لیا اور کئی روز تک ماتم کیا۔

پوتی فر کا محل

مصر پہنچ کر فرعون مصر کے جلادوں کے افسر پوتی فر نامی کے ہاتھ اُسے بیچ ڈالا۔ اُس کی بیوی نے پہلے تو یوسفؑ سے زنا کرانی چاہی۔ جب اُس نے انکار کیا تو کہا یہ مجھے بے آبرو کرنا چاہتا تھا۔ پوتی فر نے اُس کو بندی خانے میں ڈال دیا۔ یہاں فرعون کا سردار ساقی اور میر خانساماں قید ہو کر آئے۔ اور دونوں نے خواب دیکھے۔ ایک کو یوسفؑ نے یہ تعبیر دی کہ تین دن میں تو اپنے عہدے پر واپس ہو جائے گا۔ اور دوسرے کو پھانسی ہو گی۔ میر خانساماں جب اپنے عہدے پر واپس گیا۔ تو وہ اپنا یوسفؑ سے وعدہ بھول گیا۔ (تکوین ۴۰)

فرعون کے خواب

یوسفؑ دو سال قید میں رہا۔ اتفاق سے فرعون نے دو عجیب خواب دیکھے۔

(۱) ایک میں دیکھا کہ میں دریائے نیل کے کنارے کھڑا ہوں۔ اُس میں سے سات موٹی گائیں نکلیں اور اس کے بعد سات دبلی گائیں نکلیں اور انہوں نے موٹی گایوں کو کھا لیا۔ لیکن کھانے کے بعد بھی اتنی ہی دُبلی رہیں۔

(۲) پھر یہ خواب دیکھا کہ ایک تنے پر سات بالیں تر و تازہ موجود ہیں۔ ان کے بعد سات بالیں خشک اور سوکھی ہوئی نکلیں اور پہلی بالوں کو کھا گئیں۔

جب ان خوابوں کی تعبیر کوئی نہ بتا سکا۔ تو خانساماں کو یوسفؑ یاد آیا۔ وہ قید خانے

سے بلایا گیا۔ اور اس نے خواب کی تعبیر دی کہ سات سال فصل اچھی ہوگی۔ اس کے بعد سات سال قحط رہے گا۔ لہذا پہلے سالوں میں غلہ جمع کر لیا جائے۔ تو بہتر ہے۔

۱۷۲۰ق م میں یوسفؑ وزیر بن گئے تعبیر کی بدولت فرعون نے یوسفؑ کو وزیر بنا لیا۔ اس نے یوسفؑ کا نام بدل کر زفنتھ پانیہ (رازوں کا بتانے والا) رکھ لیا۔ اور ایک پوتی فرع (سردار) کی بیٹی سینت کو بیاہ دیا۔ اس زمانے میں یوسفؑ کے دو لڑکے ہوئے منسّہ (بھلانے والا) اور افرائیم (پھل دار)

برادران یوسفؑ مصر میں۔ پھر والد کو لانا فرعون کی اجازت سے

یعقوبؑ کی وفات یعقوبؑ نے مصر میں ۱۴۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور خاندان کا شیخ یہوداہ کو بنایا۔ اور روبن کو نہیں بنایا جو پہلوٹا لڑکا تھا۔ یعقوب کی لاش ممی بنائی گئی۔ اور کنعان میں ابراہیمؑ کی قبر میں رکھ دی گئی۔

یوسفؑ کی وفات مصر واپس آکر یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو فرعون کے مویشی چرانے پر حسب دستور رکھ دیا۔ وہ گوشن میں مقیم رہے۔ اور یوسفؑ نے ۱۱۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بھائیوں نے وعدہ کیا کہ اس کی ہڈیاں کنعان لے جائیں گے۔

تکوین ۴۴ سے خروج ۱ تک ۱۷۰۶ق م سے ۱۴۹۱ق م تک ۲۱۵ سال

تک بنو اسرائیل مصر میں رہے۔ پہلے وہ چرواہے تھے۔ پھر شہری بن گئے۔ اور مختلف فنون سیکھ لئے۔ مصر ہی میں انہوں نے باغبانی، مصنوعی آب پاشی (جو مصر کی ایک خصوصیت تھی) نجاری، کمہار کا کام اور سب سے اہم چیز یعنی لکھنا سیکھا۔

انہوں نے بعض مذہبی باتیں بھی سیکھیں۔

(۱) را یعنی سورج کو دیوتا مانا جاتا تھا۔ اور

(۲) مم بھس (گوسالہ) کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ اور آسمان و زمین و سمندر کی تقریباً ہر شے کی عزت یا پرستش کرتے تھے۔ جوشیا ۲۴۔ جزیکل ۲۰)

نیا فرعون نئے فرعون نے یہودیوں پر ظلم شروع کیا۔ پھر موسیٰؑ کشتی میں بنت فرعون کو ملا۔ اُس کا مصری نام پانی سے بچایا ہوا رکھا گیا۔ بڑا ہوا تو اس نے ایک مصری کو قتل کر دیا۔ لیکن خود یہودی مخبر بن گئے۔ وہ فرار ہو کر سینا کی پہاڑیوں میں آ گیا۔ وہاں چرواہا ہو گیا۔ صفورہ سے شادی کی۔

جلتی جھاڑی میں خدا دکھائی دیا۔ جوتا اتارنے کو کہا۔ اُس نے کہا کہ تو جا کے یہودیوں کو آزاد کر۔ موسیٰؑ نے کہا۔ کس کے نام سے جاؤں۔ خدا نے کہا میرے نام سے (میں ہوں۔ یہوواہ کی طرف سے جاؤ۔ پھر موسیٰؑ نے کہا اس کا کیا ثبوت (نشان۔ برہان) میری قوم کے لئے ہوگا۔ کہ مجھے تو نے بھیجا ہے۔ تب خدا نے تین آیات دیں۔

(۱) اپنی لاٹھی زمین پر گرا دینا وہ عصا سانپ بن جائے گا۔ اور دم سے اُٹھاؤ گے تو لکڑی ہو جائے گا۔

(۲) اپنا ہاتھ سینے پر ملو۔ وہ سفید ہو جائے گا۔ پھر سینے پر رکھو وہ درست ہو جائیگا۔

(۳) نیل کا پانی لے کر زمین پر ڈالو۔ وہ سُرخ ہو جائے گا۔

تمہاری زبان لکنت کرتی ہے۔ ہارون تمہیں ملے گا وہ ساتھ دے گا۔

موسیٰؑ و ہارونؑ فرعون کے سامنے گئے اسرائیلیوں نے نشان دیکھے تو انہوں نے سجدہ کیا۔ پھر وہ دونوں فرعون کے پاس گئے۔ کہ میری قوم کو آزاد کر دو۔ فرعون ہنسا اور اسرائیلیوں پر عذاب بڑھا دیا۔

اور اسرائیلی بھی ان دونوں سے خفا ہو گئے ۔

وبائیں دوبارہ فرعون نے اُن کے بیان کے ثبوت میں نشان مانگا تو انہوں نے سانپ کا نشان دکھایا ۔ بلکہ اُس کے جادوگروں کے سانپوں کو وہ سانپ کھا گیا ۔ تو وہ اور سخت دل ہو گیا ۔ پھر یہ عذاب آئے ۔

(۱) پانی خون ہو گیا (۲) مینڈک (۳) جوں اور کھٹمل (۴) مکھیاں (۵) پھوڑے (۶) اولے (۷) ٹڈیاں (۸) تاریکی ۔

عید گزران اب پہلا عبرانی مہینہ ابیب دسنبر بالوں کا مہینہ (نیسان) آگیا اس کی دس تاریخ کو (عید فسح ؟) عید گزراں کے لئے ہر خاندان ایک جوان بھیڑ لاتا ۔ ۱۴ تاریخ تک اُسے کھلاتے پلاتے ۔ ۱۴ کو شام سے پہلے ذبح کرتے ۔ اور اُس کا خون دروازے پر چھڑک دیتے ۔ اور جلدی میں کمر باندھ کر اسے کھاتے ۔ ہڈی نہ توڑتے اور خمیری روٹی سے نہ کھاتے ۔ اور جب خدا خون کو بنو اسرائیل کے دروازوں پر دیکھے گا ۔ تو وہ گزر جائے گا ۔ اور صرف مصریوں کے پہلوٹھے آدمیوں اور مویشیوں کو مار ڈالے گا ۔

دسواں حملہ خدا کا جب اسرائیلیوں نے ایسا کیا تو خدا کا فرشتہ رام کیس میں گزرا اور پہلوٹوں کو مار ڈالا ۔ اب تو فرعون بھی نکل پڑا ۔ اور سب نے خوشامد کر کے اور زیورات اور کپڑے دے کے اسرائیلیوں کو رخصت کرنے کی ٹھان لی اور خوشامد کر کے نکالا ۔ علاوہ عورت بچوں کے وہ چھ لاکھ مسلح اسرائیلی تھے ۔ جو آزاد ہوئے ۔ (سنہ ۱۴۹۱ ق م)

بحر احمر کی فتح مصریوں نے پیچھا کر لیا تو موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی سمندر پر رکھ دی ۔ وہ پھٹ گیا ۔ اسرائیلی گزر گئے ۔ اور مصری ڈوب گئے ۔ خدا خود رستہ

دکھاتا ہے۔ صبح کو بادل اور رات کو آگ کا ستون بن کر۔

احکام عشرہ راستے میں عمالقہ (اولاد عیساؤ) کو شکست دینے کے بعد موسیٰ کے خسر اور بیوی صفورا اور دونوں لڑکے آملے۔ خسر نے کہا کہ آدمی زیادہ ہیں ان کے یہاں انصاف قائم رکھنے کے لئے قاضی مقرر کردیجئے۔ اس لئے موسیٰؑ نے حکم دیا کہ سینا کے نیچے سب جمع ہوں (تین دن پاک صاف ہونے کے بعد) پھر خدا کڑک اور شور کے ساتھ آیا اور احکام عشرہ سنائے۔ مگر وہ ڈر گئے اور کہا خدا سے کہو کہ للّٰہ اب ہمارے قریب نہ آئے۔ ہم کچھ نہ سمجھ سکے تم جا کر احکام لے آؤ۔ موسیٰؑ پہاڑ پر گئے۔ چالیس دن میں خدا سے احکام لکھوائے واپس آئے۔ تو ہاروں نے مجبور ہو کر انہیں بچھڑا سونے کا بنا دیا تھا جس کی وہ پرستش کر رہے تھے۔ موسیٰؑ نے الواح پھینک دیں۔ غصہ کیا۔ بچھڑے کو جلا دیا۔ اور جھیل میں پھینک دیا۔ اور اس کا پانی پینے پر سب گنہگاروں کو مجبور کیا۔

پھر انہیں قتل کرنے کا حکم دیا۔ لاوی کی اولاد نے ۳ ہزار کو کاٹ ڈالا۔ پھر موسیٰؑ پہاڑ پر گئے۔ اور پھر قانون لائے۔ اور اپنے غیر مرئی بادشاہ یعنی خدا کی کیسے عبادت کی جائے؟ اس کا بھی ڈھنگ سیکھ آئے۔

اٹھلو مکان (چھولداری) TABERNACLE اس کے ایک درجہ میں مقدس ہوتا تھا (تاریک۔ خدا خانہ)

ایک اور درجہ مقدس میں صندوق اس میں پتھر کی دو سلوں پر احکام عشرہ ہوتے تھے۔

پجاری یا ربی حضرت موسیٰؑ سے پہلے ہر خاندان کا بزرگ یا شیخ اس کا پجاری بھی ہوتا تھا۔ لیکن مصر سے خروج کے بعد لیوی کے خاندان کے لوگ خدام چھولداری اور ہارون کی اولاد پجاری ہونے لگی۔

ہارون کی اولاد پجاری کہلاتی تھی، اور جب وہ پجاری بنائی جاتی تھی۔ تو عام لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے بعض خرافات اس میں انجام دی جاتی تھیں۔ پجاری کو ایک لمبی چپکی ہوئی عبا پہنائی جاتی تھی۔ جو کہیں سے سلی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ سراسر ایک ہی میں بنی ہوئی ہوتی تھی۔ لٹوری دار صافہ سر پر، اور نیلے، نارنجی اور قرمزی تاگوں سے سوزنکاری کیا ہؤا پٹکا کمر میں باندھا جاتا تھا۔

ان کا کام یہ تھا کہ قربان گاہ سوزان پر ہمیشہ آگ جلتی رکھیں۔ سنہرے لیمپ میں تیل ڈالیں۔ صبح اور شام کی قربانی کریں۔ ساتویں دن کی روٹی تیار کریں۔ قرنا بجا کر تہواروں کا اعلان کریں۔ کوڑھیوں کو دیکھ کر بتائیں۔ کہ وہ پاک ہیں یا نہیں قانون شرع (تورات) کی تفسیریں کریں۔ اور لوگوں کو سمجھائیں۔

یورم (روشنی یا الہام) اور تمیم

سردار پجاری کے چار آئینے کے اندر دو لامعلوم نوعیت کی چیزیں رہتی تھیں۔ یورم کا مادّہ رأی (دیکھنا) ہے۔ اس سے اور تمیمّ (بمعنی کمال) سے کاہنوں کا سردار غیب کی باتیں، اور خدائی الہامات حاصل کرتا تھا۔

اسرائیلی تہوار

(۱) عید فسح: مصریوں پر بلا نازل ہوتے اور اسرائیلیوں کے بچ جانے کا دن یعنی عید گذران (۱۴ تا ۲۱ نیسان)

(۲) عید خمسین: ۱۶ نیسان کے سات ہفتے یا پچاس دن بعد جبکہ فصل تیار ہوتی تھی نئے غلّے کی دو خمیری روٹیاں، اور دو بھیڑ کے بچے خدا کیلئے قربان کئے جاتے تھے۔ بعد میں طور سینا پر قانون (تورات) دئے جانے کے دن خمسین منائی جانے لگی۔

(۳) عید شامیانہ: خزاں میں بماہ تشرین (ماہ ہفتم) سات دن منائی جاتی تھی۔

یہ سب تہواروں سے زیادہ خوشی کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ پھل جمع کرنے کا موسم ہوتا تھا۔ اور جب اسرائیلی خیموں میں تھے۔ اُس کی یادگار تھا۔ اسی لئے وہ اس زمانے میں خیموں میں رہ کر یہ تہوار مناتے تھے (رجب ماہ حرام شاید اسی لئے ہے)

موسیٰ و ہارون کا قصور

کہ وہ یہوداہ کو اسرائیلیوں کی نظروں میں نہ بلند کر سکے۔ اسی لئے وہ جو موجودہ پشت کے ہیں موعود زمین میں داخل نہ کئے جائیں۔ ۳۸ سال بعد گردش صحرا (۱۴۹۰ - ۱۴۵۳) وہ داخل کئے جائیں گے۔

وفات ہارون ۱۴۵۳ء ق م

۱۲۳ سال کی عمر میں اس قصور میں موت دی گئی۔ کہ اسرائیلی گذشتہ موقع پر پانی مانگتے تھے۔ اور سب قصور ان بھائیوں کا بتلاتے تھے۔

بلعام بن باعور

اب اسرائیلیوں کی نئی نسل نے فتح شروع کی۔ موآبیوں کے بادشاہ بلک نے ایک مشہور عراقی پیغمبر کو بلوایا کہ اسرائیلیوں کو بددعا دے۔ لیکن اُس نے کہا کہ میں وہی کہتا ہوں۔ جو مجھ سے کہلوایا جاتا ہے (گنتی ۲۴) اور اُس نے اسرائیلیوں کو خدا کے حکم سے دعا دی۔ لیکن اسرائیلیوں کو دھوکے سے بلا کر عیاشی کروا دی۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ نے انہیں قتل کرا دیا۔ اور خدا نے باقی اسرائیلیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ انہوں نے موآبیوں کو فتح کر لیا۔ اور بلعام بھی مارا گیا۔ ان کے ۵ سردار قتل کئے گئے۔ اُن کے لڑکے بچے غلام بنا لئے گئے۔ شہر جلا دئے گئے۔ (گنتی ۲۵)

وفات موسیٰ

پھر موسیٰ نے یوشع کو اپنا جانشین بنایا۔ اور پہاڑ پر جا کے سرزمین موعود کو دیکھا۔ اور ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی وادی میں دفن کئے گئے۔ اور لوگوں کو قبر کا نشان معلوم نہیں۔

یوشع بن نون ۱۴۵۱ ق م

تیس دن کے ماتم کے بعد اُردن کو عبور کیا اور اُس کے مغربی کنارے پر قابض ہو گیا۔ اور منّا دمن ہو بند ہو گیا۔ گویا ان کی صحرا نوردی ختم ہو گئی۔ اور غلے کی فطیری روٹی پہ عید فسح منائی گئی۔ اور قبائل پر زمین تقسیم کرنے کے بعد ۱۴۲۶ء میں یوشع نے وفات پائی۔ وفات پانے سے پہلے "معاہدے کی کتاب" احکام عشرہ کو ایک لاٹھ پہ کھود دیا۔

قاضیوں کا زمانہ ۱۴۰۶ - ۱۱۶۱ ق م

اس زمانے میں بہت کچھ فساد۔ بُت پرستی۔ بعل پرستی وغیرہ بنی اسی زمانے میں روث اور لنخومی کا قصہ بھی درج ہے۔

سموئیل سے داؤد کی تخت نشینی تک ۱۱۲۰ء۔ ۱۱۶۱ء ق م

مقدس صندوق کو فلسطینی چھین لے گئے۔ اور داعون کے بتخانے میں رکھا۔ بمقام اشداو۔ پھر سموئیل کو خدا نے نبی مان لیا۔ اُس نے بُت پرستی کی مخالفت کی۔ اور یہوداہ کی عبادت شروع کرائی۔ اور فلسطینیوں کو سخت شکست دی۔

سموئیل نے نبیوں کا مدرسہ قائم کیا

اُستاد نبی کو وہ لڑکے باپ کہتے تھے اور خود بیٹے کہلاتے تھے۔ ۱۱۲۰ء ق۔م ادبی شرع موسیٰ کا مطالعہ کرتے۔ مناجاتیں تصنیف کرتے اور موسیقی مقدس کے ماہر بنتے۔ قدیم تاریخ لکھتے اور پرانی تاریخ سے نتیجے نکال کر نبوت کرتے۔

دنیاوی بادشاہ کی خواہش ۱۱۲ء تا ۱۰۹۵ء ق م

اسرائیلیوں کا اب تک خدا بادشاہ تھا

اب انہوں نے دنیاوی بادشاہ بنانا چاہا۔ سموایل نے اس کی برائی کی۔ مگر نہ مانے ساول اپنے باپ کے گدھے ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ نہ ملے تو سموئیل کی رائے پوچھنے آیا۔ تو خدائی آواز آئی۔ کہ یہی بادشاہ بنایا جائے۔ تو اس نے ساول (طالوت) کے سر پہ تیل لگایا۔ کہ تو بادشاہ ہوگا۔ پھر قرعہ ڈالا گیا تو اُسی کا نام نکلا۔ لیکن وہ اسباب میں چھپ گیا۔ تلاش پر ملا۔ اور سب چلا اُٹھے۔ ملک زندہ باد اور ساول نے قانون کو لکھوا کر محفوظ کر دیا۔

داؤد سنہ ۱۰۸۷ ق م

سموئیل ایک تیل کا سینگ لے کر بیت لحم گیا۔ اور ایک بچھڑا بھی قربانی کے لئے لے گیا۔ وہاں ایک شخص کے آٹھ بیٹے تھے۔ سب کو بلایا۔ داؤد نہ آیا وہ بھیڑ چرا رہا تھا۔ وہ آیا تو خدائی آواز نے کہا اُٹھ۔ اس کے تیل لگا۔ یہی بادشاہ ہے۔"

داؤد کو رباب بجانا آتا تھا۔ ساول (طالوت) نے اُسے بلوا لیا کہ اُس کا دماغ بری روح خراب کر رہی تھی۔ باجا سن کر غم غلط کیا۔ اور جب ساول (طالوت) اچھا ہو گیا۔ تو واپس آکر بھیڑ چرانے لگا۔

داؤد و جالوت سنہ ۱۰۶۳ ق م

پھر فلسطینیوں نے ساول پر حملہ کیا۔ اور جالوت ایک بڑا پہلوان لڑنے آیا۔ داؤد نے اُسے ساول کے حکم سے گوپھن سے مارا اور اُسی کی تلوار سے سر کاٹ لیا۔ اس نے داؤد سے اپنی بیٹی بیاہ دی اور ساول کا مستقل ملازم ہو گیا۔ لیکن ساول اُس سے کینہ رکھنے لگا۔ اور داؤد فرار ہو گیا۔ اور دو دفعہ موقع ملنے پر بھی ساول کو قتل نہیں کیا۔ آخر کار ساول کو سنہ ۱۰۵۶ ق م میں فلسطینیوں نے لڑائی میں قتل کر دیا۔

داؤد کی تخت نشینی سنہ ۱۰۵۶ ق م

پھر ساول کے بیٹے کو شکست دی گئی اور داؤد

کل قوم کا بادشاہ ہوگیا۔ اور یروشلم کا مضبوط قلعہ فتح کرلیا۔ اور مقدس صندوق (ارک) وہاں لے جایا گیا۔ پھر سلمونیوں وغیرہ کو شکست دی ॰

شاہ داؤد کا گناہ بات شیبہ زوجہ اوریاہ (حتی) پر بری نظر ڈالی۔ اور اوریاہ کو ایسی لڑائی میں بھجوادیا کہ وہ قتل ہوجائے۔ آخر وہ قتل ہوگیا۔ اور بیت شیبہ اُس کی بیوی بن گئی ॰

خدا نے ناتان نبی کو داؤد کے پاس بھیجا اور اُس نے مال دار آدمی اور غریب آدمی کی بھیڑوں کی تمثیل سنائی۔ اور اوریاہ کی بیوی کے بچے کو خدا نے مار ڈالا۔ پھر اُس کے دوسرا لڑکا ہوا ॰

سلیمانؑ ۱۰۳۷ قم اس کا نام ناتان نبی نے جدیدیہ (محب اللہ) رکھا۔ لیکن داؤدؑ نے سولومن (سلامتی والا) رکھا ॰

داؤدؑ کے مصائب تامار بنت داؤد کے ساتھ اُس کے سوتیلے بھائی عمنان نے بدکاری کی۔ جسے دو سال بعد ابسلام برادر حقیقی تامار نے قتل کردیا۔ اور داؤدؑ سے بغاوت کرکے شہر پر قبضہ کرلیا۔ اور پھر قتل ہوا۔ داؤدؑ واپس آگیا۔ اور سب کو معاف کردیا۔ اور ابسلام کے قتل پر بہت رنج کیا ॰

مردم شماری ۱۰۲۲ قم اسرائیل میں آٹھ لاکھ / یہوداہ میں پانچ لاکھ } سپاہی تھے ॰

پھر اُس نے مقدس بنایا ॰

سلیمانؑ کی تخت نشینی ۱۰۱۵ قم سلیمانؑ نے بہت سی قربانیاں کیں۔ تو خواب میں خدا نظر آیا۔ اور کہا مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس نے صرف قلب سلیم کی دعا کی۔ تاکہ وہ اپنی رعایا پر حکومت کرسکے ॰

سلیمان کا انصاف لڑکا چرانے والی ماں کا قصہ آپ ہی کا بیان کیا ہوا ہے۔
۳۰۰۰ امثال آپ سے منسوب ہیں ۔

اور لبنان سے لکڑی منگوا کر ایک شاندار مندر (مقدس بنوایا، فلسطین ایک تجارتی ملک ہو گیا ۔

سلیمان کے قصور لیکن سلیمان نے ہر ملک کی بیویاں اور لونڈیاں رکھ لی تھیں جنہوں نے اپنے اپنے ملک کے بتوں کی پرستش شروع کر دی۔ بعل۔ اشتروث، مُلخ ۔ خموش کی پوجا ہوتی تھی ۔

زوال سلطنت پہلے حداد نے جو داؤد کے زمانے میں بچ رہا ۔ حملہ شروع کیا۔ اور چونکہ اس نے (سلیمان نے) بُت پرستی شروع کرا دی تھی۔ اس کی سزا ملی۔ لوگوں پر ٹیکس بڑھا دیا تھا۔ اور آخر کار سلطنت تباہ ہو گئی ۔

سلیمان کی وفات ۹۷۵ھ ق م کے بعد رہبو آم بادشاہ ہوا۔ اور آپس میں یہودی اور اسرائیلی لڑتے رہے ۹۷۵ھ سے ۹۱۸ تک
سلیمان کے بیٹے نے گوسالہ پرستی و بُت پرستی (مصری) شروع کر دی تھی ۔

دور اتحاد یہودیان و اسرائیلیان ۹۱۸ سے ۸۸۴ ق م تک اور شامیوں سے لڑائی

اسرائیل کی سلطنت میں جیزبیل نے اپنے شوہر اخاب پر اقتدار حاصل کر لیا۔ اور بعل کی پرستش شروع کرا دی۔ ۴۵۰ بعل کے نبی اور ۴۰۰ اشتر کے نبی کی پرورش ہوتی تھی۔ اور یہوواہ کے نبیوں پر اتنی سختی تھی کہ وہ غاروں میں چھپ گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بڑا نبی الیاس (ELIJAH) اُردن پار سے آیا۔ اور پیشین گوئی کی کہ ۳½ سال نہ

بارش ہوگی نہ شبنم گرے گی۔ (لوقا ۴ : ۲۵) پھر وہ خریط کے چشمہ کی طرف بھاگ گیا۔

یہوواہ نے ثابت کر دیا کہ وہ ہی خدا ہے

ایک دن الیاس عبادیہ سے ملا۔ اور اُس سے کہا کہ جا کر اخاب کو بلا لاؤ۔ وہ آیا تو الیاس نے اُس کی بُت پرستی پر ملامت کی اور کہا دو بیل لاؤ۔ اور بعل اور اشتر کے نبی بلائے گئے۔ الیاس نے کہا کہ ایک بیل کی قربانی کرو۔ اور آگ نہ جلاؤ۔ اور اپنے دیوتاؤں کو پکارو کہ آگ سے جلا دے۔ وہ دن بھر گلا پھاڑتے رہے۔ کچھ نتیجہ نہ ہوا۔ شام کی قربانی کا وقت آ گیا تو الیاس نے دوسرے بیل کی قربانی کی قربانگاہ کے چاروں طرف پانی بھروا دیا۔ اور یہوواہ سے دعا کی۔ یہوداہ کی آگ اُتری اور قربانی بھن گئی۔ حتیٰ کہ پانی بھی خشک ہو گیا۔ اور یہوداہ نے ثابت کر دیا کہ وہ ہی اصلی خدا (یا دیوتا) ہے۔ اور الیاس کے حکم سے بعل کے ۸۵۰ نبی قتل کر دئے گئے۔ اور لوگ پکار اُٹھے۔ لا الہ الا یہوواہ پھر الیاس کی دعا سے سمندر سے بادل اُٹھا۔ اور خوب پانی برسا۔

الیاس کا آسمان پر اُٹھایا جانا

اور بہت سے کارناموں کے بعد الیاس کو خدا کا پیغام ملا کہ تیرا وقت آ گیا ہے۔ وہ الیشع کے ساتھ بیتل گیا۔ اور وہاں سے یریحو گیا۔ نبیوں کے مدرسوں سے گروہ گروہ نبی آئے اور کہنے لگے کہ تجھ پر کوئی حادثہ آنے والا ہے۔ پچاس نبی پہاڑ پر چڑھ کر دیکھنے لگے کہ کیا ہونے والا ہے۔

اردن پر پہنچ کر الیاس نے دریا کو اپنی عبا سے مارا۔ وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور الیاس اور الیشع خشک زمین سے گزر گئے۔ پھر الیشع سے پوچھا کیا چاہتا ہے۔ اُس نے کہا کہ مجھے رُوح کا دُہرا حصہ دیا جائے۔ الیاس نے کہا اچھا ایسا ہی ہوگا۔ بشرطیکہ تو مجھے جاتے وقت غور سے دیکھتا رہے۔

اتنے میں ایک آگ کا چھکڑا جس میں آتشین گھوڑے جتے ہوئے تھے نمودار ہوا اور الیاس کو آسمان پہ لے اُڑا۔ ال یشع چلاتا رہ گیا۔ اور صرف عبا لے کر واپس آگیا۔

الیشع کے معجزے

(۱) خراب جھیل کو میٹھا کر دیا (۲) ایک عورت کے ایک سینگ تیل کو اتنا بڑھایا کہ منکوں ہو گیا۔ اور اُس نے اپنا قرضہ ادا کر دیا ورنہ اُس کے بچے غلامی میں فروخت ہو جاتے۔ (۳) ایک لڑکے کو زندہ کیا۔ (۴) گندی غذا کو خوشگوار بنا دیا (۵) بیس جو کی روٹیوں اور کچھ بھنے ہوئے بھٹوں سے سو آدمیوں کا پیٹ بھر دیا۔ (۶) میری خو میں ایک کلہاڑی دریا میں گر گئی۔ اس نے لکڑی ڈالی۔ وہ کلہاڑی بن گئی (۷) نعمان شامی کو برص سے اچھا کر دیا۔ (۸) اپنے نوکر جہازی کو مبروص کر دیا۔ اس لئے کہ اُس نے چھپا کر نعمان سے انعام لیا۔ (۹) ایک فوج کو بھگا دیا اور پیسے سے اچھا آٹا اور پیسے کے دو سیر جو بکوا دئے۔

اسرائیل اور یہودا میں پھر جنگ شروع ہوگئی اور دونوں سلطنتوں کا زوال ہو گیا

۸۸۴ق م سے ۵۸۶ق م تک

یونس علیہ السلام نبی

۷۵۸ق م کے قریب اشوریہ کی سلطنت بڑھ رہی تھی۔ نی نے واہ اس کا دار السلطنت تھا۔ نبی یونس کو خدا نے یہاں اس لئے بھیجا کہ وہ بہت گنہگار ہو گئے تھے۔ اور ان کی سلطنت تباہ کر دی جائے۔ نبی نے اس فرض کو انجام دینے کی ہمت نہ پائی۔ اور ڈر کر بھاگا۔ اور بندرگاہ یافہ سے ہسپانیہ جانے والے ایک جہاز میں سوار ہو گیا۔ راستے میں طوفان آیا۔ اور یونس کے کہنے پر اُسے سمندر میں ڈال دیا گیا۔ جہاں ایک مچھلی نے اُسے لے لیا۔ اور زندہ ہی زمین پر پھینک دیا۔

خدا کا اب پھر حکم ہوا تو وہ نی نے واہ آیا اور چلایا کہ "چالیس دن میں شہر تباہ ہو جائے گا"۔ بادشاہ نے توبہ کی اور خدا کے سامنے جھک گیا۔ اس لئے ایک صدی سے زیادہ

وہ سلطنت باقی رہی۔

زکریاہ سنہ ۷۷۱ ق م میں زکریاہ سلطنت اسرائیل کا بادشاہ ہوا۔ اسے چھ مہینے بعد شلوم نے قتل کر دیا۔

اسرائیل کی غلامی سرغون نے سنہ ۷۲۱ ق م میں سماریہ کو فتح کر لیا۔ اور اسرائیلیوں کو اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں بھیج دیا۔

سلطنت یہوداہ سنہ ۷۲۶ ق م میں حزکیہ یہوداہ کی سلطنت کا بادشاہ ہوا۔ اور آشوری حکومت کو جو خراج دیا جاتا تھا وہ بند کر دیا۔

سناخیرب کا حملہ تب سرغون کے بیٹے سناخیرب نے حملہ کیا۔ اور یروشلم کے مقدس کو لوٹ لیا۔ پھر دو سال بعد جب سناخیرب نے مصر پر حملہ کرنا چاہا۔ تو وہ اپنے رب شاقہ (رب ساقی یا میر آبدار) کو بھیجا۔ کہ یروشلم چھین لو۔ انہوں نے عیسایہ نبی کے کہنے سے انکار کیا۔ پھر خود سناخیرب آیا۔ اس لشکر میں نبی مذکور کی دعا سے موت کا فرشتہ پھرا اور وہ مجبوراً اپنے ملک واپس بھاگا۔ اور سترہ سال بعد اُس کے بیٹوں نے اُسے قتل کر دیا۔

یوشیاہ سنہ ۶۴۱ ق م میں بادشاہ ہوا۔ وہ مقدس کی مرمت کرا رہا تھا۔ تو سردار کاہن کو شریعت کی کتاب کا رول (ROLL) ملا۔ اور اُس نے اس کے بعض اجزا بادشاہ کو سنائے اور بادشاہ نے بُت پرستی کی برائیاں سن کر بہت کچھ خوف کا اظہار کیا۔

ہُلدہ نبیہ پھر سردار کاہن نے نبیہ ہُلدہ کی رائے طلب کی۔ اس نے کہا کہ اس کتاب میں جو جزا (JUDGMENT) بُت پرستوں کے لئے لکھی ہے وہ موجودہ بادشاہ پر عاید نہ ہوں گی۔ وہ خدا پرست ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ خوش ہو گیا۔ اور

شرع موسوی کے احکام لوگوں کو سنوائے۔

یروشلم کی تباہی ۶۱۰ق م میں مصریوں نے یروشلم فتح کر لیا تھا۔ اور فرعون نے یہواکم کو تخت پر بٹھایا۔ لیکن ۶۰۶ ق م میں بخت نصر نے اسے قید کر لیا۔ اور بہت سے امرائے یہود کو بابل پکڑ لے گیا۔ اور چند ماہ بعد دوبارہ مقدّس کو لوٹا اور صدقیہ کو تخت پر بٹھایا۔ جو مصری فرعون سے سازباز کرنے لگا۔ آخرکار خالدی فوجوں نے یروشلم کا ۱۶ ماہ محاصرہ کر کے فتح کر لیا۔ بادشاہ پکڑا گیا۔ اور اس کے سامنے اُس کے بیٹے قتل کئے گئے۔ اور وہ اندھا کر کے بابل میں چھوڑ دیا گیا (۵۸۸ ق م) شہر میں آگ لگا دی گئی۔ اور مقدّس لٹ گیا۔ اور سب قید کر کے بابل بھیج دئے گئے۔

یہودی قید کی حالت میں ۵۸۸ سے ۴۳۳ ق م تک دس قبیلے غالباً افغانستان کی طرف چلے گئے۔ اُن کا حال معلوم نہیں۔ لیکن یہودا اور بن یمین کی اولاد باقی رہی اور اُس نے ترقی کی۔

بخت نصر نے ایک خواب دیکھا۔ تو دانیال اور اس کے ساتھیوں نے اُس کی تعبیر دی۔ اور وہ خوش ہو گیا۔ اور اس کے تینوں دوستوں کو بھی عہدے ملے۔

بعل اب تک بخت نصر خدا کو نہ جانتا تھا۔ اُس کا دیوتا بعل تھا۔ ساٹھ ہاتھ اونچا چھ ہاتھ چوڑا تھا۔ اور باجا بجتے ہی سب اُسے سجدہ کرتے تھے۔

دانیال لیکن دانیال اور اس کے دوستوں نے سجدے سے انکار کیا۔ وہ ایک بڑی آگ میں ڈالے گئے۔ اور سلامت رہے۔ اور اُن کے ساتھ ایک فرشتہ بھی پھر رہا تھا۔

یہ دیکھ کر بخت نصر ایمان لے آیا اور سب کو دانیال کے خدا کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

بخت نصر کو غرور کی سزا۔ اُس نے غرور کیا کہ میری اتنی بڑی سلطنت ہے۔ خدا نے اُسے پاگل کر دیا۔ اور جانوروں میں رہنے لگا۔ پھر جب ہوش آیا تو توبہ کی۔ اور نیک کام کرنے لگا۔ اور ۵۱۶ھ ق م میں مر گیا۔ اور اُس کا بیٹا ایول میرودا غ تخت پہ بیٹھا اور قتل ہوا۔ پھر ۵۳۹ھ ق م میں سائرس نے بابل کا محاصرہ کر لیا۔

بل شذر نے خواب دیکھا کہ کوئی ہاتھ عجیب و غریب الفاظ دیوار پر لکھ رہا ہے۔ دانیال نے لفظوں کے معنی بتائے کہ سلطنت ختم ہے۔ اُسی رات کو سائرس نے فرات کو عبور کیا۔ شہر بابل لے لیا۔ اور بل شذر کو ۵۳۸ھ ق م میں قتل کر دیا۔

دار یوش سائرس نے شہر دار یوش کے حوالے کیا۔ اس نے دانیال کو مجلس وزرا کا صدر بنایا۔ لیکن وہ یہوداہ ہی کی پرستش کرتا رہا۔ وزرا نے یہ چال چلی کہ دار یوش سے کہا کہ ایک مہینے تک کوئی شخص سوائے بادشاہ کے کوئی درخواست یا دعا نہ کسی دیوتا یا انسان سے نہ کرے۔ لیکن دانیال روزانہ تین مرتبہ یروشلم کی طرف منہ کر کے خدا سے دعا مانگتا رہا۔ تب مجبوراً بادشاہ نے اُسے حسب قانون شیروں کے غار میں ڈال کر اُس کا منہ بند کر دیا۔ لیکن دار یوش کو رات بھر نیند نہ آئی۔ صبح کو وہ غار پہ گیا۔ تو دانیال صحیح سلامت ملا۔ اور اُس نے اُس کے مدعیوں کو بال بچوں سمیت غار میں ڈلوا دیا۔ اور حکم دیا کہ اُس کی سلطنت میں دانیال کے خدا کی پرستش کی جائے۔

مُقدّس کی دوبارہ تعمیر ۶۰۶ھ ق م سے ۵۳۶ھ تک یہود غلامی میں رہے۔ پھر شاید دانیال کی وجہ سے اُنہیں یروشلم واپس آنے کی

اجازت لی - اور مقدس پھر تعمیر ہوا جلا دیوش نے صندوق اور شمعین وغیرہ واپس کردیں ۔

عزیرہ ۴۵۸ ق م

عزیرہ نے جلا وطنی سے واپس آکر بہت کچھ اصلاحیں کیں ۔

یروشلم کی تعمیر

اردشیر (۴۴۵ ق م) کی اجازت سے از سرنو اس شہر کی تعمیر ہوئی ۔

نحمیہ کی اصلاحیں

نحمیہ اردشیر کا میر ساقی تھا - اُسی نے یروشلم کی تعمیر کی اجازت دلوائی تھی - اور وہ خود بھی ساتھ آیا تھا پھر وہ دوبارہ آیا - اور یہ اصلاحیں کیں ۔

(۱) زیادہ سود نہ لیا جائے ۔

(۲) مشرکوں سے شادی نہ کی جائے ۔

(۳) مقدس کے لئے ہر شخص ایک سکہ چندہ دے ۔

(۴) سبت کو کام بند رہے ۔

(۵) اونچ نیچ میں شادی بیاہ نہ ہو ۔

وہ دوبارہ ۴۱۳ ق م میں ایرانی دربار میں واپس چلا گیا - اس تاریخ کے بعد عہد نامہ قدیم کی مقدس کتاب میں تاریخ بند ہوگئی ۔

چوتھی فصل

آفرینش عالم کے افسانے اور دوسری کہانیاں

عقل و ہوش کی ابتدا ہوتے ہی انسان کی نظر اپنے ماحول پر جاتی ہے۔ دُنیا اور دُنیا کی نیرنگیوں کو دیکھ کر وہ محو حیرت ہو جاتا ہے۔ اور جب ذرا ہوش آتا ہے۔ تو پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ کہ یہ عالم کیسے وجود میں آیا۔ اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا۔ نئی نئی کہانیاں تصنیف ہوتی رہیں۔ کوئی قوم پرانی کہانیوں ہی کو حقیقت سمجھتی رہی۔ کسی نے اُس میں ترمیم کی۔ کسی نے نئی کہانی بنالی۔ اور پرانی کہانی کے کچھ عنصر باقی رکھے۔ اور کسی نے ان سب کہانیوں کو بے بنیاد مان کر تحقیقات کی نئی راہ اختیار کرلی اور سنی سنائی باتوں کو اپنے تجربوں پر پرکھنا شروع کیا۔

ہزاروں سال پہلے۔ جب انسانی دماغ اپنے بچپن کے دور سے گزر رہا تھا۔ اُس وقت بابل، مصر، چین اور ہند میں جو باتیں سوچی گئیں۔ وہ بچوں کی خیال آرائیوں کی طرح خوبصورت تو ضرور ہیں۔ لیکن حقیقت سے اُتنی ہی دُور ہیں۔ جتنی کہ بچوں کی دنیا کی۔

پہیلیاں +

غرض کہ اس عالم کے وجود میں آنے کے متعلق دو الگ الگ راستے بن گئے۔ ایک جماعت یہ ماننے لگی کہ یہ عالم خود بخود وجود میں آیا ہوگا۔ اس کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ بخلاف اس کے دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ اس عالم جسم و جان کا ایک خالق ہے۔ اور اُس نے اسے خلق کرنے کے بعد اُسے نشوونما دی ہے پہلے نظریہ کو مادی نظریۂ تخلیق اور دوسرے خیال کو روحانی نظریہ تخلیق کہنا مناسب ہوگا۔

سائنس کی روشنی میں ان دونوں نظریوں کو پرکھا گیا۔ تو اب تک مختلف الخیال حکمائے سائنس کے خیالات میں قدر مشترک یہ ہے کہ

(۱) مادی نظریہ تخلیق بھی ایک حد تک سچا ہے۔ اس لئے کہ اب تک ہمارا علم اس درجے پر پہنچا کہ ہم بتا سکیں کہ کائنات کی ابتدا کب اور کیوں کر ہوئی۔ ممکن ہے کہ مادی دُنیا خود بخود وجود میں آ گئی ہو۔ لیکن ہم اتنا جان سکے ہیں کہ نئے نئے ستارے بن رہے ہیں۔ اور پرانے ستارے اور سیارے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ غالباً نئے ستارے اُس قوت یا طاقت (نور، نار اور حرارت) کو کسی طرح ایک مرکز پر لا کر ارتقائی منزلوں سے ہزاروں لاکھوں برسوں میں گزرتے ہیں۔ بہرحال ایک سائنٹسٹ یہی کہہ سکتا ہے۔ کہ جان یا روح بھی جسم یا مادے کا ایک ارتقائی درجہ ہے۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رُوح اُس مادے سے پہلے وجود میں آئی جس سے وہ ترقی کر کے موجودہ حالت پر پہنچی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ارادہ اور ارادہ تخلیق کی پیدائش بغیر رُوح کے ممکن نہیں۔ درآں حالیکہ رُوح خود بعد کی پیداوار ہے۔ اور مادّی ہے۔

(۲) روحانی نظریہ تخلیق کے متعلق سائنٹسٹ یہ فرض کر سکتا ہے۔ کہ قوت یا

طاقت (ENERGY) نے اپنی مختلف صورتیں بنائی ہیں۔ کہیں وہ ٹھوس کاربن اور لوہے کی صورت میں ہے۔ کہیں شعلۂ جوالہ ہے۔ کہیں محض نور یا روشنی ہے۔ اور کہیں مادی اجسام میں زندگی بن کر جان کے نام سے موسوم ہو جاتی ہے۔ اس طرح جسم و جان یا روح و مادہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی روح ابتدا ہیں موجود رہی ہو جس نے مادی شکل نہ اختیار کی ہو۔ اور اُس رُوحِ اوّل نے اپنے ارادے سے اس عالمِ مادی کو مختلف ارتقائی مدارج سے گزارا ہو جس میں ایک انسان بھی داخل ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ ابھی درجے پر نہیں پہنچا۔ کہ ہم یہ بتا سکیں۔ کہ رُوح مادے سے پہلے تھی۔

مادی نظریہ کا نتیجہ حزن و یاس ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر طرح ایسی مہیب قدرتی اور غیر قدرتی طاقتوں سے گھرا ہؤا محسوس کرتا ہے جس میں اُس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ایسی حالت میں نیچر یا قدرت سے لڑائی کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسی لڑائی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ زندگی اور آرام! لیکن راحت و آرام کے طلب گاروں کو ایسی کشمکش میں سکون نصیب ہونا مشکل ہے۔

روحانی نظریہ جب یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو ہر اُس شخص کو جو مادیین کی طرح کشمکشِ حیات کی لذت و مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سکونِ روح یا راحتِ قلب بھی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ امید و مسرت ہوتا ہے۔

جتنے مذہب کائنات کی وحدت کے قائل ہیں اور خالقِ کائنات کو بھی واحد و یکتا تصوّر کرتے ہیں۔ وہ سب انسان کو امید و مسرت کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اسلام

بھی اُن مذہبوں میں سے ایک مذہب کہا جا سکتا ہے۔

بابل کی کہانی تخلیق عالم کے متعلق جو کہانی توریت میں درج ہے۔ اُس سے صدیاں پرانی وہ کہانی ہے۔ جو بابل میں رائج تھی۔ یہ کہانی کنعان میں اس زمانے میں مشہور تھی جب بنو اسرائیل وہاں داخل بھی نہ ہوئے تھے۔ اور غلامی کی حالت میں مصر میں پڑے تھے۔ "تل العمارنہ" کے خطوں کا مشہور مجموعہ جو مصر میں ۱۸۸۷ء میں پایا گیا ہے۔ اور جو مصری بادشاہوں کے خطوط کا جزو ہے۔ جو مسیح سے چودہ سو سال پہلے لکھے گئے تھے۔ یہ بابلی رسم خط میں ہیں۔ ان میں سے اکثر فلسطین، شام، فینیقیہ اور فلسطیہ کے شہروں میں لکھے گئے تھے۔ اُن میں بھی ایسے افسانے موجود ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ بابلی تجارت اور خط و کتابت کی طرح، یہ افسانے بھی ہر جگہ پھیل گئے تھے جب بنو اسرائیل اس سرزمین میں داخل ہوئے۔ تو انہوں نے فوراً ان خیالات کو اپنے لٹریچر میں جذب کر لیا۔ (دیکھئے بابل اور اشوریہ کا مذہب بخصوصیت سے بہ تعلق اسرائیل از ڈاکٹر آر۔ ڈبلیو۔ راجرس ملٹناک کمپنی ۱۹۰۸ء ص ۳۶ و ما بعد)

عبرانی کہانی جو کہانی توریت میں پائی جاتی ہے۔ وہ بابلی کہانی سے اتنی مماثل ہے کہ اہل تحقیق ہی نہیں۔ بلکہ سطحی نگاہ سے دیکھنے والے بھی دونوں کہانیوں کا مقابلہ کریں۔ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ عبرانی کہانی بابل کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بابل کا تمدن اتنا قدیم ہے کہ وہ لوگ بھیڑ کے بال اکھاڑ کر کپڑے بنتے تھے یعنی اُن کو ایسی دھات بھی نہیں معلوم تھی جس سے اُون کاٹنے کی قینچی بنا سکیں۔ لہذا عبرانیوں کو بابلیوں کے مقابلے میں زیادہ متمدن کہنا نامناسب

نہیں ہے۔ گو یہ بھی بھیڑوں کے اُون کو چرخوں پر کاتا کرتے تھے۔ لیکن اون کاٹنے کی قینچی کا استعمال کیا کرتے تھے۔

بابل اور عبرانی کہانیوں کا مقابلہ۔ دونوں کہانیوں میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پہلے زمین بنی اس کے بعد سورج چاند۔ تارے وغیرہ وجود میں آئے۔ موجودہ سائنس کہتی ہے کہ زمین بننے سے پہلے سورج بن چکا تھا۔ اور یہ اُسی تنور کا ایک انگارہ ہے جو لاکھوں برس پہلے الگ ہو کر آفتاب کے گرد گھومنے لگا تھا۔ بہرحال دونوں کہانیوں کا خلاصہ یہ ہے۔

بابل کی اساطیر (متھیا)	عبرانی کہانی
۱۔ تخلیق کا کام شروع ہونے سے پہلے پانی ہی پانی تھا۔	۱ ۔ ایضاً
۲۔ پانی کے طوفان میں ایک دیوزاد رہتا تھا۔ جس کا نام "تیامت" تھا۔ یہی طوفان و گرداب کی مجسم تھا۔	۲۔ تورات میں اس کا نام تہوم (سمندر) ہے۔ یہ سمندری جانور نہیں ہے۔ (تکوین ۱۔۲)
۳۔ جب اپسو نے بغاوت کی تو دن رات پیدا ہو چکے تھے۔	۳۔ تخلیق کا پہلا کام روشنی پیدا کرنا تھا۔ (تکوین ۳۔۵۔۴)
۴۔ تیامت کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور نصف حصہ آسمان بن جاتا ہے	۴۔ تخلیق کا دوسرا کام آسمان پیدا کرنا ہے۔ جو آسمان کے نیچے اور اوپر کے

اور وہاں کے سمندروں کو روک لیتا ہے

۵- پانچویں لوح ضائع ہو گئی ہے۔ لیکن ساتویں لوح میں مردوق کو پھل اور غلے سبزی کا خالق مانا ہے۔

۶- چاند سورج ستارے وغیرہ بنے۔

۷- چھٹی اور ساتویں لوح ضائع ہو گئی۔

سمندروں کو تنگ کر دیتا ہے۔ (تکوین ب ۱- ۶-۸)

۵- زمین اور سبزی کی تخلیق۔

۶- ایضاً (تکوین ب ۲۰-۲۵)

۷- تخلیق کا چھٹا اور ساتواں کام (تکوین ۲۰-۲۵)

نوٹ:- محققین یورپ و امریکہ ان کہانیوں کے مقابلہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب یہودی بابل میں قید تھے اس وقت انھوں نے اپنی تاریخ مرتب کی۔ اور جو کہانیاں بابل میں مشہور تھیں ان کو توراۃ میں داخل کر لیا۔

اسی طرح طوفان آبی کی ایک قدیم کہانی کو جو بابل میں رائج تھی توراۃ میں طوفان نوح کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ طوفان کی کہانیاں دوسری قوموں میں بھی پائی جاتی ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔

طوفانِ آب کے متعلق بابل اور عبرانی کہانیاں

بابل کی نہایت شاندار کہانی "طوفانِ آب" کے متعلق ہے۔ آشور بنی پال کے کتب خانے کیلئے یہ کہانی بارہ بڑی بڑی لوحوں پر کندہ کی گئی تھی۔ اور بابل کے پہلے شاہی خاندان کے زمانے کی ہے۔ طوفان نوح کی عبرانی کہانی سے اس کا مقابلہ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ میں یہ کہانی بابل سے اس زمانے میں آئی ہے جب یہودی وہاں قید تھے۔ دونوں کہانیوں کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بابل کی قدیم کہانی	توراۃ میں کس طرح بیان ہوئی ہے
۱- طوفان اس لئے آیا تھا کہ انلیل دیوتا (ان لیل بلالو) اپ چشتم اور عقیقی کے دیوتاؤں سے خفا ہو گیا تھا	۱- خدا انسان کی گنہگاری سے اتنا ناخوش ہوا کہ اس نے ٹھان لیا کہ نہ صرف انسانوں کو بلکہ کسی جاندار کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔
۲- دیوتا کو غصہ صرف شہر شروپک پر تھا۔	۲- طوفان پوری دنیا پر تھا۔

۳- شمش یعنی سورج نے (جو تاریکی کے دیوتا ان لیل کا دشمن تھا)، اُت نپشتم کو خواب دکھایا کہ طوفان سے بچنے کے لئے کئی درجوں کی ایک کشتی بناؤ۔ اور اس میں خوراک اور جانور بھر لو۔	۳- خدا نے نوح کو طوفان سے بچنے کیلئے کشتی بنانے اور خوراک اور ہر قسم کے جانور جمع کر کے کشتی میں رکھ لینے کا حکم دیا۔
۴- طوفان اس لئے تھما کہ سب دیوتا خوف زدہ ہو گئے تھے اور عشتر دیوی نے اپنی مخلوق کی شفاعت کی تھی۔ اُت نپشتم اور اس کی بیوی کے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اور وہ دونوں دیوتا بن گئے۔ اور دریاؤں کے دہانے پر جو جزیرہ جنت ہے۔ وہاں رہنے لگے۔	۴- طوفان اس لئے تھما کہ خدا کو رحم آگیا۔ اور اس نے عہد کیا کہ اب میں پانی کے طوفان سے زمین کو کبھی تباہ نہ کروں گا۔ آسمان پر جو دھنک نکلتی ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان اس معاہدے کی یادگار ہے۔
۵- جب طوفان کم ہوا۔ تو اُت نپشتم نے ایک فاختہ اُڑائی وہ زمین نہ ملنے کی وجہ سے واپس آ گئی۔ پھر ایک ابابیل اُڑائی وہ بھی واپس آئی پھر ایک کوا اُڑایا وہ واپس نہ آیا۔	۵- نوح نے ایک کوّا اُڑایا جو پانی کے خشک ہونے تک اُڑتا رہا۔ پھر نوح نے ایک فاختہ اُڑائی جو واپس آ گئی۔ دوبارہ اُڑائی تو وہ زیتون کی پتی چونچ میں لے کر آئی۔ اور سہ بارہ اُڑائی تو اُسے خشکی مل گئی اور وہ واپس نہ آئی۔
۶- کشتی کوہ نیصر پر ٹھہری۔	۶- کشتی کوہ ارارات (جودی) پر ایک سو پچاس دن کے طوفان کے بعد ٹھہری۔
۷- کنارے پہنچ کر اُت نپشتم نے سوختنی قربانی کی اور دیوتاؤں کو جب اس کی خوشبو پہنچی تو وہ قربانی کرنے والے پر پروانوں کی طرح اُمڈ آئے۔	۷- نوح نے سوختنی قربانی کی اور خدا نے اس کی خوشبو سونگھی۔

تخلیقِ انسان کے متعلق بھی مختلف اقوام میں عجیب عجیب خیال آرائیاں زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہیں۔ ان سب کے مقابلے میں اگر تاویل سے کام لیا جائے تو انسان کا کیچڑ سے نشو و نما پانا زیادہ قرینِ عقل ہے اور موجودہ سائنس اس کو علمی نظریہ قرار دیتی ہے۔

حصہ دوم

اسلام سے پہلے عرب کی حالت

فہرست مضامین دوسرا حصہ

پہلی فصل

جغرافیہ عرب

عرب ایک پلیٹو ہے۔ جو بحرِ احمر کے قریب دس پندرہ میل کا میدان چھوڑ کر تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہوتا ہے۔ اور مشرق کی طرف کم ہوتا جاتا ہے۔ جنوب میں پہاڑی بلندی تو دس ہزار فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ سوائے یمن، عمان اور بعض وادیوں کے، جو مغربی پہاڑی سلسلوں میں ہیں، یہ ملک بالکل ریگستان ہے۔ جو برساتی بادل حبشہ (ابی سینیا) سے گذرتے ہیں وہ عرب کے صرف اونچے پہاڑوں پر برستے ہیں۔ نہ اس ملک میں دریا ہیں۔ نہ جنگل۔ صرف تین نام نہاد جھیلیں ہیں۔ یعنی حصا، خرج اور افلج یہ جزیرہ نما قدرتی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) مرکزی سخت ریگستان۔ یعنی نجد

(۲) نجد کے چاروں طرف کا بیابان:۔ شمالی نفود (حناء اور ربع الخالی)

(۳) بیابان مذکور کے اطراف میں وادیاں اور پہاڑی علاقے ہیں۔ جہاں بعض بعض مقامات پر زندگی ممکن ہے۔ یعنی شامی حماد۔ مدائن، حجاز۔ عصیر اور یمن، جس میں حضرموت کا ایک جزو بھی داخل ہے۔ مؤخر الذکر تین مقامات کو یونانی عربیہ فیلکس۔ مقام امن کہتے

تھے۔ اس کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ اور ریانی کی بہتات ہے۔

عمان کی بھی یہی حالت ہے۔ یہاں جبل اخضر کی ندیوں سے کافی پانی مل جاتا ہے۔

طبقاتِ ارض عرب کے طبقاتِ ارض مصر سے مشابہ ہیں۔ قدیم ترین چٹانیں چقماقی (GRANITE) ہیں۔ آتش فشاں پہاڑیوں کے نشانات کثرت سے موجود ہیں۔ ۱۲۵۶ء میں مدینہ کے قریب ایک پہاڑی سے آگ نکلنے لگی تھی۔ ایک مردہ آتش فشاں پہاڑ عدن میں بھی موجود ہے۔ اور آبنائے باب المندب میں بھی ایسی پہاڑیاں موجود ہیں۔ حصاء میں گرم پانی کے سوتے ہیں۔ اور ینبوع کے قریب کثرت سے پٹرول پایا جاتا ہے۔

آب و ہوا ملک کی آب و ہوا گرم ہے۔ پھر بھی سندھ کے ریگستان اور عراق کے بیابانوں سے کم ہے۔ نجد کی حرارت ۱۱۲ درجے سے بہت کم پڑ جاتی ہے۔ اور سردیوں میں تو پالا تک پڑتا ہے۔ اس خطے کی آب و ہوا دنیا میں بہترین مانی جاتی ہے۔ یہ خشک تو ہوتی ہی ہے لیکن سردیوں میں کافی سرد بھی ہوتی ہے۔ نجد کی نسیم یعنی شمالی ہوا مشہور ہے۔ یہ مُردوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ بحر احمر اور خلیج فارس کے قریب کے علاقوں میں ۹۰ سے ۱۰۰ درجہ تک گرمی ہوتی ہے۔ اور مرطوب گرمی تکلیف دیتی ہے۔ یمن میں جون سے ستمبر تک بارش ہوتی ہے۔ اور حجاز میں گو بارش نام کو بھی نہیں ہوتی۔ لیکن طائف کافی سیراب ہو جاتا ہے۔

جنوبی ہوا سے گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور شبنم کی کثرت سے اکثر پودوں کی نشو و نما ہو جاتی ہے۔

آبادی یمن اور عسیر - تیس لاکھ

حجاز - دس لاکھ -

عمان و حضر موت - دس لاکھ

نجد، حصا اور صحرا - بیس لاکھ

گویا کُل جزیرہ نما کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ نہیں ہے ۔

قدیم جغرافیہ

قدیم یونانی مورخوں نے عرب کے تین حصّے کئے تھے - عرب پتھریلا، عرب بیابان اور عرب سعید - پتھریلا عرب - حجاز و شام کے درمیان کا حصّہ ہے - فرات سے صحرائے شام تک اور نجد سے خلیج فارس تھا - ریگستان ہے - یہ موجودہ عراق عرب ہے - عرب سعید، یمن کا دوسرا نام ہے - سوائے نجد و یمامہ کے، جو بیابان احقاف میں ایک سطح مرتفع پر آباد ہیں اور کافی زرخیز ہیں - باقی پورے عرب میں سمندر کے کنارے آبادیاں ہیں - ان میں یمن نہایت زرخیز اور شاداب مُلک ہے -

جزیرہ نمائے طور سینا

یہ سرزمین خلیج سویس اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے اور شمال میں بحر مردار تک ہے ۔ اس کا دارالحکومت پتھرا (رقیم) تھا - اس کے جنوب میں بیابان ہیں - اور حقیقی عربستان ہے - اس کے آٹھ حصّے ہیں :-

ا - **حجاز** :- جزیرہ نمائے سینا کے جنوب مشرق میں بحر احمر کے کنارے کنارے واقع ہے - اس کے مشہور شہر مکّہ، یثرب اور طائف ہیں - یہ وادی غیر ذی زرع ہے - مدینے میں نخلستان ہیں - طائف کی آب و ہوا اور سرسبزی مشہور ہے - یہ بُستان المکہ کہلاتا ہے -

۲- یمن :- حجاز کے جنوب میں عرب کا نہایت زرخیز ملک ہے۔ اس کے شمال میں عسیر ہے۔ یہاں حمیر قبیلہ کے لوگوں کی حکومت تھی۔ اور مصری، حبشی، ایرانی، و ہندی اقوام کی ایک بڑی منڈی تھی۔ یہاں کا بُن یا قہوہ دنیا میں مشہور ہے۔ مُخاؔ عدن یا صنعاء، عدن مشہور شہر ہیں۔ شہر سبا (مارب) یہیں آباد تھا۔

۳- حضر موت :- بحر ہند کے ساحل پر یمن کے مشرق میں ہے۔ یہاں ظفار اور شیبان مشہور شہر تھے۔ عود یہیں کی پیداوار ہے۔

۴- مہرہ :- حضر موت کے مشرق میں ہے۔ مہرہ کے ملّاح مشہور ہیں۔ ان کا پیشہ ماہی گیری ہے۔ اور دوسری ضروریات دوسرے ملکوں سے آتی ہیں۔

۵- عمّان :- جنوب میں بحر ہند اور شمال میں خلیج فارس سے ملا ہوا ہے۔ تھوڑا بہت تانبا اور سیسہ پیدا ہوتا ہے۔ کھجور کے بھی نخلستان ہیں۔

۶- الحسا یا بحرین۔ عمّان سے فرات تک خلیج فارس کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں کے جزائر میں موتی بہت ہوتے ہیں۔ اور دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ زمانہ تجارت کے علاوہ یہ ملک اجڑا دیار معلوم ہوتا ہے۔

۷- نجد :- صحرائے شام کے جنوب میں ہے۔ اس کے شمال میں عروض ہے جہاں شہر ہجر تھا۔ اور دشوار گذار ریگستان ہے۔ نجد کے اونٹ اور گھوڑے دنیا میں مشہور ہیں۔ اور دنیا میں بہترین آب و ہوا بھی اسی ملک کی سمجھی جاتی ہے۔

۸- احقاف :- عمّان، الحسا، نجد، حضر موت اور مہرہ کے درمیان ہے احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔

عرب کا موسم بحر ہند کے سواحل کے علاوہ بادِ سموم کے طوفان اتنے

غضبناک ہوتے ہیں کہ نباتات جل جاتی ہے۔ حیوانات ریت کے تودوں کے نیچے دب جاتے ہیں۔ یا بمشکل جان بچاتے ہیں۔ اس زہریلی ہوا کے علاوہ بطور پر عام عرب کی ہوا نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ عرب میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم ہی بارش کا موسم ہوتا ہے۔ اور بارش نہ ہو تو کثرت سے شبنم پڑتی ہے۔ یمن میں پہاڑوں کی وجہ سے خنکی اور بارش کی کثرت ہے۔ اور یہی ملک متمدن زندگی کا مرکز ہے۔ بقیہ عرب میں عرب چرواہے اپنے خیموں، بیوی، بچوں، غلاموں اور مویشیوں کے ساتھ پانی اور چراگاہ کے لئے خانہ بدوش زندگی پر مجبور ہیں۔ اور اسی زندگی نے انہیں جنگ جو، مہمان نواز، نڈر، بہادر، اور عملی بنا دیا ہے

حیوانات غزال عرب مشہور ہیں۔ نیل گائے کثرت سے ہوتی ہیں۔ خرگوش، لومڑی، بندر جنگلی بلّی وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ شترمرغ، تیتر، بٹیر، کبوتر بھی ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی اور ٹڈیوں کے دَل اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ پالتو جانوروں میں اونٹ، گھوڑے گدھے بھیڑ بکری بہت ہوتے ہیں اور عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔

نباتات کھجور، انگور، انار، انجیر، آڑو بہت ہوتے ہیں۔ سیب، ناشپاتی وغیرہ پہاڑوں پر ہوتے ہیں۔ اور کئی قسم کے گوند ببول وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ املی۔ اراک۔ عرار اور دوسرے درختوں کا کوئلہ بنتا ہے۔

گاجر۔ تربوز۔ پیاز، کرّات کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ گلاب طائف میں ہوتا ہے۔ یاسمین کے اور ہزاروں خوشبودار پھول ہوتے ہیں۔ ایسی لطیف خوشبوئیں دنیا کے کسی پھول میں نہیں ہوتیں۔ کافی حبشہ سے یمن میں آئی۔ اور وہاں سے تمام دنیا میں پھیلی۔ حضرموت میں تمباکو اور لوبان کافی ہوتا ہے۔ بلسان سے روغن بنتا ہے اور زخموں کے مرہم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

تاریخ عرب کے ریگستان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بہت ہی پُرانا ملک ہے - اور لاکھوں سال میں یہاں کے پہاڑ اور چٹانیں گرمی کے اثر سے ریگستانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سامی نسل کا گہوارہ عرب ہی ہے اور بابل، فلسطین اور ابی سینیا میں سامی نسل کے لوگ عرب ہی سے گئے تھے - اور مصر کے "حی عکسوس" بھی عرب ہی تھے - انہیں عمالقہ بھی کہتے ہیں - ایرین تمدّن سے پہلے سامی تمدّن بابل سے شمالی افریقہ تک چھایا ہوا تھا - اور اُن کی زبان اور قانون کا اثر اب تک کل دنیا پر باقی ہے - اُنیسویں صدی میں جو کتبات یمن وغیرہ میں دستیاب ہوئے ہیں - اُن سے معلوم ہوتا ہے - کہ مسیح سے ہزار سال پہلے یہ ایک نہایت ہی متمدن ملک تھا - اور یہاں چار سلطنتیں قائم تھیں - سلطنت معین - سبا - حضرموت اور قطبانیہ - مؤخر الذکر دو سلطنتوں کے حالات ابھی پردۂ خفا میں ہیں -

ہندوستان میں جو غیر آرین تمدّن سندھ (موہنجے دارو) میں برآمد ہوا ہے - وہ یمنی اور بابلی تمدّن سے مماثلت رکھتا ہے - لیکن ابھی سندھی آثار میں جو مہریں دستیاب ہوئی ہیں اُن کا رسم الخط پڑھنے میں نہیں آیا - اس لئے کوئی مختتم رائے نہیں قائم کی گئی ؛

دوسری فصل

جاہلیہ اور معاشرت جاہلیہ

۱۔ جاہلیہ عام طور پر اسلام سے پہلے کا زمانہ زمانۂ جاہلیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن خصوصیت سے یہ وہ تاریخی زمانہ ہے جو رسُولِ عربی صلعم کے مبعوث ہونے سے سوڈیڑھ سو سال پہلے کا مانا جاتا ہے۔ اور عرب سے متعلق ہے۔ اب اس کے مخصوص معنی ہو گئے ہیں۔ اور جاہلیہ کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ کہ چونکہ اسلام سے پہلے عربوں میں کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ لوگ جو کسی رسُول کی امت سے نہیں ہیں۔ وہ وحی الٰہی سے محروم ہیں۔ اور جہل میں ہیں۔ حقیقی علم، علم خداوندی ہے۔ اور جس کے پاس یہ علم نہیں آیا وہ جہل میں ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں علم الٰہی نہیں پہنچا وہ قومیں جاہلیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ اسلام کے بعد باقی اسلام نے کل اقطاع متمدنہ میں ایلچیوں کے ذریعہ سے اس علم کی بشارت پہنچا دی تھی۔ اسی لئے نبوت سے پہلے کا زمانہ جزیرۃ العرب کے لئے خصوصیت سے جاہلیہ کا زمانہ ہے۔

یہ تو مخصوص یا اصطلاحی معنے ہوئے لیکن جہل کا حقیقی مفہوم وہ ہے۔ جن میں اس لفظ کا استعمال شعرائے جاہلیہ کیا کرتے تھے:۔

(۱) ان میں سے ایک یعنی جہل بمقابلہ علم کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ (لسان العرب جلد ۱۳

ص ۱۳۶)

(۲) جہل کے دوسرے معنی تفاخر نسب، غرور اور درشتی کے بھی ہیں۔ (لسان العرب ص ۱۳۸)

(۳) جہل کے معنی اکھڑپن کے بھی ہیں۔ بمقابلہ حلم یا بردباری وانکساری کے۔ شاعر جاہلیہ مقرس بن ربوالجی کہتا ہے۔

انا لنصفح عن مجاهل قومنا - ونقيم سالفة العدو الاصيد

ترجمہ:۔ ہم اپنی قوم کے اکھڑپن کو معاف کر دیتے ہیں ۔ لیکن ہم مغرور دشمن کی ٹیڑھی گردن کو سیدھا کر دیتے ہیں

عمرو بن کلثوم کہتا ہے ؎

ألا لا يجهلن احد علينا ۔ فنجهل فوق جهل الجاهلينا

ترجمہ:۔ خبردار کوئی ہم سے اکھڑپن سے پیش نہ آئے ۔ اس لئے کہ ہم اکھڑوں سے زیادہ اکھڑ ہیں

فند الزمانی کا قول ہے۔ (الحماسہ)

وبعض الحلم عند الجهل للذلة اذعان ۔ وفى الشر نجاة حين لا ينجيك احسان

ترجمہ:۔ کوئی بردباری ایسی ہوتی ہے کہ پستی کی طرف لیجاتی ہے ۔ اور جب احسان سے فائدہ نہ ہو تو شر (جہل) نجات دیتا ہے

ایک اور شاعر قدیم کہتا ہے:۔

ترفعت عن شتم العشيرة انني ۔ رأيت أبي قد كف عن شتمهم قبلى

حليم اذا ما الحلم كان جلالة ۔ وأجهل احيانا اذا التمسوا جهلى

اسی طرح معاویہ نے کہا:۔

إني والله لاعفو عن سفيههم، واحلم عن جاهلهم (الوسی۔ بلوغ الادب۔ فی معرفة احوال العرب ج ۲، ص ۱۸۷۔)

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے ۔ ایام جاھلیہ کا تعلق اس دورِ تاریخ عرب سے ہے ۔ جب وہ اکھڑ پن یعنی (جہل) میں مبتلا تھے ۔ اسلام کے بعد ان میں صفت حلم بھی پیدا ہو گئی ۔ اور جن سے جہالت دُور ہو گئی وہ مسلمان یا مہذب یا بُردبار کہلائے ۔

"جہل" کے معنی سیوطی کی اُس حدیث سے بھی واضح ہو جاتے ہیں ۔ جو انہوں نے الخصائص الکبریٰ میں بیان کی ہے (ج ۱ ۔ ص ۱۵ ۔ طبع اول ۔ حیدر آباد ۱۳۱۹ ھ) "الطبرانی، ابن حبان، الحاکم، البیہقی اور ابو نعیم نے ایک حدیث عبد اللہ بن سلام سے روایت کی ہے ۔ کہ انہوں نے کہا کہ جب خدا نے زید بن سعنہ کو ہدایت کرنا چاہی تو اُس نے محمدؐ صلعم کے چہرے میں نبوت کا ہر نشان موجود پایا ۔ سوائے اس کے کہ وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ آپؐ کا حلم آپؐ کے "جہل" پر سبقت لے جاتا ہے یا نہیں ۔ اور آیا آپؐ کسی جاہل کی جہالت سے اور زیادہ حلیم ہو جاتے ہیں یا نہیں "۔

اس حدیث میں آگے بیان ہوا ہے کہ زید نے آنحضرت سے تعلقات بڑھانا شروع کیے ۔ حتیٰ کہ آپؐ کو کچھ کھجوریں قرض دیں ۔ اور آپؐ کو غصّہ دلانے کے لئے حضرت عمرؓ کی موجودگی میں نہایت بدتمیزی اور سختی سے قبل از وقت دام مانگنا شروع کیے ۔ عمرؓ کو اتنا غصہ آیا ۔ کہ وہ اُسے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے ۔ لیکن رسول اللہ نے عمرؓ پر سکون اور تؤدت (وقار) سے نظر ڈالی ۔ اور غصّہ نہیں کیا ۔

یہاں بھی جہل کے معنی اُس کی ضد یعنی "سکون، وقار اور حلم" معلوم ہوتے ہیں ۔

۲ ۔ معاشرت جاہلیہ

جاہلیہ میں یمن اور دوسرے زراعتی مقامات کا تمدن اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھا ۔ اس کے علاوہ رومی، ایرانی، افریقی اور ہندی تاجروں کی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے عربوں میں ہر قسم کے خیالات اور ہر جگہ کی اچھی بُری رسمیں بھی پیدا ہو گئی تھیں ۔ لیکن عام طور پر عربوں کی زندگی کا

انحصار مویشیوں پر تھا۔ اور اُن کی زندگی زراعت کی پُرامن زندگی کے فنوں ہی پر مبنی نہ تھی بلکہ چرواہوں اور تاجروں کی زندگی میں جن جن خصلتوں کا ہونا ضروری ہے۔ وہ سب اُن میں میں موجود تھیں۔ مثلاً:۔

قبائلی اتحاد قبیلے کے افراد اپنے سردار یا شیخ قبیلہ کے تابع فرمان ہوتے تھے۔ اور اُن کی یک جہتی ہی میں اُن کی قوت اور دولت کا راز پنہاں تھا۔ قبائلی زندگی کے زمانے میں اگر کوئی شخص کسی شیخ کی حمایت (یا جوار) میں نہ ہوتا تھا۔ تو اُس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا اگر اُسے کوئی قتل کر دے یا اُس کا مال چھین لے۔ تو کوئی اُس کی طرف سے دعوے دار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے جن قبائل میں قصاص لینے کی قوت نہ ہوتی تھی۔ وہ ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ عزت کے معنی یہ تھے کہ اپنے قبیلے کے افراد کی خواہ وہ غلام ہوں یا آزاد، عورت ہوں یا جانور۔ جان و مال کی مکمل حفاظت ہو سکے۔ اور ظالم سے مظلوم قبیلہ والے قصاص لے سکیں ؛

قصاص کل عرب کی متحدہ سلطنت نہ تھی۔ اس لئے قصاص قبائلی زندگی کا جزو لاینفک تھا۔ اسلام نے بھی اسے جاری رکھا۔ اور صرف اتنا فرق کر دیا۔ کہ قصاص کا دعوے بجائے شیخ قبیلہ کے حکومت کرتی تھی۔ اور منتظم حقیقی خدا کو مانتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور اور قوی دونوں حکومت کے سامنے مساوی قرار پائے ؛

منافرت عرب اپنے نسب پر بہت فخر کرتے تھے۔ اور نسب اُن ہی لوگوں کا بہترین سمجھا جاتا تھا۔ جو فیاض ہوں اور قصاص لے سکیں۔ یا فدیہ لے کر لوگوں کی جانیں بچائیں۔ یعنی شجاعت و حماست میں بھی دوسروں سے فضیلت رکھیں۔ اور مظلوم و مسافر اور مسکینوں کے حامی ہونے میں نام آور ہوں۔ علقمہ عامری اور عامر بن الطفیل عامری کی منافرت و مفاخرت مشہور ہے ؛

فیاضی عرب کی سی نامساعد آب و ہوا اور سفر کی دشواریوں کی وجہ سے مہمان نوازی اور فیاضی ایک بنیادی نیکی بن گئی تھی۔ حتےٰ کہ دوسروں کی حمایت اور خدمت کے لئے اپنا آخری اونٹ یا بکری ذبح کر دینا ایک عام بات تھی۔ اور مہمان کو پناہ دے کر اُس کے لئے جان سے دریغ نہ کرنا اُن کا قومی شعار تھا۔ ان کی حمیّت اور غیرت کے قصے اتنے ہیں کہ شمار مشکل ہے۔ زید الخیل طائی اور حاتم طائی کی سخاوت مساوی درجے کی قرار پائی تھی۔ اور یہ دونوں مشترک طور پر اپنے قبیلے کے سردار مانے گئے تھے۔

وحدت سیاسی کا رجحان مختلف بت خانوں کی زیارت۔ مختلف قوموں کے اختلاط، اور عام ہم خیالی کے باعث اُن میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ کہ چند قبیلے آپس میں متحد ہو کر دوسرے قبائل پر حکمران بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف میلوں میں جمع ہو کر تجارت کی گرم بازاری ہوتی تھی۔ اور تجارت کے ساتھ ساتھ خیالات کا لین دین بھی ہو تا رہتا تھا۔ اور شعرا اپنے قبیلے کے رجحانات کو چار چاند لگا کر عربوں میں مشترک بنیاد مفاخرت قائم کرتے تھے۔

شاعری و زبان آوری عربی سامی النسل زبان ہے۔ اس کی سب سے پُرانی وضع بابلی یا عاد و ثمود کی زبان ہے۔ جو تین ہزار سے پانسو قبل مسیح تک رائج رہی۔ عبرانی (از ۱۵۰۰ ق م) ارامی (از ۸۰۰ ق م)، قحطانی۔ (از ۸۰۰ ق م)، فینیقی (از ۷۰۰ ق م)، حبشی (از ۳۵۰ ع) اور عربی (۵۰۰ ع) اسی پُرانی عربی کی مختلف شاخیں ہیں۔ اور گو عربی کا سرمایہ ادب زبانی رہا۔ لیکن کتبات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سامی زبان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت عربی ہی کی ہے۔ جو اب تک زندہ ہے، اور دو بر اعظموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ جاہلیہ کا کلام ۵۰۰ء سے پہلے کا موجود نہیں ہے۔

لیکن زبان کی وُسعت اور اس کا ڈھانچہ ہمہ گیر اور اعلےٰ معیار ترقی پر پہنچا ہُوا ہے۔ امرؤالقیس (لقبین (۵۴۰ ء) سے ہزاروں سال پہلے اس زبان کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ جو بعد میں حارث۔ طرفہ (۵۶۴) عنترہ (۶۱۵)، عمرو، زہیر اور لبید (۶۲۲) کی زبان قرار پائی۔ ان شعرائے جاہلیہ کا کلام دیوان جاہلیہ کہلاتا ہے۔ اور اُن کی رسموں، لڑائیوں، تمدن کے درجوں اور خیالوں کا پورا پورا مظہر ہے ؛

شراب اور جواء شراب اور جواء رئیسوں کے لئے مخصوص تھا۔ یہ اُن کے گھروں پر بھی ہوتا تھا۔ اور مختلف میلوں (اسواق) میں بھی ان کی گرم بازاری ہوتی تھی۔ عُکاظ۔ مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں شاعری اور رقص و سرود کے ساتھ ساتھ بزم مے اور قمار بازی کے جلسے خوب جمتے تھے۔ جیتنے والے جتنے اونٹ یا اونٹ کے حصے جیتتے تھے۔ وہ مساکین کو کھلا دیتے تھے۔ اور شراب کے قرابوں کا منہ عام مہمانوں کے لئے کھلوا دیتے تھے۔ اسلام نے ان چیزوں کو منسوخ کر دیا۔ اور جوئے کے ذریعے سے مجبوراً فیاضی کرنے کی جگہ یہ حکم دیا کہ بغیر ہارے ہوئے اور خوشدلی کے ساتھ اطعام مساکین کرنا سخاوت کا بہتر طریقہ ہے۔ اور شراب کو اس لئے حرام قرار دیا کہ منافع سے زیادہ اس میں نقصانات ہیں ؛

توہم پرستی ان کا مذہب بعض خرافات اور توہمات کا مجموعہ تھا لیکن یہ بات صرف عربوں ہی میں نہ تھی۔ کل دنیا میں پھیلی ہوئی تھی حتےٰ کہ قدیم بابلی اثرات کی وجہ سے سحر و جادو۔ کہانت اور عجوبہ پرستی بہ عام تھی۔ ان سب چیزوں کا ذکر آئندہ کسی قدر تفصیل سے درج کیا گیا ہے ؛

تیسری فصل

چھٹی صدی مسیحی میں عرب کی سیاسی حالت

عرب کی سیاسی حالت کے جاننے کے لئے متعدد کتابیں موجود ہیں۔ اس لئے ہم یہاں مجملاً کچھ لکھ دیتے ہیں۔ تفصیل کے لئے فہرست کتب جو اس کتاب کے آخر میں درج ہے کام دے سکتی ہے

(۱) فرات اور بیابان کے درمیان زرخیز علاقے میں حیرہ کی سلطنت تھی۔ جو موجودہ کوفے سے سات میل جنوب میں واقع تھا۔ یہاں قبیلہ لخم پیدا ہوا۔ اور تیسری صدی مسیحی سے سنہ ۶۰۲ء تک یہاں حکمران رہا۔ اور اس کا آخری بادشاہ نعمان عیسائی ہو گیا۔ اس سلطنت کو ایرانی سلطنت کی دوستی کا فخر حاصل تھا۔ اور رومیوں اور غسانیوں سے ہمیشہ برسر پیکار رہا کرتی تھی۔ سنہ ۶۰۲ء میں خسرو ثانی نے اسے فتح کر لیا۔ اور ایک طائی عرب کو اس کا گورنر مقرر کر دیا۔

(۲) غساسنہ۔ سنہ ۵۲۹ء میں حارث بن جبلہ غسانی کو جو عرب کے شمال مغرب میں حکمران تھا۔ جسٹی نی ان شہنشاہ روم نے عرب کا بادشاہ اور رومن سامراج کا ایک امیر مان لیا۔ غسانیوں کی سلطنت حیرہ سے ہمیشہ لڑائی جاری رہتی تھی۔ سنہ ۵۸۳ء کے بعد غسانیوں کی سلطنت کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ بعض آزاد تھے اور بعض ایران کے ماتحت ہو گئے تھے۔

(۳) قبیلہ کندہ۔ آکل المرار نے قبیلہ کندہ کی سربراہی کی۔ اور مرکزی عرب میں ایک سلطنت

کی بنیاد ڈالی - اور یمن والوں کی حلیف بن گئی - اسی لئے ابرہہ نے جب حجاز پر حملہ کیا - تو کندی بھی فوج کے ساتھ تھے - ان کی حکومت بحرین اور یمامہ پر بھی تھی - امرأالقیس اسی قبیلہ کا شہزادہ اور شاعر تھا۔

(۴) بحرین میں بنی عبد قیس آباد تھے - اور اس کے دارالسلطنت ہجر میں ایرانی گورنر تھا۔

(۵) یمن - ابی سینیا یا حبشہ کی ماتحتی میں تھا - یا اُس کا حلیف تھا۔

(۶) حجاز میں جو شہر تھے اُن کی اپنی اپنی حکومتیں الگ الگ قائم تھیں - اور سوائے حجاز کے عرب کا کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جس پر بیرونی ممالک نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنا اقتدار نہ قائم کیا ہو - اس لئے عرب کا یہ خطہ قبائلی آزادی اور آزاد خیالی کا سرچشمہ تھا - اور ابتدائے عالم سے بعثت نبویؐ تک یہاں کی سیاست اپنے طور پر ترقی کر کے ایک خاص بلندی تک پہنچ چکی تھی - صرف تجارتی قافلوں سے حجازی زندگی کی معاشرت پر اثرات پڑتے رہتے تھے - اور ابرہہ کے حملہ کے علاوہ کسی بیرونی حملہ کا تجربہ ان قبائل کو نہیں ہوا تھا۔

چوتھی فصل

مکّہ کا نظامِ زندگی

مکہ کی بنیاد اور شہروں کی طرح تجارتی منزل کے طور پر پڑی تھی۔ تجارت ہی سے زمانۂ قدیم میں شہروں کے نام پر حکومتیں اور سلطنتیں بن جاتی تھیں۔ اور خاص شہروں دیوتاؤں یا عبادت گاہوں کی شہرت کی وجہ سے وہ قوم موسوم ہو جاتی تھی۔

مکہ۔ جسے سنسکرت والے موکشا (نجات کی جگہ) اور ایرانی مہ گہ (چاند کی جگہ) کہتے تھے۔ اُس شاہراہ (صراطِ مستقیم) پر واقع تھا جو ہندوستان اور یمن کی تجارت کو شام اور مصر کی منڈیوں سے ملاتا تھا۔ اور وہاں سے دُور دُور پہنچاتا تھا۔ مکہ خود تجارتی جگہ نہ تھی۔ لیکن تجارتی قافلوں کے لئے یہاں ہر قسم کی سہولتیں مہیا تھیں۔ مزدور بار برداری کے اونٹ اور خچر حفاظت کرنے والے بدستے کے سپاہی جو زیادہ تر قریش ہوتے تھے۔ اور حرام مہینوں کے علاوہ بھی امن کے ساتھ سفر کر سکتے تھے۔ یہاں مل جاتے تھے۔ مالدار تاجروں اور کم اندیش مزدوروں کے لئے شراب نوشی۔ قمار بازی اور غلام عورتوں کے علاوہ صاحبات الرایات بھی موجود ملتی تھیں۔ غرضیکہ مکہ کی حالت موجودہ تجارتی بندرگاہوں کی سی تھی۔ جہاں ہر طرح کی اچھی اور بُری آسائشیں آسانی سے میسّر آجاتی تھیں۔

لیکن یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ایک مرکزی عبادت گاہ بھی تھی۔ اور

ہر ملک و قوم کے لوگ اپنی اپنی عبادت اور نذر و نیاز پوری کرنے کے لئے مکہ کے بتوں کے پاس حاضری دیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے تاجروں میں اس شہر کی بڑی شہرت تھی اور ایک قصہ مشہور ہے کہ پہلے جگت گرو سری شنکراچاریہ نے طوطے کے روپ میں اُڑ کر مکہ میں حجر اسود پر گنگا جل اور پھول چڑھائے تھے۔ اور جب اس دنیا کا آخری وقت آئے گا۔ تو شنکر (خدا) کا ایک پاؤں کاشی اور دوسرا کعبہ میں ہوگا۔ (دیکھئے تقریر جگت گرو سری شنکراچاری۔ مشہور مقدمہ کراچی ۱۹۲۱ء)

بہر حال اس میں شک نہیں کہ مکے کے مشہور صنم کدہ کے بُت (خصوصیت سے حجر اسود) دُور دور مشہور تھے۔ ہندوستان میں شیو کی پوجا کرنے والے بھی حجر اسود ہی کی صورت کے ایک گول پتھر کی عبادت بالکل اُسی طرح کرتے ہیں جس طرح ایام جاہلیہ میں اور اسلام کے بعد کسی قدر اصلاح کے ساتھ اب تک کرتے ہیں۔ جسے عرب میں طواف کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں پرکرما ہے۔ اور جس طرح عرب میں جانوروں یا انسانوں کی قربانیوں کا دستور تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں مختلف دیوی دیوتاؤں پر جانوروں اور انسانی قربانی کی رسم تھی۔ اور اب بھی دونوں جگہ جانوروں کی قربانی رائج ہے یہی حال جاتریوں اور حاجیوں کا ناخون کٹانے اور سر کے بال منڈانے کے متعلق ہے۔ اور نہ صرف بال اور ناخن کٹانا عرب اور ہند میں رائج ہے۔ بلکہ اُس زمانے کی دُنیا میں ہر معبد اور زیارت گاہ میں یہی رسم تھی۔

عرب میں ہر جگہ بُت اور بتوں کے ساتھ بتخانے قربانگاہ اور پجاری موجود تھے۔ بعض مشہور بُت یہ تھے:۔

ینبع میں:۔ سواع بنی ہذیل کا بُت تھا۔

یمن میں:۔ یعوق۔ یغوث۔ نسر۔

عذرہ میں:۔ وُد۔

قدید میں :- منات - سمندر کے کنارے مکے اور مدینے کے درمیان یہ بت خانہ تھا - یہ امر تحقیق طلب ہے کہ آیا اس کا کوئی تعلق اُس بتخانے سے تھا - جو مقابل کے ساحل پر ہندوستان میں سومنات کے نام سے مشہور بُت خانہ تھا -

طائف میں :- لات دیوی تھی -

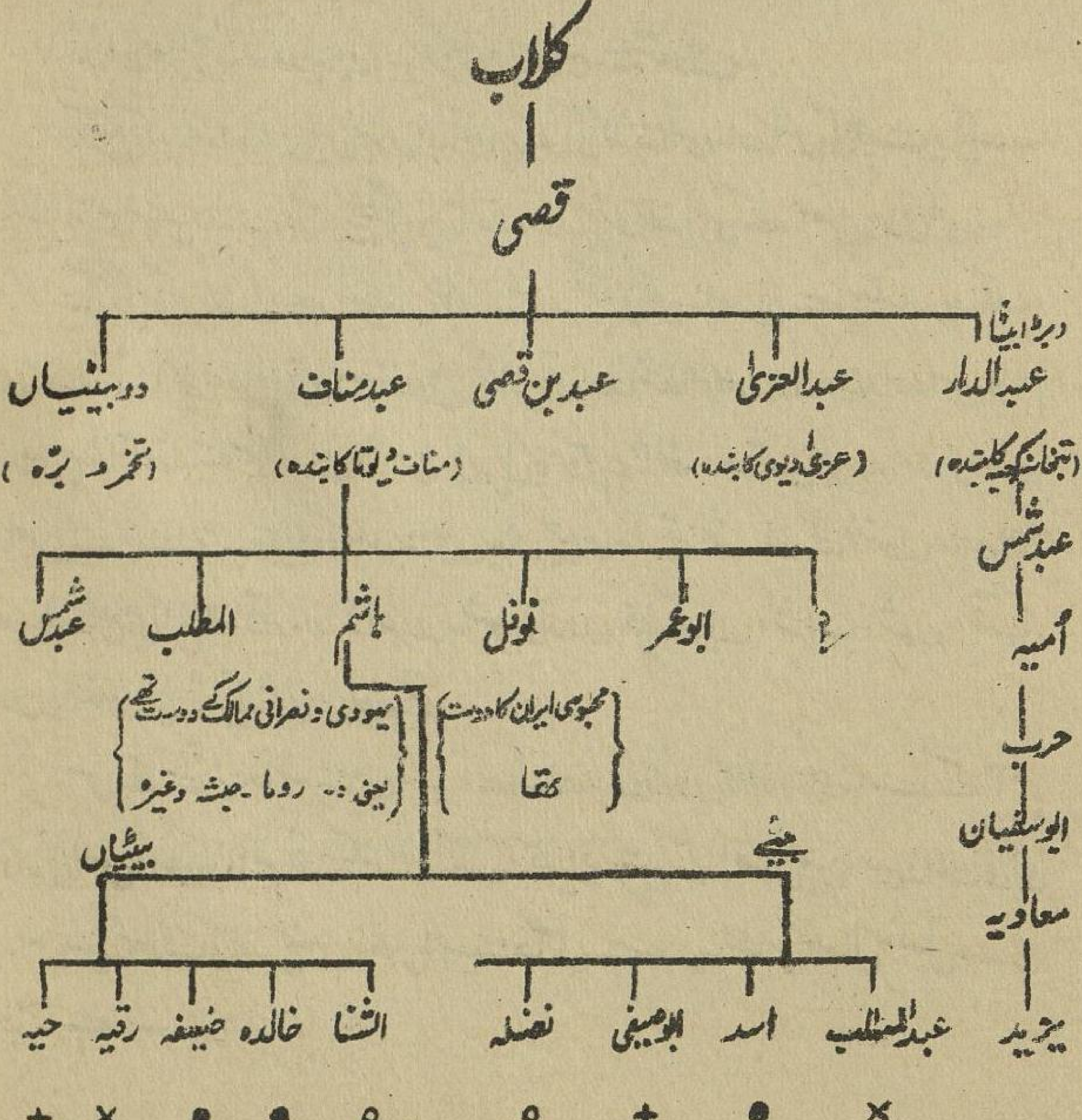
مکہ اور عراق کے درمیان :- عُزیٰ دیوی بہت مشہور تھی -

مکہ میں کعبہ تھا - اس میں بتوں اور تصویروں کی کثرت تھی - اور اس کی چھت پر ایک قوی ہیکل بُت ہبل نصب تھا - یہ جنگی دیوتا تھا - اور فتح و ظفر اسی کے نام پر ہوتی تھی -

مکے کی مرکزیت کی وجہ سے یہاں تجارت خوب چمکتی تھی - اور حج سے پہلے اور بعد تک ذی قعدہ - ذوالحجہ - محرم ، تین مہینوں میں خونریزی اور انتقام کا دروازہ بند اور امن عام کا اعلان ہو جاتا تھا - یہ موسم فروری ، مارچ ، اپریل کا موسم ہوتا تھا - اور شمال جنوب ، مشرق مغرب کے تاجر ایک بہت بڑے میلے کی صورت میں یہاں جمع ہو جاتے تھے - اور لگے ہاتھوں عبادت کے ساتھ ساتھ نفع بھی کما لیتے تھے - اور شاعروں ، شہسواروں ، قصہ گویوں ، شراب نوشوں ، قمار بازوں کی محفلوں میں شریک بھی ہو لیتے تھے -

اسی لئے مکے کی معاشرت میں سب سے بلند درجہ اُن لوگوں کا تھا - جو مذہب کے نام پر تجارتی امن و امان کو قائم رکھ سکتے تھے - مکہ کے قبیلہ قریش کے ہاتھوں میں امن و امان کی کُنجی تھی - اس قبیلہ کو عرب کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے - اس لئے اس کا حال مفصل درج کیا جاتا ہے :-

قصی بن کلاب کا خاندان



(جن پر ایک ہی قسم کے نشان ہیں۔ وہ ایک ماں سے ہیں)

مکہ کا سیاسی نظام قصی بن کلاب کے زمانے سے پہلے خانہ کعبہ کا متولی حلیل تھا۔ یہ قبیلۂ خزاعہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو خود قبیلۂ ازد کی ایک شاخ ہے۔ ازد بنو قحطان تھے جسے بائبل میں یقطان (JUKTAN) کہا ہے۔ انہیں عرب عاربہ بھی کہتے ہیں۔ عرب کے سب سے قدیم باشندوں یعنی عرب بائدہ (عمالیق، عاد، ثمود، جرہم، طسم، جدیس وغیرہم) کے بعد عرب میں بنو قحطان ہی آباد تھے۔ پہلے یہ لوگ یمن میں آباد تھے۔ جو کہلان اور حمیر (HOMERITES) کہلاتے تھے۔ سدِ مآرب کے ٹوٹنے کے بعد یہ لوگ پورے عرب میں پھیل گئے تھے۔ اور قبیلہ خزاعہ نے قریش سے مل کر مکہ پر قبضہ کر کے بنی جرہم کو نکال دیا۔ اور کعبہ کی تولیت چھین لی تھی۔ یہ واقعہ ۲۰۶ء کا ہے۔

قصی بن کلاب نے حلیل خزاعی کی بیٹی جبتی سے شادی کر لی تھی۔ مرتے وقت اُس نے کعبہ کی تولیت قصی کو وصیت کر دی۔ اور خود قصی نے ایک دار الندوہ قائم کیا جو مکہ کا ٹاؤن ہال کلب تھا۔ جنگ و صلح کے سب کاموں کا مشورہ یہیں ہوتا تھا۔ پھر اُس نے سقایہ اور رفادہ کے محکمے قائم کئے۔ جو حاجیوں کے پانی اور کھانے کا انتظام کرتے تھے۔ اس کے لئے قریش پر ٹیکس لگایا۔ اس طرح قصی جو بنو اسماعیل میں سے تھا۔ مکہ کا سردار ہو گیا۔ کتاب الواقدی (ص ۱۲) کے مطابق قصی نے خزاعہ سے حکومت حاصل نہیں کی بلکہ چھین لی۔ اس کے بعد مکہ کی آبادی پھیلنے لگی اور اطراف میں کلنٹے دار درخت اور پودے۔ (العضاۃ والسلم) تھے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ حرم ہے۔ جہاں درختوں کا کاٹنا بھی ممنوع تھا۔ لیکن قصی نے خود کلہاڑی سے کاٹنا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ لوگوں کی جھجک کم ہو گئی۔ قرآن میں بھی سدرۃ المنتہیٰ اور جنۃ الماویٰ کا ذکر غالباً اسی جنگل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہر حال یہ واقعہ تقریباً ۴۴۰ء کا ہے۔

اس سے پہلے قصی کے اجداد میں معد بن عدنان کے پاس تین عہدے تھے:-

(۱) انسائات۔ سال میں ایک مہینہ کو نسی کرنا اور قمری سال کو شمسی سال کے مطابق بنانا تاکہ حج ایک خاص موسم میں ہو سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت قدیم اور اہم عہدہ تھا۔ اور لوگ قدیم تجربے کی بنا پر موسموں کا صحیح وقت پر قائم کرنا سیکھ گئے تھے۔

(۲) اجازہ:۔ عرفات سے واپس آکر منا میں حاجی جمع ہوتے تھے۔ اور دونوں جگہوں سے روانہ ہونے کی اجازت کا اختیار قبیلہ معد کو تھا۔

(۳) افاضہ:۔ مزدلفہ سے جب حاجیوں کا جلوس چلتا تھا تو معدہی کے قبیلے کے لوگ اس کے آگے آگے ہوتے تھے۔ (طبری)

قصی نے مقام مزدلفہ کو مشعر حرام قرار دیا۔ حج کے دنوں میں یہاں روشنی و چراغاں کیا جاتا تھا۔ غرضیکہ قصی کے مرنے پر مندرجہ ذیل عہدے اُس کے بڑے بیٹے عبد الدار کو ملے:۔

عبد الدار بن قصی کے عہدے

(۱) حجابہ یا تولیت کعبہ:۔ یہ عہدہ قصی بن کلاب کو حلیل خزاعی سے ملا تھا۔

(۲) ندوہ:۔ خود قصی نے ایجاد کیا۔ اور دارالندوہ کعبہ کے مقابل بنایا تھا۔ یہ گویا ٹاؤن ہال تھا۔ ہر قسم کے سوشل معاملات یہاں سرانجام پاتے تھے۔

(۳) قیادہ:۔ (یا لواء۔ جھنڈا) جنگ میں فوج کی سرداری۔

(۴)۔ سقایہ:۔ قصی بن کلاب نے ایجاد کیا۔

(۵) رفادہ:۔

عبد مناف بن قصی کے بیٹوں کے کارنامے

(۱) نوفل بن عبد مناف نے فارس اور عراق کے حکمرانوں سے تجارتی معاہدے کئے۔ ظاہر ہے کہ اس امر سے مجوسیت و مانویت کا علم "مکہ" میں پھیلا۔ پھر اپنے بھائی ہاشم سے سقایہ اور رفادہ کا

حق غصب کرنا چاہا۔

(۲) المطلب نے سلاطین حمیر سے تجارتی معاہدہ کیا۔ (رحلۃ الشتاء)

(۳) عبد شمس نے نجاشی بادشاہ حبشہ سے معاہدہ کیا۔

(۴) ہاشم نے قیصر روم اور نجاشی سے تجارتی معاہدے کئے۔ (رحلۃ الصیف) اور عبد الدار سے سقایہ ورفادہ اپنے خاندان کے لئے حاصل کرلئے اور قبائل عرب میں حدود کر کے قریش کے لئے سب مہینے حرام قرار دلوائے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ جس قافلے کے ساتھ قریش ہوتے تھے۔ وہ قافلہ لوٹ مار سے بچ جاتا تھا۔ سب سے پہلے قصی نے قریش کے مختلف قبائل کو منظم کیا۔ اور ایک حکومت اشراف (Aristocraces) کی بنیاد ڈالی۔ اور خود ان کا سردار بنا۔

اس نظام سلطنت میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا۔ کہ مذہب کے نام پر تجارتی ترقی ہو۔ اور جو بازاریں (اسواق) حج کی وجہ سے قائم ہوجاتی ہیں۔ اُن میں امن وامان قائم رہے۔ لہٰذا مذہبی نظام کی بنیادوں کو مضبوط کیا گیا۔ اور چونکہ خانہ کعبہ نے عرب کے دوسرے معبدوں سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی تھی۔ اور شام وعراق کی سڑک (صراط) کا اہم پڑاؤ مکہ ہی میں تھا۔ اس لئے کعبہ کی وجہ سے قریش کو لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ آمدنی کا ایک ذریعہ تو وہ چڑھاوا اور نذریں تھیں جو مختلف بتوں پر چڑھائی جاتی تھیں اور کعبہ کے مختلف پجاریوں (سادنوں) میں تقسیم ہوجاتی تھیں۔ اور کچھ رقمیں تجارتی قافلوں کی حفاظت اور باربرداری کے سلسلے میں حاصل ہوتی تھیں۔ غرضیکہ نقد وجنس کی کثیر مقدار مکے والوں کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اسی لئے حج سے پہلے اور حج کے بعد جو مہینے تھے۔ وہ امن کے مہینے مانے جاتے تھے۔ اور اُن میں لڑائی حرام تھی۔ (یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرّم) اور سال کے درمیان میں رجب کا مہینہ بھی حرام کردیا گیا تھا۔ اور لوگ خانہ کعبہ کی زیارت کو آتے تھے اسے عمرہ کہتے تھے۔ لہٰذا خود بخود تین اہم جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں:۔

(۱) مذہبی جماعت (۲) انصاف کرنے والی جماعت۔ (۳) حفاظت کرنے والی جماعت۔

مذہبی نظام مذہبی نظام میں خانۂ کعبہ کی تولیت اور انتظامات حج کے متعلق مختلف عہدے تھے۔ اور مختلف خاندانوں میں تقسیم کردیے گئے تھے۔ تفصیل یہ ہے:-

نمبر سلسلہ	محکمہ	تفصیل	خاندان	نام عہدہ دار بزمانہ رسول اللہ
۱	حجابہ	خانہ کعبہ کی کلید برداری و تولیت	عبدالدار	عثمان بن طلحہ
۲	سقایہ	حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام	ہاشم	عباس بن عبدالمطلب
۳	رفادہ	حجاج کو کھانا کھلانا۔ ناداروں کی امداد	نوفل	حرث بن عامر
۴	عمارہ	خانہ کعبہ کی نگرانی و دیکھ بھال	ہاشم	
۵	سدانہ	کلید برداری و دربانی	عذار؟	(مہاجرین ص ۲۶۔ اعظم گڑھ)
۶	ایسار و ازلام	فال و قرعہ کے تیر	جمح	صفوان بن اُمیہ
۷	اموال محجرہ	چڑھاوے کا مال اور اوقاف۔	سہم	حرث بن قیس

نوٹ:۔ طبری کے حوالے سے "مہاجرین" میں سدانہ کا ذکر ہے۔ حالانکہ عموماً اس کا تعلق بنی عبدوار سے بتایا گیا ہے۔

نسائت	ہر تیسرے سال قمری سال کو شمسی بنانا	مور بن عدنان اجداد و قصی کے پاس یہ تینوں عہدے تھے۔ اور رسول اللہ کے زمانے میں قفیم بن عدی نسی کیا کرتا تھا۔
اجازہ	حج سے واپس ہونے کی اجازت دینا	
افاضہ	حج کے جلوس کی سرداری و قیادت	

فوجی نظام قریش کے یہاں جنگ و تحفظ کے متعلق چار عہدے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے قبائل اور خصوصیت سے رومی و ایرانی فوجوں میں بھی یہی عہدے ضروری تھے۔ لیکن مختلف

قبائل یا گروہوں کی میراث نہ تھے - قریش نے مکّہ کے چار خاندانوں میں تقسیم کر کے ایک نیا جمہوری نمونہ دکھایا تھا - وہ یہ ہے :-

نمبر	عہدہ	تفصیل	خاندان	نام عہدہ دار
۱	عقاب یا لواء	قومی جھنڈے کی علمبرداری	امیہ	ابوسفیان بن حرب
۲	قبہ و قیادہ	خیمہ جنگ اور سواروں کی افسری	مخزوم	ولید بن مغیرہ
۳	اعنہ	فوج کی سپہ سالاری	مخزوم	
۴	سفارت	سفارت کے ساتھ ساتھ منافرت - (منافرت میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون افضل ہے	عدی	عمر بن الخطاب

متفرق عہدے :- دو اور عہدے تھے جن کا تعلق جنگ اور امن دونوں سے تھا - لہذا انہیں علیحدہ درج کیا جاتا ہے :-

نمبر	عہدہ	تفصیل	خاندان	نام عہدہ دار
۱	ندوہ	جنگ و امن میں مشورہ گھر یعنی چوپال اور عام سوشل مراسم کا کلب	اسد	یزید بن ربیعہ الاسود
۲	مشورہ	بنو اسد سے ہر معاملے میں مشورہ لینا ضروری تھا - وہ غالباً سب سے زیادہ سوجھ بوجھ کے لوگ مانے جاتے تھے	..	..

نظام عدل و انصاف

قریش نے امن و انصاف کے قیام کے لئے ایک انجمن یا فیڈریشن بنایا جسے حلف الفضول کہتے تھے - اس کی بناء چار شخصوں نے ڈالی تھی جن کے نام فضل، فضیل، مفضل، فاضل تھے - اور عہد کیا تھا کہ زائرین کعبہ پر کوئی ظلم کرے گا - تو اُس کی

دادرسی کریں گے۔ مرورِ زمانہ سے یہ جماعت ٹوٹ گئی تھی۔ رسُولِ عربیؐ کے بچپن میں آپ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے اسے نئے سرے سے زندہ کیا۔ اور عبداللہ بن جدعان کے گھر میں بنو ہاشم، بنو زہرہ اور بنو تیم بن مرہ کو جمع کر کے عہد لیا کہ جب تک سمندر اور پہاڑ قائم ہیں۔ اس وقت تک ہم مظلوم کی دادرسی کو اپنا فرض سمجھیں گے۔ اس جماعت میں جناب محمدؐ بن عبداللہ بھی شریک تھے۔ اور زمانۂ اسلام میں بھی اس رکنیت پر فخر کرتے تھے۔

رسُولِ عربیؐ کے زمانے میں عدل وانصاف کے دو مخصوص عہدے تھے:۔

نمبر	عہدہ	تفصیل	خاندان	نام عہدہ دار
۱	حکومت	مقدموں کی سماعت اور فیصلہ کر کے جھگڑا چکانا۔	سہم	
۲	اشناق (دیات ومغارم	خون بہا طے کرنا	تیم	عبدالکعبہ (ابوبکرؓ) بن ابی قحافہ

کشمکش حیات کا نتیجہ

عرب جاہلیہ کی زندگی میں اس بات کا بین ثبوت ہے۔ کہ ان کی زندگی کا ہر شعبہ کشمکش حیات کا نتیجہ تھا۔ اُن کی شجاعت، فیاضی۔ جواء شراب، محبّت و نفرت سب کی بنیاد اُن کا مادی ماحول تھا۔ بُت خانے تھے تو تجارت کے لئے مختلف بتخانوں کے حج تھے۔ وہ بھی معاش اور ضروریاتِ زندگی کے حصُول کے لئے۔ لیکن جہاں تک سمجھدار لوگوں کا تعلق تھا وہ جانتے تھے کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ نہ ہبل میں کوئی طاقت ہے۔ نہ لات میں نہ منات میں۔ جاہل اور غریب مزدور، دولتمندوں کا سامانِ تجارت یمن سے شام اور شام سے یمن لاتے لے جاتے ہیں۔ اور مکّہ اس شاہراہ تجارت کے وسط میں واقع ہے۔ جو خشکی کے راستے سے رومی سلطنت کی آسائشوں کا سامان مہیا کرنے کا بہت بڑا راستہ، صراط یا یونانی (Strata) ہے۔ زمزم

سے پانی اور کعبہ کے محافظ پجاریوں (قریش) کی وجہ سے راستوں کا امن قائم ہے۔ اس پڑاؤ پر نئے مزدور بھی مل سکتے ہیں۔ تازہ دم اونٹ بھی، اور قافلہ کے ساتھ امن و حفاظت سے لے جانے والے مسلح آدمی بھی۔ یہ آدمی قریش ہی کے لوگ ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ رسُول عربی کے حقیقی پردادا ہاشم بن عبد المناف نے ۴۶۴-۵۱۰ء میں عرب کے قبائل میں دَورہ کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ چونکہ عربوں کی زندگی کا دار و مدار راستوں کے پُر امن ہونے پر منحصر ہے۔ اس لئے خود اُن کے فائدے کے لئے یہ بہتر ہوگا۔ کہ جن قافلے کے ساتھ عرب کے مقدس ترین شہر مکّہ کے لوگ یعنی قریش ہوں۔ اُن پر حلال مہینوں میں بھی قتل و غارت نہ کی جائے۔ عربوں کی گھٹی میں انتقام اور غارت گری پڑی ہوئی تھی لیکن اُنہوں نے قریش کے تقدس کا خیال کر کے اُن سے صلح جوئی کا وعدہ کر لیا۔ اور یہ قاعدہ بن گیا کہ قریش کے لئے ذی قعدہ، ذی الحجہ۔ محرّم اور رجب کے علاوہ بھی باقی آٹھ مہینے جن میں قتل کرنا حلال تھا۔ حرام ہو گئے۔ ہاشم ہی نے قیصر قسطنطنیہ اور نجاشی حبشہ سے تجارتی معاہدہ کیا تھا اور عرب کے قافلے رومی سلطنت میں رومی شاہراہوں پر (صراطوں) امن و امان سے شام تک آتے جاتے تھے۔ چونکہ ان ممالک میں عرب کے مقابلے میں بہت ہی کم گرمی ہوتی تھی۔ اس لئے یہ سفر عموماً گرمی میں کیا جاتا تھا۔ اسی کو سورۂ قریش میں رحلۃ الصیف یا گرمی کا سفر کہا گیا ہے۔ اس تجارتی معاہدے کا یہ بھی اثر ہوا تھا کہ رومی اور حبشی سلطنتوں کے عیسائی باشندوں سے جو بمقابلہ اہل عرب کے زیادہ متمدن تھے۔ مکّے والوں سے کچھ سوشل تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔

ہاشم کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ تبخانہ کعبہ کی دو اہم خدمتوں کو اپنے چچا عبد الدار کے خاندان سے چھین لیا تھا۔ یہ خدمتیں حج کے زمانے میں حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے سے متعلق تھیں۔ ایک کو سقایہ کہتے تھے اور دوسری کو رفادہ۔ ان دونوں عہدوں سے یہ بھی فائدہ تھا۔ کہ پورے عرب میں ہاشم کے خاندان کی سخاوت کی شہرت بھی ہوتی تھی۔ اور قریش پر ٹیکس لگا کر خاصی آمدنی بھی ہو جاتی تھی۔ ہاشم کا بڑا بھائی المطلب تھا۔ جس نے یمن کے قبیلہ الحمیر سے تجارتی معاہدہ کیا تھا اور

سرویوں کے زمانہ میں قریش کا قافلہ یمن اور حبشہ جاکر فائدہ اُٹھاتا تھا۔ یہی المطلب تھا۔ جو یثرب (مدینہ) جاکر ہاشم کے بیٹے شیبہ (عبدالمطلب) کو مکہ لایا تھا۔ اور جس کے پوتے جناب محمدؐ بن عبداللہ تھے۔

انساب پر سرسری نظر ڈال کر ابُوبکر صدیقؓ نے یہ سمجھ لیا ہوگا۔ کہ محمدؐ عربی کا یہ دعویٰ کہ وہ فرشتے کے ذریعے سے خدائی پیغام حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کے قبیلہ کے اس گروہ کو بہت ناگوار ہوگا۔ جو ہاشم اور مطلب کے زمانے سے ان کے دشمن بن گئے ہیں۔ ہاشم کے مرنے کے بعد سقایہ و رفادہ کا انتظام اُس کے بڑے بھائی المطلب نے لے لیا تھا۔ اور المطلب کے بعد یہ عہدے عبدالمطلب ہی کو ملنا چاہیے تھے۔ لیکن نوفل بن عبد مناف نے جو عبدالمطلب کا سونیلا چچا تھا۔ اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ یہ بنی صعصعہ کی ایک عورت کے پیٹ سے تھا۔ اور المطلب، ہاشم اور عبدشمس عاتکہ سے پیدا ہوئے تھے جو قیس عیلان کے قبیلہ سے تھی۔ (طبری ۲۲)

جس طرح ہاشم نے رومیوں اور خصوصاً عیسائیوں سے دوستانہ معاہدے کر کے قریش کی تجارت کو ترقی دی تھی۔ تقریباً اُسی طرح اور ہاشم کی ضد یا مقابلے میں نوفل نے فارس کے بادشاہ سے عراق، اور فارس میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اور مجوسیوں سے تعلقات بڑھا لئے تھے۔ نوفل کی یہ تو ہمت نہ ہوئی کہ جس طرح عبدالدار کے خاندان سے ہاشم نے سقایہ اور رفادہ چھین لیا تھا۔ اُسی طرح وہ بھی اُن سے حجابہ (خانہ کعبہ کی کلید برداری اور تولیت) یا قیادہ (جنگ میں سرداری کرنا) یا لواء (جنگ کا جھنڈا) چھین لیتا۔ یا کم از کم دار الندوہ (ٹاؤن ہال) ہی پر قبضہ کر لیتا۔ جہاں بیٹھ کر عبدالدار کے خاندان والے مختلف شہری و مذہبی مشورے اور فیصلے کیا کرتے تھے۔ بلکہ اُس نے یہ ہی غنیمت سمجھا۔ کہ ہاشم نے یتیم اور بے سرپرست لڑکے سے اُس کا حق چھین لیا۔ لیکن عبدالمطلب بالکل لاچار نہ تھا۔ اُس کے ماموؤں کا خاندان بنو نجار جو یثرب میں تھا۔ بہت زبردست اور قوی تھا اور انھوں نے آکر نوفل سے زبردستی عبدالمطلب کا حق اسے دلوایا۔ اور قریش کے سامنے یہ معاملہ طے

ہو گیا۔ (طبری ۱۷-۲۱)

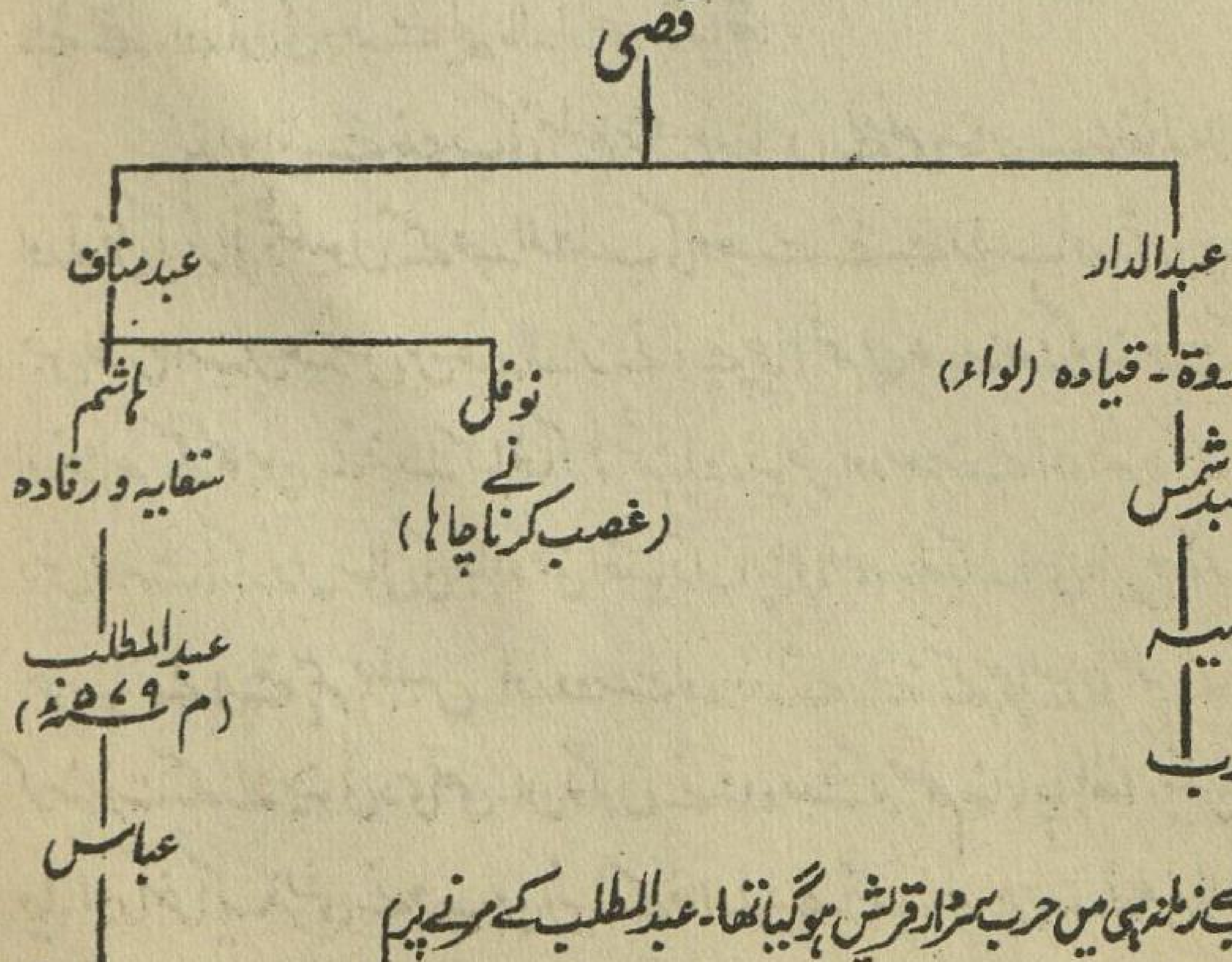
عبدالمطلب کی شہرت میں ایک اتفاقی واقعہ سے چار چاند لگ گئے تھے۔ مکہ میں حاجیوں کی کثرت اور پانی کی قلت ہونے لگی تھی۔ قدیم زمانے میں جب خشکی راستے کی تجارت عروج پر تھی۔ اور رومیوں نے اسکندریہ سے عبور کر کے کلیوپیٹرس (موجودہ سویز) کے قریب سے جہازی تجارت نہ شروع کی تھی۔ بلکہ خشکی ہی کے راستہ مکہ میں پڑاؤ کرتے ہوئے عدن تک جاتے تھے۔ اور وہاں سے جہازوں پر ہندوستان سے مال آتا جاتا تھا۔ اُس وقت کعبہ کے قریب ایک کنواں تھا (پیری پلس صنا۔ ۱۸ سٹرابو کتاب ۱۶ ۔ فارسٹر جغرافیہ عرب جلد دوم ص ۲۸۵) اس کنوئیں کے کھوئے ہوئے مقام کو عبدالمطلب نے خواب میں دیکھ کر ٹھیک اُسی مقام پر کھودا۔ اور اتنا بڑا اور میٹھے پانی کا کنواں تیار ہو گیا۔ جیسا مکہ بھر میں نہ تھا۔ عبدالمطلب کا خاندان بھی بڑھ گیا تھا۔ اس کے دس بیٹے تھے۔ اور اُن کی وجہ سے کچھ مالدار بھی ہو گیا تھا۔

لہذا اعلانیہ نئے مذہب کی تبلیغ شروع کرنا اس لئے بھی مناسب نہ تھا کہ علاوہ بنی عبدالدار اور نوفل کی پرانی دشمنیوں کے عبدالمطلب کی وجہ سے نئے نئے رقیب اور دشمن پیدا ہو چکے تھے۔ جس طرح امیہ بن عبدشمس بن عبدالدار نے اپنے چچا ہاشم بن عبدمناف کو منافرت کے لئے للکارا تھا اور خزاعہ کے کاہن نے فیصلہ کیا تھا کہ ہاشم زیادہ فیاض اور معزز ہے اور شرط کے مطابق اُمیہ کو دس اونٹ ہار کر دس سال کی جلاوطنی اختیار کرنا پڑی تھی۔ ٹھیک اسی طرح اُمیہ کے بیٹے حرب نے اپنے ہم جلیس اور دوست اور دُور کے رشتے کے چچا یعنی ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب کو منافرت کے لئے چنوتی دی تھی۔ ان لوگوں نے شاہ حبشہ کو حکم بنانا چاہا تھا۔ لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اور آخر ایک قریشی نے حرب بن اُمیہ کے خلاف فیصلہ کیا۔ اور حرب نے عبدالمطلب کی صحبت چھوڑ کر عبداللہ بن جُدعان کی صحبت اختیار کر لی۔ اور عبدالمطلب نے اپنی طاقت اس طرح بڑھا

لی کہ بنی خزاعہ کی استدعا پر ان سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ اور دونوں قبیلہ حلیف ہو گئے۔

گو بنو امیہ کو بنو ہاشم سے مکّہ کی حکومت کا کوئی حصّہ نہ مل سکا۔ لیکن حرب بن اُمیہ نے عبدالدار کے خاندان سے کسی نہ کسی طرح قیادہ کا عہدہ لے لیا۔ اس طرح جب کبھی جنگ ہوتی تھی۔ تو یہ لوگ پیش پیش رہتے تھے۔ اسی عہدے کی بنا پر ابو سفیان جنگ اُحد (۳ھ) میں قریش کی فوج کا سردار تھا۔ اس کے علاوہ ۵۷۹ء میں عبدالمطلب کے مرنے کے بعد رفادہ بھی حرب نے لے لیا اور صرف سقایہ خاندان ہاشم میں عباس بن عبدالمطلب کے پاس رہ گیا۔ ذیل کا شجرہ اس خاندانی رقابت کو واضح کر دے گا:۔

عہدوں کا نقشہ



عام الفیل میں یعنی جس سال (سنہ ۵۷۰ء) یمن کے عیسائی گورنر نے بتخانۂ کعبہ کو ڈھانے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ اُس سال کی ایک عجیب یاد لوگوں کے دلوں میں باقی تھی۔ عبد المطلب نے (سنہ ۵۷۰ء) یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ کعبہ کی حفاظت کی قطعی پرواہ نہیں کی۔ بلکہ جب ایک دوست کے ذریعہ سے ابرہہ تک رسائی ہوئی۔ تو اُس نے کعبہ پر حملہ نہ کرنے کے متعلق ایک لفظ التماس تک نہ کہا۔ بلکہ صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی حملہ آور سے درخواست کی۔ ابرہہ کو اس پر تعجب بھی ہُوا۔ کہ ایسا شخص جو بڑی حد تک مکہ کا حاکم ہے۔ اور حاجیوں کی وجہ سے اُس کی شہرت ہے۔ وہ کیوں خاموش ہے۔ تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے۔ لیکن اگر ہاشم کے زمانے سے اس وقت تک کے واقعات ایک تسلسل سے مطالعہ کیے جائیں۔ تو وجہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

(۱) جہاں تک کعبہ کا تعلق تھا۔ عبد المطلب کا یہ قول کہ کعبہ کا ایک رب ہے جو اس کی حفاظت کرے گا۔ تین معنی رکھتا ہے۔ اوّل یہ کہ کعبہ کا سب سے بڑا بُت ہبل رب الکعبہ ہے۔ وہ جانے اور اُس کا کعبہ یعنی عبد المطلب کو اُس بت پرستی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ جہاں تک سقایہ و رفادہ کا تعلق تھا۔ وہ زیادہ تر حج کی تاریخوں سے متعلق تھا۔ ۸ ذی الحجہ کو یوم الترویہ ہوتا تھا۔ یعنی ۱۴ میل عرفات جانے کے لئے جو منزلیں تھیں۔ وہاں چمڑے کے بڑے بڑے تالابوں میں پانی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ مکہ سے باہر اور منا مزدلفہ اور عرفات میں خصوصیت سے پانی اور کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور اگر کعبہ مٹا بھی دیا جاتا۔ تو عرفات کا میدان باقی رہتا۔ اور کعبہ کی چاردیواری بنانا بھی قریش کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

دوم یہ کہ کعبہ کا رب اُس کا متولی ہے۔ جس کے متعلق حجابہ کا کام ہے۔ وہ جانے اور اُس کا قبیلہ بنی عبد الدار۔ اگر کعبہ کے بچانے کے لئے جنگ کی ضرورت ہے۔ تو دار الندوۃ بھی عبد الدار کے خاندان میں ہے۔ اور بنو اُمیہ قیادہ اور لواء پر اتراتے ہیں۔ ہمت ہو تو مشورہ کر کے جنگ کا اعلان کر دیں۔ لیکن عبد المطلب جانتا تھا کہ عبد الدار، نوفل، اور امیہ کے خاندان والوں کے پاس نہ

اتنے آدمی ہیں کہ وہ اس ہاتھی والے لشکر کا مقابلہ کر سکیں۔ نہ بیروں مکہ کے قبائل ہی اُن کے حلیف ہیں کہ اس آڑے وقت میں کام آئیں۔ اگرچہ عرب کے سب قبائل روز روز کی خانہ جنگیوں سے تباہ حال ہو رہے تھے۔

رب کے تیسرے معنی یہ بھی تھے۔ کہ ایک کُل عالم کا پیدا کرنے الارب ہے۔ اور وہی کعبہ کا بھی اصلی رب ہے۔ وہ کافی ہے کہ اُسے بچالے۔

قریش تجارتی لوگ تھے۔ اور ان کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت سینکڑوں سال سے رومی مصری سلطنتوں کے ممالک سے تعلقات رکھتی تھی اور دوسری جماعت عراق اور فارس کے لئے ہندوستان کا مال یمن اور خلیج فارس سے لاکر مہیا کرتی تھی۔ یہ دونوں جماعتیں ایک حد تک ان لوگوں کے تمدن، مذہب اور خیالات سے واقف تھیں۔ عبدالمطلب کی جماعت کا تعلق عیسائیوں سے اور اُمیہ کی جماعت کا تعلق مجوسیوں سے زیادہ تھا۔ لہٰذا ایسی حالت میں کہ ایک عیسائی گورنر عبدالمطلب کی پارٹی کی مخالف جماعت پر حملہ کر رہا تھا۔ تو اُسے کیا غرض تھی کہ اپنی جماعت کو خطرے میں ڈالے۔

(۳) عربوں کی زندگی میں عرب کے جغرافیہ کو بڑا دخل تھا۔ اُن کی تجارت اور لوٹ مار اُن کے میلے اور تہوار سب مختلف قسم کے موسموں کی بنا پر قائم تھے۔ ہزاروں سال کے تجربے نے دنیا والوں کو بتا دیا تھا کہ اگرچہ مہینہ چاند کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ لیکن چاند کا سال سورج کے سال سے گیارہ دن کے قریب چھوٹا ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کی ہر متمدن قوم نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا۔ جس سے دو تین سال کے بعد ایک مہینہ بڑھا کر سورج کے سال کے مطابق کر لیا کریں۔ بابل۔ مصر۔ ہندوستان اور امریکہ کی مایا قوم میں یہ فن اور ستاروں کا علم کمال کو پہنچ چکا تھا۔ عرب والوں نے بھی اپنے میلوں اور سفر کے لئے مختلف موسم مقرر کر لئے تھے۔ اور اس کام کے لئے اُن میں ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ جو قمری مہینے بڑھا کر شمسی سال کے برابر کر دیا کرتی تھی (دوسرے تیسرے سال حج اکبر کے زمانے میں اس کا

اعلان کر دیتی تھی۔ کہ اب کے سال نسی ہوگی یعنی سال کے فلاں مہینے کو بھول جائیں گے کہ وہ ہوا ہی نہیں۔ بلکہ نیا سال صفر سے شروع کریں گے اور اُسی کو سال کا پہلا مہینہ یا محرم سمجھیں گے۔

مکّہ کی قدیم تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قریش کے باپ داد امَعد بن عدنان کی اولاد میں سے تھے۔ تیسری صدی عیسوی کی ابتدا تک مکّہ پر جنوبی عرب کا ایک قبیلہ بنی جرہم قابض تھا۔ سنہ ۲۰۶ء کے قریب قبیلہ خزاعہ نے قریش سے مل کر بنی جرہم کو مکّہ سے نکال دیا۔ لیکن پھر بھی قریش کو مکّہ کے مشہور مندر کعبہ کی نہ تو تولیت ملی نہ مکہ کی حکومت میں کوئی اچھّا حصّہ ملا۔ عمرو بن لحی نے جو بنو خزاعہ کا سردار تھا۔ حکومت اور کعبہ پر قبضہ کر لیا اور معد بن عدنان کو تین معمولی عہدے مل گئے:-

(۱) اجازہ۔ یعنی جب حاجی حج کر چکیں اور میدان عرفات سے مزدلفہ کی طرف شام کے وقت واپس آنا چاہیں۔ تو جب تک اس کی اجازت معد نہ دے۔ اُس وقت تک وہ وہاں سے نہیں روانہ ہو سکتے۔

(۲) افاضہ:- رات بھر حاجی مزدلفہ میں رہتے تھے۔ (جیسا کہ اب بھی رہتے ہیں)۔ اور صبح سویرے اُن کا ایک عظیم الشان جلوس منا کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ اس جلوس کے آگے آگے ایک مکّی سردار کی سواری ہوتی تھی۔ اور سب منا میں آکر قربانی کرتے اور میلہ لگتا۔ تجارت کا بازار گرم ہوتا اور گانے بجانے۔ شراب پینے اور شام یا ایران کی طرف سفر کرنے کی تیاری کا خوشگوار زمانہ آجاتا۔ اس جلوس کی سربراہی کا حق گویا ایک دن کی بادشاہی "افاضہ" کہلاتی تھی۔

نسائت القلمس (قلندس) منیٰ ہی میں یہ اعلان ہوتا تھا کہ بابل و ایران و ہندوستان کے نجومیوں کے حساب سے قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے ایک قمری مہینہ بڑھایا جائے گا۔ یہاں یہ چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ کہ عرب کے قبائل کا براہ راست ہندوستان۔ ایران۔ روما، مصر اور بابل سے تعلق تھا۔ غالباً یہ تعلق مسیح سے دو تین ہزار سال پہلے سے قائم تھا۔ اس لئے

کہ ہندوستان میں وادی سندھ اور پنجاب (موہنجو دارو اور ہڑپا) کا تمدن ویسا ہی ہے۔ جیساکہ اس زمانے میں یمن اور بابل میں تھا۔ وہی مہریں، وہی حمام اور مٹی کے برتن پتھر کے ہتھیار اور کپڑے جو ایک جگہ ملے ہیں۔ ویسے ہی دوسری جگہ بھی پائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ حج کے موسم میں اعلان حج کے بعد ہوتا تھا۔ اور اس کا فیصلہ مکہ کے وہ نجومی کرتے تھے جن کے متعلق موسموں کے درست رکھنے کا منصب تھا۔ یہ لوگ نسی کرنیوالے کہلاتے تھے۔ اور بعض حلال مہینوں کو حرام اور حرام مہینوں کو حلال کرنے پر مجبور تھے یہ عہدہ بھی معد بن عدنان کی اولاد کو شروع زمانے سے حاصل ہو گیا تھا۔

لیکن مہینوں کو حلال یا حرام کرنے میں اس عہدہ دار کو یہ اختیار تھا کہ اپنی اور پارٹی کی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر چاہے تو سال کے پہلے صفر کو حلال کردے۔ یا دوسرے صفر کو۔ یعنی تیسرے سال جب قمری سال بمقابلہ شمسی سال کے چھوٹا ہو جاتا تھا۔ تو محرم کے بعد بجائے ایک صفر کے دو صفر فرض کر لیتا تھا۔ اور اُن میں سے جس کسی کو چاہتا تھا حلال کر دیتا تھا۔ گویا ایک مہینہ بڑھانے کا اُسے اختیار تھا۔

واقعہ فیل اور نسأت کے معاملہ میں ابن ہشام لکھتا ہے (سیرت جز اوّل۔ امر الفیل وقصہ النسأۃ)

"جاہلیہ میں مہینوں کو نسی کرتے تھے اور حرام مہینوں میں سے ایک مہینہ حلال کر دیتے تھے۔ اور اُس کی جگہ حلال مہینوں میں سے ایک مہینہ حرام کر دیتے تھے۔ اور اس مہینہ کو مؤخر کر دیتے تھے۔ سب سے پہلے جس نے عرب میں نسی شروع کی وہ القلمس تھا ...... جب اسلام قائم ہوا۔ تو بنی فقیم بن عدی کنانی کی نسل سے جنادہ بن عوف قلمس تھا۔ حج کے بعد لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ تو وہ آیندہ سال کے) چار حرام مہینہ بتاتا تھا۔ لیکن جب ان میں سے کسی مہینہ کو حلال کرنا چاہتا تھا۔ تو ایک صفر کو حلال کر دیتا تھا۔ اور اُس کی جگہ دوسرے صفر کو حرام کر دیتا تھا۔ اور کھڑے ہو کر اعلان کرتا۔ کہ اَللّٰھُمَّ انّی قد احللت لہم احد الصفرین الصفر الاوّل و نسأت الاٰخر للعام المقبل۔

(اے اللہ میں نے دو صفروں میں سے پہلا صفر اُن پر حلال کر دیا ہے۔ اور دوسرے صفر کو آیندہ سال کے لئے نسی کر دیا ہے)

(ابن ہشام) اس کا یہ مطلب ہوا کہ نئے سال میں وہ صفر قرار دیتا تھا۔ اور ان میں سے دوسرے کو نسی کر دیتا تھا۔ یعنی سال میں ایک صفر بڑھا دیتا تھا۔

غرضیکہ اس قبیلہ کے ایک شخص نے جو یمن میں تھا۔ یہ سنا کہ ابرہہ الاشرم اپنے گرجے کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے کعبہ کو گرا دینا چاہتا ہے۔ اسے یہ بات ناگوار ہوئی۔ اس لئے کہ کعبہ کے عہدوں میں سے ایک اس کے قبیلہ کے پاس تھا۔ اس نے کنیسہ کی مقدس جگہ کو ناپاک کر دیا۔ اور ابرہہ نے کعبہ پر لشکر کشی کر دی۔ یہ قبیلہ جس کے پاس عہدۂ نسا اُت تھا۔ عبد المطلب کے قبیلہ کا دوست نہ تھا۔ اس کے تعلقات بنو ہاشم کے مخالفوں سے زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ قریش میں سے بھی نہیں تھا۔ بلکہ فہر قریش کے پردادا کنانہ کے ایک بیٹے کی نسل سے تھا۔ بنو فقیم کا پیشہ علمی تھا اور جاہل عرب مجبور تھے۔ کہ کوئی ایسا موسموں اور ستاروں کا ماہر ہو کہ اُن کی جنتری درست کرتا رہے۔ لہٰذا اقلمس مطمئن تھا۔ کہ جب تک حج اور تجارتی ضروریات قائم ہیں۔ اُن کا پیشہ بھی باقی ہے۔ لیکن غالباً عبد المطلب کی پارٹی اس اہم عہدے پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ اُس نے کعبہ کے بچانے کے لئے ایک انگلی بھی نہ ہلائی۔

پانچویں فصل

نوروز اور بسی

قدیم اقوام میں سال کا پہلا دن نوروز کہلاتا تھا۔ سرد ملکوں میں برف پگھلنے لگتی تھی۔ اور ہر طرف پھولوں کی مہک۔ سبزے کے نمو اور چڑیوں کے چہچے جنت نگاہ اور فردوس گوش بن جاتے تھے زراعتی زندگی کا ماحصل آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان، وحوش و طیور سب بسنتی رنگ میں شرابور ہیں۔ اور بہار کے ترانے گا رہے ہیں۔

نوروز یعنی بہار کا پہلا دن، اُس روز شروع ہوتا ہے۔ جب کہ آفتاب نقطۂ اعتدال پر آ جاتا ہے۔ اور برج حمل (ARIES) میں داخل ہوتا ہے۔ تیغ فرو دین ملک خزاں کو متاصل کر دیتی ہے۔ اور خورشید خُور سوریہ، سوال (Sol) روی ارب، یارا ہر چیز کو نئی زندگی اور تابندگی بخشتا ہے۔ عرب اسے ربیع کہتے ہیں۔ اور زمانۂ جاہلیہ میں اسی موسم میں حج کرتے تھے۔ پھر منیٰ اور عکاظ میں میلے لگتے تھے۔ بہاریہ قصیدے۔ تفریحیں (قمار بازی و مے پرستی)، اور تجارت، ہر طرف چہل پہل پیدا کر دیتے تھے۔ ایران میں بہار کی تعریف ہر شاعر کی زبان پر جاری ہو جاتی تھی۔ اور گل و بلبل۔ نغمہ و چنگ ساقی و بادہ کی سرمستیوں سے ہر شاہ و گدا پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہندوستان کے آریہ بسنت رُت کے گیت ہولی کی پُرجوش دھنوں میں گاتے تھے۔ اور ہوری (ہوری۔ خوری۔ حار

حرارت، سوریہ، سُورج یعنی گرم موسم کی ابتدا، اگنی، سُورج اور پانی کی پرستش سے شروع کرتے تھے تعجب کی بات نہیں۔ اگر ایران سے ہندوستان تک "آب ریختن اور آتش افروختن" کی رسم "آتش و آب" کی الوہیت و جان بخش اہمیت کو نمایاں کرتی تھی۔ اور سب قومیں خواہ وہ سامی ہوں یا ایرانی آگ ہی کے ذریعے سے اپنی سوختنی قربانیوں کو دیوتاؤں تک پہنچاتی تھیں۔

بابل کا نوروز

سامی اقوام میں بابل کی سلطنت نہایت قدیم مانی جاتی ہے۔ ان کے ہزاروں دیوتا تھے۔ لیکن اجرام سماوی کو خاص رتبہ حاصل تھا۔ سوریہ یا خورشید بابل والوں میں شمس کہا جاتا تھا۔ وہ آسمان و زمین کا قاضی (جج) تھا۔ اشتر (زہرہ) آسمان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ اور اجرام فلکی کے مشاہدے کے لئے اونچے اونچے مندر بنائے جاتے تھے۔ جہاں آگ کے ذریعے سے قربانی کی خوشبوؤں کو آسمان کے دیوتاؤں تک پہنچایا جاتا تھا۔

بابل کے بادشاہوں کے پہلے خاندان نے (سنہ میں) جو جنتری کل شہروں کے لئے جاری کی تھی۔ اسے اشوریہ والوں نے مسیح سے ایک ہزار سال پہلے قبول کر لیا تھا۔ اور جب یہودی بابل سے فلسطین واپس آنے پائے۔ تو وہ اپنی جلاوطنی کے زمانے میں بابل کی جنتری کا استعمال سیکھ چکے تھے۔

مسیح سے دو ہزار سال پہلے (یعنی حضرت ابراہیم کے زمانے میں) بابل کا مہینہ چاند دیکھ کر شروع ہوتا تھا۔ اور عربوں کی طرح ان کا دن رات کے پہلے گھنٹے سے شروع ہوتا تھا۔ انہوں نے قمری سال کو شمسی سال سے مطابق کرنے کے لئے اپنے چھٹے مہینے الی ولو (ایلول) کے بعد یا آخری مہینے اِد دا رو (آذر) کے بعد ایک اور ایلول یا آذر بڑھانے کا قاعدہ مقرر کر لیا تھا۔ ۳۸۲ قبل مسیح میں یہ مہینہ مقررہ اوقات پر بڑھایا جاتا تھا۔ لیکن داریوش کے زمانے میں کسی مقررہ دَور کا تعین نہ تھا۔ البتہ نجومی کہتے تھے کہ ان کا بڑھایا جانا ضروری ہے۔

اہلِ بابل سامی نسل سے تھے۔ ان کے سال کا پہلا مہینہ بہار (۲۱ مارچ) سے شروع ہوتا تھا چونکہ یہ قوم بُت اور کواکب پرست تھی۔ لہٰذا ان کا یہ مہینہ قربانی کے لئے مخصوص تھا۔ اس مہینے کا نام بھی نی سانو (نلسان) یا "قربانی کا وقت" تھا۔ سمیریوں کا یہی مہینہ اعتکاف یا عبادت میں بیٹھنے (ذی قعدہ) کا مہینہ کہلاتا تھا۔ عرب بھی سامی ہیں۔ اور بہت ممکن ہے ذی الحجہ (عبادت کا مہینہ) اور ذی القعدہ (بیٹھنے کا مہینہ) سے مندرجہ بالا مہینوں سے کوئی تعلق رہا ہو۔ حضرت ابراہیم بھی بابل کے قریب خالدیہ کے شہر اُر کے رہنے والے تھے۔ اور انہوں نے اپنی اولاد بنی اسرائیل اور بنو اسماعیل کو جو تقویم بتائی ہو گی۔ وہ غالباً بابلی ہی تھی۔ جسے اسرائیلی اپنی مصری جلاوطنی میں بھول گئے۔ اور اسماعیلی جو کبھی غلام نہیں ہوئے اسی تقویم پر قائم رہے۔ آشوری قوم اسے فال دیکھنے کا مہینہ کہتی تھی۔ اور یہودی بھی فصل کی تیاری کے موقع پر اسی نیسان کی ۱۵ سے ۲۲ تک کی تاریخوں میں عید گزران (PASSOVER) کا تہوار مناتے تھے۔

"بابلیوں کے مہینوں کے نام عک عادی زبان سے لئے گئے ہیں۔ یہ نام غالباً بابل ہی میں بنے تھے"۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانکا۔ کلنڈر) اسی لئے یہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ سامی زبانیں بولنے والوں کو یہ نام اُس وقت سے پہلے معلوم تھے۔ جب کہ وہ وادیٔ فرات (عراق یا بابل) میں داخل ہوئے۔ اور چونکہ اُن میں کبیسہ (سال میں مہینہ بڑھا کر اُسے شمسی سال کے سطابق کرنے) کا رواج تھا۔ اسی لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ عرب بھی کبیسہ سے واقف تھے۔

قدیم مصری نوروز

مصر کی زراعت و تجارت کا مدار دریائے نیل کی طغیانی پر تھا۔ اور اسی لئے انہیں نہ تو بارش کی احتیاج تھی۔ نہ بادل اُدھر متوجہ ہوتے تھے۔ اُن کا آسمان ہمیشہ صاف رہتا تھا اور ستاروں بھری راتوں نے انہیں یہ بتا دیا تھا کہ طغیانی کی ابتدا اُس وقت ہوتی ہے۔ جب ستارۂ شعری (Sirius) سورج (را) کے نکلنے سے ذرا پہلے

طلوع ہو۔ اس ستارے کے نکلتے ہی طغیانی کی آمد آمد شروع ہو جاتی تھی۔ اور سارے مصر میں خوشی کی لہریں دوڑ جاتی تھیں۔

مصر قدیم میں بھی قمری مہینے رائج تھے۔ لیکن بعد کے زمانے میں شمسی سال کا رواج ہو گیا تھا۔

ایرانی نوروز

ایران میں جشن نوروز کو جشن جمشیدی کہتے تھے۔ جشن وہی لفظ ہے۔ جو سنسکرت میں "یرشن"۔ "یجنا" یا "یگ" ہے۔ اور دونوں زبانوں میں عبادت یا قربانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ وہ سال تو جشن نوروز کے دن سے شروع کرتے تھے۔ یہ مہینہ فروردین ہوتا تھا۔

الوسی البغدادی کا قول ہے کہ "قیصر آگسٹس کے زمانے تک عربی و فارسی سال ایک دوسرے سے مطابق تھے لیکن ذوالقرنین کے ۲۰۸۰ سال ۴۰ دن بعد ہر سال میں ¼ (چوتھائی) دن بڑھایا جانے لگا۔" (بلوغ الادب فی معرفۃ احوال العرب)

یورپ نے رومہ (روم) سے ماہ و سال سیکھے ہیں۔ رومہ میں جولیس قیصر نے ۴۶ ق م میں شمسی سال جاری کیا ہے۔ اس سے پہلے وہاں قمری سال تھا۔ اور لوند کا مہینہ بڑھانے کا بھی دستور تھا جنتری بتانے کا کام مذہبی جماعت (Pontifex) کیا کرتی تھی۔ لیکن چونکہ یہ لوگ رشوت لیکر اپنے خاص آدمیوں کی امارت (PRO-CONSULATE) کی میعاد بڑھانے کے لوند کے مہینے کا بیجا استعمال کرنے سے تھے۔ اس لئے جولیس قیصر نے ۴۶ ق م میں ¼۳۶۵ دن کا شمسی سال جاری کیا۔

ایران میں جشن جمشیدی کے علاوہ نصف سال ختم ہونے کے بعد ساتویں مہینے کے شروع میں بھی ایک جشن (یوم عبادت) منایا جاتا تھا۔ یہ مہینہ ستمبر میں ہوتا تھا۔ ابوریحان بیرونی (۳۶۲-۴۴۰ھ) آثار الباقیہ (ص ۲۳۴) میں لکھتا ہے کہ "ہفتمین ماہ (زروزرتشیان) نامش مہر است بہ فغکان نخستین روز

ایں ماہ نزد آنان جشنے است نام روبہ نیم سردہ معنیٔ آن نیمۂ سال باشد" بیرونی کے اس بیان کی تائید کتبۂ بیستون سے ہوتی ہے۔ جو داریوش (۴۸۵-۵۲۱ ق م) نے لکھوایا تھا۔ اس میں دہم باگ یادی یعنی ۲۹ ستمبر ۵۲۲ ق-م کا ذکر ہے۔ یہ مہینہ باگ (یعنی بغ دیوتا) کی یاد سے شروع ہوتا تھا۔ اسی میں جشن مہرگان ہوتا تھا۔ زرتشتی دینی تقویم میں باگیادی کو ماہ مہر کہتے ہیں۔ اسی نوروز مہرگان میں ساسانیوں کے زمانے میں ہدیے قبول کئے جاتے تھے۔ صولی لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے نوروز مہرگان میں (حضرت) عمرؓ کے زمانے میں کوئی ہدیے قبول نہیں کئے۔ لیکن سب سے پہلے ولید بن عقبہ نے پھر سعید بن عاص نے ہدیے لینا شروع کئے لوگوں نے (حضرت) عثمانؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے اس فعل کو روک دیا۔ (امیر) معاویہ کے زمانے میں یہ ہدیے پانچ کروڑ درہم کے قریب ہوتے تھے۔ (حضرت) ابن زبیر کے وقت میں یہ رقم صرف دو کروڑ درہم تھی۔ (خلیفہ) عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں چھ کروڑ درہم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس رسم کو موقوف کر دیا تھا۔ لیکن خلیفہ سفّاح عباسی کے زمانے میں پھر رائج ہو گئی" (ادب الکتاب ص ۲۱۹)

عجیب بات یہ ہے کہ عرب میں بھی (گو یہ سامی النسل ہیں) یہ رسم تھی (اور اب بھی ہے) کہ سال کا ساتواں مہینہ مقدس (حرام) قرار دیا گیا تھا۔ یعنی اس مہینے میں قتال حرام تھی۔ اور لوگ عمرہ کے لیے بیت اللہ کو آنے جانے میں آزاد تھے۔ اور اس مہینے میں جشن (عبادت و قربانی) کیا کرتے تھے اسلام نے بھی اس مہینے کو، جو ستمبر میں ہوا کرتا تھا۔ حرام یا مقدس باقی رکھا ہے۔ گو نسی کے نہ ہونے سے یہ مہینہ اب مقررہ وقت (ستمبر) پر نہیں آتا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ بابل میں نیا سال تیشری نم (ستمبر) سے شروع ہوا کرتا تھا۔ گویا عربوں کا رجب (ساتواں مقدس مہینہ) اور بابلیوں کا ساتواں مہینہ ایک ہی تھا۔ یہودی جنتری میں بھی یہ مہینہ ساتواں ہی مہینہ ہے لیکن انہوں نے فلسطین واپس آ کر اپنا نیا سال بہار (نیسان) سے شروع کر

دیا تھا۔ (خروج ۱۲ب۔۲)۔

یہودی نوروز

جب تک بنو اسرائیل مصر میں رہے وہ غلامی کی وجہ سے مصری سال و ماہ کے پابند تھے۔ ان کا پہلا مہینہ امبیب تھا۔ تورات میں صرف تین مہینوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ پہلا مہینہ ابیب (نیسان)، دوسرا مہینہ زیف (ایارو) اور ساتواں مہینہ بُل (تشری تم) کہا جاتا تھا۔ جب مصری غلامی سے نجات ملی اور فلسطین آئے۔ تو ان میں وہی رسم جاری رہی مہینہ چاند سے شروع ہوتا تھا اور اُسے شمسی سال کے مطابق کر لیتے تھے۔ "مشتع"۔ (فقہ یہود) من کبیبہ کا ذکر ہے یہ اُنھوں نے بابل کے جلاوطنی کے زمانے میں بابلیوں سے سیکھی ہوگی۔ اس لئے کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ اپنے مہینوں کے قدیم نام بھول چکے تھے۔ اور بابلی نام اختیار کر چکے تھے۔ وہ نام یہ ہیں۔ سال تو نیسان کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا تھا:۔

(۱) نیسان (قربانی)۔ (۲) ایارو (پھول)۔ (۳) سی دن (مقررہ وقت، غالباً کسی تہوار کا)۔ (۴) تم موز۔ (۵) آب۔ (۶) ایل لول۔ (۷) تشری۔ (۸) مرخش وان (آٹھواں مہینہ)۔ (۹) کس لو۔ (۱۰) تے بث (۱۱) شے بت (۱۲) آذر یہ نام عکادی زبان کے ہیں ممکن ہے کہ یہ نام بابل میں پیدا ہوگئے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سامی نسل کے لوگ بابل میں داخل ہونے سے پہلے انہیں جانتے ہوں۔ چونکہ اعتدال ربیع (VERNAL EQUINOX) ۲۱ مارچ کو ہوتا ہے۔ اسی دن یا اس کے بعد یہودی مہینے نیسان کی چودھویں تاریخ ہونا چاہئے۔ اسی دن عید گزران کی رسم مصری غلامی سے نجات کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔

مسیحی اس تہوار کو ایسٹر کہتے ہیں۔ ان میں دو فرقے ہوگئے تھے۔ ایک فرقہ اتوار کے دن ایسٹر منانا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرا فرقہ نیسان کی چودھویں تاریخ کا حامی تھا۔ خواہ وہ کسی دن پڑے۔ پہلا فرقہ اکثریت میں تھا۔ لہٰذا اقلیت کو کافر قرار دیا گیا۔ پھر ۳۲۵ء میں کونسل آف نیس (NICE) نے حکم دیا۔ کہ ایسٹر کا تہوار ۲۱ مارچ کے بعد جو بدر ہو، اُس کے بعد پہلے اتوار کو منانا چاہئے۔ اور اگر بدر

اتوار کو ہو، تو آیندہ اتوار کو یہ تہوار منایا جائے۔

۷۰ء میں یروشلام (دار السلام) کو رومیوں نے فتح کر لیا۔ اس سے پہلے یہودی ربّی جنتری بنایا کرتے تھے۔ چاند دیکھنے والے مقرر تھے۔ اور وہ آکر شہادت رویت دیا کرتے تھے۔ پھر یہ کام سین ہڈرن (Sanhedrin) کو منتقل ہو گیا۔ اور آخر کار یہ اختیار بطریق اعظم (PART RI ACH) نے سلب کر لیا۔ کبیسہ کے لئے جب کبھی ضرورت ہوتی تھی۔ تو ایک اور آذر بڑھا دیا جاتا تھا۔ تاکہ عید گذران کے موقع پر کاشتکار اپنی فصلیں کاٹ سکیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مشاہدہ ہلال کی بجائے حساب سے کام چلنے لگا۔ پھر عراق کے یہودیوں نے اپنی جنتری چلانا چاہی لیکن فلسطین کے یہودیوں کی بات اوپر رہی۔ آخر کار چوتھی صدی میں بابل کو جنتری بنانے کا اختیار حاصل ہو گیا۔

اشوری اور سمیری نوروز

آشوریوں کا پہلا مہینہ بہار میں شروع ہوتا تھا۔ اس مہینے میں نوروز کو ایک تہوار ہوتا تھا جس میں فال کھولا کرتے تھے۔ شمیری نوروز بھی بہار سے متعلق تھا۔ اور اسے وہ اعتکاف یا عبادت میں بیٹھنے کا مہینہ کہتے تھے۔ آشوریہ میں مختلف قسم کی جنتریاں رائج تھیں۔ اسی طرح ایلامیوں کی تقویم بھی مخصوص تھی۔

ہندو نوروز

ہندوؤں کا نوروز ۲۱ مارچ (چیت) کو ہوتا ہے۔ اور ہر تیسرے سال یا جب ضرورت ہو۔ ایک لوند کا مہینہ، قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے بڑھایا جاتا ہے۔ یہ کام جوتشی برہمن کرتے ہیں۔ جنتری بنانا ان ہی کے اختیار میں ہے۔ ہندو اپنے اپنے سال کو چھ فصلوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جو دو دو مہینوں پر مشتمل ہیں:۔ (۱) بسنت (پھاگن چیت) (۲) گرشم (گرما۔ بیساکھ۔ جیٹھ)۔ (۳) ورشا (بارش۔ اساڑھ۔ ساون)۔ (۴) ہیم انت (ہیم برف انت، ختم) بھادوں۔ کنوار۔ (۵) شرد۔ سردی (کاتک۔ اگھن۔ (۶) ششی شیر (سخت سردی۔ ٹھٹھرنے کا وقت) پوس، ماگھ)

مہینے کا پہلا دن شنکرانت کہلاتا ہے۔ پنجاب، بہار اور ہندوستان (یو۔پی) میں بدر کی رات کو مہینہ ختم ہو کر دوسرے دن نیا مہینہ شروع ہوتا ہے لیکن مرہٹوں کے ملک میں ہلال نو کے دوسرے دن مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے۔

بہار کا موسم جو دو مہینوں کا مانا جاتا ہے۔ نوروز گرما یعنی ہولی پر ختم ہوتا ہے۔ اور ایرانیوں، بابلیوں اور عربوں کی طرح جشن نوسردہ۔ سردی کے شروع میں مختلف ناموں سے منایا جاتا ہے ہندوستان (یو۔پی) میں اُسے دسہرہ کہتے ہیں اور بنگال میں درگا پُوجا یعنی درگا دیوی کی پرستش کا تہوار کہا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے دنوں کے نام، یورپ کے ناموں کی طرح مختلف سیاروں کے ناموں پر ہیں مثلاً اتوار (سورج کا دن)۔ سوموار (چاند کا دن)۔ منگل (مریخ Mars)۔ بدھ (عطارد Mercury)۔ برہسپت (مشتری Jupiter) شکر (زہرہ Venus) شنیچر (زحل Saturn)

عربی زبان میں شمس و قمر کے علاوہ دیگر پانچ سیاروں کو خُنّس کہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ان کے خاص خاص اثرات بتائے جاتے ہیں۔ اور ہر مخلوق کی قسمت ان سے وابستہ سمجھی جاتی ہے۔

ایران قدیم ہر روز کسی نہ کسی فرشتے کے نام پر ہوتا تھا۔ اور آسمانی بادشاہت میں شمس و قمر وغیرہ کے مختلف عہدے مقرّر تھے۔

عربی نوروز قدیم زمانے میں عرب کے اندر قمری مہینے اور شمسی سال رائج تھے۔ جب یہی لوگ یمن سے ہجرت کر کے بابل میں آباد ہوئے تو وہ ستاروں، سیاروں اور ان کے موسمی اثرات سے واقف تھے۔ اسی لئے بابلیوں کے مذہب میں کواکب پرستی بھی داخل تھی۔ اور اسلام سے پہلے عربوں میں بھی رائج رہی۔

عرب میں اعتدال ربیعی (۲۱۔ مارچ) کے قریب قریب نوروز ہُوا کرتا تھا۔ قمری مہینوں میں عموماً ایک مہینہ ۲۹ اور دوسرا ۳۰ دن کا ہُوا کرتا ہے۔ اس لئے عربوں کا سال صرف ۳۵۴ دنوں

کا ہوتا تھا۔ اور شمسی سال سے ۱۱ ۱/۴ دن چھوٹا ہوتا تھا۔ اسی لئے ہر تیسرے سال تقریباً ۳۴ دن پیچھے ہو جاتا تھا۔

جہاں جہاں قمری سال رائج تھا۔ وہاں کے لوگوں نے چند ہی سال کے تجربے سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ قمری مہینوں کے اعتبار سے مختلف فصلوں کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے عرب میں جہاں حج کے لئے خصوصیت سے ایک معتدل موسم کی ضرورت تھی۔ ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ جو قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لئے ایک مہینہ کبھی کبھی بڑھا دیا کرے۔

ابن ہشام کہتا ہے کہ مکہ میں بنو کنانہ کے قبیلے میں اس فن کے جاننے والے موجود تھے۔ اور وہ قلمس یا قلمبس (CALENDUS) کہلاتے تھے۔ اور اسی جماعت کے لوگ موسم پر نظر رکھنے کے بعد جب ضرورت ہوتی تھی۔ حج کے موقعہ پر اعلان کر دیا کرتے تھے۔ کہ آئندہ سال محرم کے بعد دو صفر مانے جائیں گے۔ ان میں سے ایک صفر ماہ حلال سمجھا جائے گا۔ اور دوسرا احرام قلمبس کو یہ اختیار تھا کہ جس صفر کو چاہے حلال قرار دے۔ اور جس صفر کو چاہے حرام بنا دے۔

اس کے علاوہ عربوں کی زندگی کا گہرا تعلق شمس و قمر، نجوم و کواکب پر تھا۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے راتوں سے دنوں کا کام لیا جاتا تھا۔ سوشل زندگی کے علاوہ سفر اور سفر کی غایت تجارت بھی رات ہی کی محتاج تھی۔ چاند تارے بحر و بر میں مسافروں کے راہنما تھے۔ بے آب و گیاہ ریگستان اور سمندر کی وسعتیں ستاروں کے علاوہ اور کس چیز کو نشان راہ بنا سکتی ہیں۔ زحل سب سے بلند سیارہ تھا۔ اور اسی پاسبان فلک یا کیوان کے نام سے اُنہوں نے اپنے سب سے بڑے معبد (کعبہ) کو منسوب کر رکھا تھا۔

شعریٰ یمانی (SIRIUS) مصریوں ہی کا نہیں۔ عربوں کا بھی مشہور سیارہ ہے۔ اہل عرب اس کی بھی پرستش کرتے تھے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ان ہی قبائل کے متعلق ابن قتیبہ نے لکھا ہے۔ کہ حمیر، کنانہ، بنی حرث و کعب اور کندہ پر یہودیت کا اثر تھا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بابل کی قید کی

وجہ سے ان یہودیوں میں بابلی ستارہ پرستی اور نوروز بابلی کے خیالات و مراسم عام تھے۔ اسی طرح بنو تمیم پر ایران کا اثر تھا۔ ان میں آتش پرستی رائج تھی۔ اور وہ ایرانی نوروز مناتے تھے۔ قاضی صاعد بن احمد اندلسی نے طبقات الامم میں بتایا ہے کہ قبیلۂ حمیر سورج کی، بنو کنانہ چاند کی، بنو تمیم ستارہ دبران کی۔ لخم و جذام مشتری کی۔ طی سہیل کی اور اسد عطارد کی پرستش کرتے تھے۔

غرضیکہ جب حجاج میدان عرفات سے حج کر کے منیٰ کے مقام پر پڑاؤ ڈالتے تھے۔ اور قربانیوں کی دعوتوں کے علاوہ تجارتی کاروبار بھی گرم ہوتا تھا۔ تو بنو کنانہ کا ایک شخص کھڑے ہو کر کہتا تھا:۔

"میں ایسا شخص ہوں جس پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا۔ اور نہ میری بات کو کوئی رد کر سکتا ہے"۔ لوگ کہتے کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے ایک مہینہ نسی کر دیجئے"۔ (الخضری۔ محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۱۔ ص ۸۷)

ابن ہشام اپنی سیرت میں کہتا ہے:"نساۃ وہ لوگ ہوتے تھے۔ جو جاہلیہ میں عربوں پر مہینے نسی کیا کرتے تھے۔ وہ حرام مہینوں کو اشہر حرم میں حلال، اور اس کی جگہ حلال مہینے کو حرام کر دیتے تھے۔ اور اس مہینے کو پیچھے ڈال دیتے تھے۔ اور اس طرح چار (احرام) مہینے پورے کر دیتے تھے"۔

ناسی کہتا تھا:۔

اللّٰھُمَّ انی قد احللت لھم احد الصفرین الصفر الاول ونسأت الاخر للعام المقبل۔ (ابن ہشام سیرت۔ امر الفیل وقصہ نسأۃ)	اے اللہ میں ان لوگوں کے لئے دو صفروں میں سے پہلے صفر کو حلال کرتا ہوں، اور دوسرے صفر کو آئندہ سال کے لئے نسی کرتا ہوں۔

لغت لسان العرب میں "نسی" کے معنی ہیں: تاجیل تاخیر، یا بعد من الدینا۔ غالباً یہ معنی ابن ہشام کے قول (مندرجہ بالا) "اس مہینے کو مؤخر کر دیتے تھے" سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن مؤخر کر دینے کی دو صورتیں

ہیں۔ ایک تو یہ کہ صفر کو محرم کر دیں۔ دوسرے یہ کہ محرم تو قائم رہے لیکن دو صفر قرار دیے جائیں۔ اور ان میں سے ایک کو حلال قرار دیں۔ اور دوسرے کو حرام۔ اور ان دونوں صفروں میں سے جس کو چاہیں مقدم کریں اور جسے چاہیں مؤخر۔ ابن ہشام کا قول دوسری صورت کو بتاتا ہے۔ یعنی محرم کے بعد دو صفر قرار دیے جاتے تھے۔ اور ان میں سے ایک نسی ہوتا تھا۔ اس طرح نسی کرنا، کبس "یا لوند کا مہینہ بڑھانے کا مترادف ہو جاتا ہے۔

نسی کی غرض بھی یہی تھی۔ قمری سال میں جب ضرورت ہو۔ ایک مہینہ بڑھا کر شمسی سال کے مطابق کر دیا جائے۔ اسی لئے ابن ہشام مندرجہ بالا قول کے آگے قرآن کی آیت (انما النسئ زیادۃ" فی الکفر) نقل کر کے (لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ) میں لواطئوا کے معنی یوافقوا بتاتا ہے یعنی نسی کرنے والے ایک مہینہ بڑھا دیتے ہیں۔ تاکہ مواطات، موافقت یا مطابقت پیدا کریں۔ یعنی مہینوں کی تعداد تو بارہ ہی رہے۔ لیکن قمری سال شمسی سال کے ساتھ مواطات یا موافقت کرنے لگے۔ یہ بات صرف اسی طرح ممکن تھی کہ ضرورت پر ایک مہینہ بڑھا دیا جائے۔

عربوں میں چار مہینے حرام (یا مقدس) مانے جاتے تھے۔ یعنی سال کا پہلا مہینہ محرم۔ ساتواں مہینہ رجب (بہ معنی بزرگ یا بیچ کی انگلی) اور گیارھواں مہینہ ذی القعدہ اور بارھواں مہینہ ذی الحجہ سال کے آخری مہینے میں حج ہوا کرتا تھا۔ اور حج کے بعد دو تین دن منیٰ میں میلہ لگتا تھا۔ پھر سب لوگ عکاظ کے میلے میں جمع ہوتے تھے۔ اور تفریحوں کے ساتھ ساتھ تجارت کی گرم بازاری بھی ہوتی تھی۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ حج سے ایک مہینہ پہلے (ذی قعدہ میں) اور حج کے ایک مہینہ بعد (محرم میں) سفر کی آسانیاں ہوں اور لوگ لوٹ مار، قتل و نہب سے باز رہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ حج کے بعد والا مہینہ ایسا ہو جس میں جنگ حلال ہو۔

اسی لئے ابو معشر فلکی (المتوفی ۲۷۲ھ) کہتا ہے۔ کہ نسی کبس ہے۔ عرب مثل عبرانیوں کے

ہر تین سال پر ایک مہینہ بڑھاتے تھے۔ تاکہ قمری سال شمسی سال کے مطابق ہو جائے۔ محمدؐ بن احمد البیرونی (وفاۃ ۴۳۰ھ) نے اسی کی پیروی کی۔ المسعودی بھی (مروجہ الذہب میں) کہتا ہے۔ کہ جاہلیت میں عرب ہر تین سال بعد ایک مہینہ کبیسہ کرتے تھے۔

لیکن محمود پاشا فلکی حسابی دلیلوں سے اس کا مخالف ہے (نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام) اس کا قول ہے کہ عرب جاہلیہ نسی خواہش نفسی سے کرتے تھے۔ اور کوئی علمی یا سائنٹیفک چیز نہ تھی۔ اور کسی نظام معین کی پابند نہ تھی۔ اسی رائے کا حامی الخضری بھی ہے (الخضری: محاضرات تاریخ ج ا۔ ص ۷۰)۔

مگر الوسی بغدادی کہتا ہے کہ: "عرب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی سنت پر چلتے تھے اور اپنے برسوں میں زیادتی نہ کرتے تھے۔ لیکن جب سے یہودی یثرب (مدینہ) میں آکر آباد ہوئے۔ انہوں نے اپنی رسم بدل دی۔ عرب یہ کوشش کرتے تھے۔ کہ حج کو اچھے موسم میں رکھیں۔ تاکہ ان کی تجارت کو آسانی ہو۔ اس لئے انہوں نے یہودیوں سے سال کو بڑھانا سیکھ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اس رسم کو عمرو بن لحیّ نے قائم کیا ہے۔"

(بلوغ اللارب ج ۳۔ ص ۷۱)

"عربی مہینوں کے موجودہ نام وہ نہیں ہیں۔ جو قدیم زمانے میں تھے۔" (بلوغ الارب ج ۳ ص ۷۳)

الوسی کا قول ہے کہ ۹ھ میں حج ابوبکرؓ کی امارت میں ہوا تھا۔ وہ مہینہ ذی الحجہ کا نہیں بلکہ درحقیقت ذی القعدہ کا تھا۔ لیکن آیندہ سال ۱۰ھ میں جو حج کیا تھا وہ اصلی ذی الحجہ میں تھا رسول اللہ کا قول ہے کہ یہ حج اسی ماہ حج میں پڑا ہے جس میں ابتدا میں حضرت ابراہیمؑ نے حج کیا تھا۔ یوسف بن عبدالملک کے قول کے مطابق یہ حدیث اس حج ابراہیمی کو بتاتی ہے۔ جب تاریخ ۹ ذی الحجہ (یعنی یوم الحج) ۲۲ مارچ کو پڑی تھی۔ یعنی اس دن سورج برج حمل میں داخل ہوا تھا۔ اور دن رات برابر تھے۔

(بلوغ الارب ج ۳ - ص ۷۲)

۸ھ میں مکہ فتح ہوا - اس سال مومنوں اور کافروں نے ایک ساتھ حج کیا تھا - اور مسلمانوں کے حج کی تولیت عتابؓ بن اُسید اُموی امیر مکہ نے کی تھی - اس سال ایک صفر نسی ہوا تھا - (تاریخ اسلام میں یہ پہلے امیر الحج ہیں - اسد الغابہ ج ۳ - ص ۳۵۸)

۹ھ میں حضرت ابوبکرؓ امیر حج تھے - لیکن حج کا موسم اور مہینہ پہلے سے مقرر تھا - جیسے قلمبس سے ۷ھ کے حج میں بتا چکا تھا - اس لئے آئندہ سال یعنی ۱۰ھ کے لئے کسی مہینے کے نسی کرنے کی ضرورت نہ تھی - ۹ھ کا حج، حج اسلام کہلاتا ہے -

۹ - ذی الحجہ ۱۰ھ - ۷ - مارچ ۶۳۲ء میں رسولِ عربی خود حج میں امیر حج تھے - اور چونکہ بنوکنانہ کے خاندان والے قریش کی طرح ہر قسم کی مذہبی خدمات سے معزول ہو چکے تھے - اس لئے حسب دستور قدیم لوگ رسول اللہ کے پاس جمع ہوئے اور اس امر کی درخواست کہ آئندہ سال کے لئے مہینہ نسی کر دیں -

آخری کبیسہ ۸ھ میں ہو چکا تھا - اس لئے موسم حج کو صحیح موسم میں قائم رکھنے کے لئے ۱۱ھ میں ایک مہینہ بڑھانے کی ضرورت تھی - لیکن رسول اللہ نے نسی کی رسم کو دوسری جاہلیہ کی رسموں کی طرح منسوخ کر دیا - اور خدا کا حکم سنایا کہ "نسی کفر میں زیادتی ہے" "اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں - ان کو اپنی خواہشات کی پابندی میں گھٹانا بڑھانا اور کسی کو حلال اور کسی کو حرام کرنا غیر ضروری ہے -

اس سال (۱۰ھ) کے بعد سے نسی رسم منسوخ ہو گئی - اور حج کا موسم مارچ سے فروری، فروری سے جنوری اور اسی طرح پیچھے ہٹنے لگا - اور ہر موسم میں نہ صرف حج بلکہ رمضان (یا روزہ رکھنے کا مہینہ) بھی گردش کرنے لگا - اور چند ہی سال بعد یہ نوبت آگئی - کہ خراج و زکوٰۃ وصول کرنے والے محصل، فصل بوئے جانے سے بھی پہلے تحصیل خراج کے لئے پہنچنے لگے - اور رفتہ رفتہ ہر اسلامی ملک میں

خراج کا مہینہ شمسی سال کے مطابق مقرر ہونے لگا۔ اکبر نے ہندوستان میں فصلی سال اسی غرض سے رائج کیا۔ لیکن دینی سال نہیں بدلا۔ وہ اسی حال پر باقی ہے۔

لہٰذا عربی نوروز جو مقررہ وقت اور موسم میں ہوا کرتا تھا۔ اب نہیں ہوتا عباسیوں نے عربی نوروز کو ترک کر کے ایرانی نوروز اختیار کر لیا تھا۔ اور ان کی پیروی میں "آب ریختن و آتش افروختن" بھی اس روز معمول کر لیا تھا۔ لیکن معتضد نے ۲۸۲ھ میں اس رسم کو بند کر دیا۔ اور دوبارہ ۳۶۳ھ میں خلیفہ معز الدین نے بھی اسے ممنوع قرار دیا۔ لیکن ۵۹۲ھ کے بعد سے ۷۰۰ھ تک یہ باتیں پھر جاری ہو گئیں۔ اور ہندوستان میں اکبر نے بھی جشن نوروزی (ہولی۔ بسنت) منانا شروع کر دیا۔ (سیر المتاخرین ج ۱۔ ص ۲۰۳)

"معتضد نے ۲۸۲ھ فرمان جاری کیا کہ آغاز خراج کو نوروز سے شمار کریں۔ اور گیارہ مہینے حزیران رومی یا سریانی سے شمار کریں۔ لوگ اسے نوروز معتضدی کہنے لگے۔" (ابن الاثیر وقائع سال ۲۸۲ھ)

چونکہ حسب الحکم خداوندی ۱۰ھ کے بعد سے نسی کا دستور اٹھ گیا تھا۔ اس لئے اس وقت سے اب تک کی صحیح قمری و شمسی تاریخیں معلوم ہو گئی ہیں۔ ہجرت مکہ کے بعد سے جو قمری تاریخیں شمسی تاریخوں کے مطابق تھیں۔ اُن کا حساب ہم نے اس طرح قائم کیا ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر ہی اس انداز سے ہوئی ہے۔ کہ حجر اسود کی دیواروں کا کونہ ٹھیک مشرق کی سمت ہے۔ اور آفتاب کی پہلی شعاعیں اس انداز سے اس پر پڑتی ہیں۔ کہ تحویل آفتاب کے مدارج کو بتا سکتی ہیں۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ حجر اسود سے اعتدال شمسی کے وقت کی شعاعیں منحرف ہو جاتی ہوں گی تو انہیں خود معلوم ہو جاتا ہو گا کہ موسم حج کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرور زمانہ سے جس طرح اور قوموں نے اپنے تہواروں کو فصلی تہوار بنایا۔ اسی طرح عربوں نے بھی بنایا ہو گا۔ اور کبیسہ کی رسم جاری کی ہو گی۔

تیسری صورت یہ ہے۔ اور اس کے متعلق تاریخی شواہد اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ عربوں کا تجارتی تعلق یثرب کے یہودیوں کے علاوہ فلسطین و روما والوں سے بھی تھا۔ اور اس طرح وہ عید گذران کے موسم سے واقف ہو جاتے تھے۔ اور عراق عرب کے ایرانیوں کے تعلق سے وہ نوروز جمشیدی سے بھی واقف تھے۔ اسی لئے حج کا موسم اس اعتبار سے متعین کرتے تھے کہ حج کے فوراً بعد عکاظ کا میلہ ہو۔ اور وہاں سے جو تاجر شام و عراق جانا چاہیں۔ وہ بھی رحلۃ الصیف (گرمی کے تجارتی سفر) کے لئے روانہ ہو سکیں۔ اور ایرانیوں یہودیوں اور رومیوں کے نوروزی میلوں میں شریک ہو کر تجارتی منافع حاصل کریں۔

مشرکین مکہ کا قلمبس (جوتشی و نجومی) حذیفہ بن عبد بن فقیم بن عدی بن عامر بن ثعلبہ بن حرث بن مالک بن کنانہ تھا۔ جب اسلام قائم ہوا۔ تو اس نسل کا آخری شخص جنادہ بن عوف تھا۔ (ابن ہشام) یہ کنانہ خود رسول اللہ کے اجداد میں سے تھا۔ یعنی غالب بن قریش بن مالک بن نضر، کنانہ کا بیٹا تھا۔ بنو کنانہ کو علم نجوم کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اور غیب کی باتوں پر اطلاع پانا ان کا خاص دعویٰ تھا۔ اس قبیلے (بنو کنانہ) کے ایک شخص نے ابرہۃ الاشرم کے گرجے کو محض اس لئے ناپاک و گندہ کر دیا تھا کہ لوگ اس گرجے کے مسیحی بتوں کی پرستش نہ کرنے لگیں۔ اور خانہ کعبہ کے بتوں اور اس کے شیطانی اجارہ داروں کی مذہبی تجارت و مرکزیت کو نقصان پہنچے۔ اسی کنانی کی وجہ سے ابرہہ نے ایک ہاتھی والے لشکر سے کعبہ کو ڈھانے کے لئے ایک مہم کی قیادت کی تھی لیکن وہ ناکام رہی۔ اور کعبہ کی بُت پرستی بدستور قائم رہی۔ جسے رسُول عربی کی جدو جہد نے آخر کار ختم کر دیا۔

لیکن یہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ حافظ ابن حجرؒ شرح صحیح بخاری میں جب سورۃ توبہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

کانوا یجعلون المحرم صفراً و یجعلونَ صفراً	مشرکین محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے تاکہ
المحرم لئلا یتوالی علیھم ثلاثۃ اشھر لا	متواتر تین مہینوں تک قتال کے بغیر نہ بیٹھے رہ جائیں۔

یتعاطون فیما القتال -

تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے بنو کنانہ کو نسی سے اس لئے روکا تھا کہ حلال مہینہ حلال ہی رہے - حرام نہ ہو جائے - نہ حرام حلال ہو جائے - بلکہ جو بارہ مہینے اللہ نے بنائے ہیں - وہی قائم رہیں -

اسی طرح ابو علی القالی کے امالی سے معلوم ہوتا ہے - کہ عرب جاہلیہ تین مہینے (ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم) متواتر حرام ہونا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے - کہ اُن کی معاش کا مدار ہی قتل و غارت پر تھا اور مسلسل تین حرام مہینوں کی وجہ سے فاقہ پھیل جاتا تھا - (لأن معاشهم كان من الاغارة کتاب الامالی ج اص ۴ - مصر)

لیکن حافظ ابن حجر اور ابو علی القالی ہی نہیں - دوسرے لوگوں نے بھی حرمت نسی کی وجہ یہی قرار دی ہے کہ سال میں تین مہینے امن کے ہو جائیں - لوٹ مار نہ ہو - گویا اللہ نے اسی وجہ سے یہ حکم دیا تھا - یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام نے تو کل مہینوں کو حرام قرار دے دیا تھا - اور قتل و غارت ہر مہینے میں حرام کر دی گئی تھی - اس آیت کی تفسیر میں اگر یہ خیال رکھا جاتا تو بہتر ہوتا کہ نسی کی آیت اسی دن (یعنی ۱۰ - ذی الحجہ ۱۱ھ) کو نازل ہوئی تھی - جس دن سے ایک دن پہلے یعنی ۹ ذی الحجہ کو رسول عربی صلعم کل مسلمانوں ہی کی عزت نہیں بلکہ کل انسانوں کی - حتیٰ کہ اُن لوگوں کی بھی جنہیں جانور سمجھا جاتا یعنی غلاموں کی عزت و حرمت کو حرام قرار دے دیا تھا - پھر اس کی کیا ضرورت تھی - کہ لوٹ مار کے لئے دوسرے مہینوں میں اجازت ہوتی اور اشہر حرُم کو متواتر باقی رکھنے کے لئے نسی کو حرام قرار دیا جاتا!!

واقعہ صرف یہ ہے کہ جس طرح اسلام نے سوسائٹی میں ایک انقلاب برپا کر کے عقل کو سدنہ و قریش کی غلامی سے آزاد کیا تھا - اور برہمنوں، پوپوں، موبدوں اور حبروں کی تقلید سے انسانی عقل کو آزاد کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا - اسی طرح پہلے ملیت اور پھر بین الملیت کی بنیادوں کو اُستوار کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ موسموں کی وجہ سے عالمگیر اجتماعات میں رخنہ نہ پڑے - ورنہ رسول عربی موسموں کے

تغیر وتبدل، شمس وقمر اور الخنس کے طلوع و غروب اور یمن سے شام تک اور حبشہ سے روم اور ایران تک کے طبعی حالات سے واقف تھے۔ اور تاجر کی حیثیت سے بھی بہت کچھ سفر کر چکے تھے۔

یہاں صرف ایک اور انقلابی مثال درج کی جاتی ہے۔ زمانۂ جاہلیہ میں مہینوں اور دنوں کے نام مشرکانہ تھے۔ ۔۔۔ نے ان کو یک قلم بدل دیا "عربوں میں زمانہ جاہلیہ میں دنوں کے یہ نام تھے:۔ اوّل:۔ اخون۔ جبار (برج جوزا کا نام)۔ دبران (منزل قمر جب چاند پانچ کواکب کے ساتھ برج ثور میں ہو) موئنس، عروبہ، شیار" (الوسی بلوغ الارب۔ ج ۱۔ ص ۲۸۳)

لیکن اسلام نے پہلا دن، دوسرا دن، تیسرا، چوتھا، پانچواں، جمعہ اور سبت کر دیا۔ عربوں میں جمعرات اور سبت کو یہودیوں کی طرح کام اور سفر کرنا برا سمجھا جاتا۔ اور اسے منحوس سمجھتے تھے۔ رسول عربیؐ نے اسے بھی منسوخ کر دیا۔ اور کہا:۔ بارك الله یوم السبت و الخمیس۔ (اللہ نے سنیچر اور جمعرات کو مبارک کیا۔ اسی کا اثر تھا کہ ایران میں بھی یہی اسلامی دن رائج ہو گئے۔ اور قدیم نام منسوخ ہو گئے۔ ایران قدیم میں مہینے کا ہر روز کسی نہ کسی ایزد (دیوتا) کے نام پر شروع ہوتا تھا مثلاً ہرمز روز۔ بہمن روز، اردی بہشت روز وغیرہ۔ اسلام نے اسے منسوخ کر دیا۔ لیکن ہندوستان میں یہ نہ ہو سکا۔ یہاں مسلمانوں کے اختلاط سے جو ہندوستانی زبان پیدا ہوئی۔ اس میں دوسرا روز پیر، پانچواں روز جمعرات اور چھٹا جمعہ کہلاتا ہے۔ باقی دن مختلف سیاروں اور دیوتاؤں کے ناموں پر باقی ہیں۔

غرض نتیجہ یہ ہے کہ رسول عربیؐ نے نسی کو جو کبیسہ ہے۔ اس لئے منسوخ کیا کہ اس سے جاہلیہ کی ایک مکروہ رسم مٹ جاتی تھی۔ اور لوگ شرک و توہم پرستی سے آزاد ہو جاتے تھے "لسان العرب" میں اسی سلسلے میں ایک حدیث بھی درج ہے:۔

قولهٗ یوم الفتح:۔ کُلُّ ماثرةٍ من ماثر	رسول اللہ کا قول فتح مکہ کے دن:۔ جاہلیہ کی رسموں میں

الجاهلية تحت قدمىّ الى يوم القيامة ، — سے ہر رسم میرے قدموں کے نیچے قیامت تک کے لئے ہے

والنسئ الذى لا يُحَلّ فى القوم لانّهٗ منسىٌّ — اور نسی ۔

لیکن مرورِ زمانہ سے یہ چیز سوائے حج اور رمضان یعنی دینی امور کے لئے باقی رہی اور لوگوں نے ایرانی، ہندی، مصری، نوروز منانے شروع کر دیے۔ ایرانی الاصل قرامطہ نے (تیسری صدی ہجری میں) نوروز جمشیدی کو روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ شیعہ مذہب نے نوروز کے فضائل کی حدیثیں بیان کیں۔ اور ہندوستان میں ہولی کے رنگ نے سب کو یک رنگ بنا دیا۔ اکبر کے زمانے سے سرکاری طور پر جشن نوروزی شروع ہوا۔ اور یورپ کے اثر سے مارچ کی جگہ جنوری کے سرد موسم میں یورپین نوروز بھی اب شروع ہو گیا ہے۔ یہ مسیحی نوروز ہے۔ اور اس کا تعلق موسم بہار سے نہیں۔ بلکہ رومی کلیسا سے ہے

حج حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے قائم ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اُر (خالدیہ) کے باشندے تھے۔ جہاں مہینہ تو چاند سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن اُسے شمسی بنانا ضروری تھا۔ اور وہ لوگ اجرام فلکی کی نہ صرف پرستش کرتے تھے جیسا کہ قرآن سے بھی ظاہر ہے۔ بلکہ فن ہیئت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے بابل اور دوسرے معبد ایک قسم کی رصدگاہ تھے۔ جو مختلف سیاروں اور ستاروں کو بلندی سے دیکھنے اور اُن کی پرستش کے لئے کام میں لائے جاتے تھے۔

حج کے زمانے میں تین بڑے بازار منعقد ہوتے تھے :۔

(۱) سوق مجنہ، ظہران میں .. .. .. ⎫
(۲) سوق عکاظ، نخلہ اور طائف کے درمیان ⎭ ذی القعدہ کے بیس دن

(۳) سوق ذوالمجاز۔ عرفہ سے جانب الیسر ایک فرسخ کے فاصلے پر۔ ۸ ذی الحجہ تک اسی لئے وہ موسم کے اعتبار سے مہینوں کو مقدم مؤخر کرتے رہتے تھے۔ تاکہ ایک ایسے موسم میں حج ہو۔ جب میلہ اور تجارت اور سفر سب پر لطف ہو جائیں۔

مجاہد کا قول ہے "کانت الجاہلیۃ یحجون فی کل شہر من شہور السنۃ"۔ (دیکھئے ص ۴۵ ادیان العرب فی الجاہلیہ۔ تالیف قاضی محمد نعمان الجارم۔ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۲۳م
شہرستانی نے بھی نسی کو بمعنی کبس استعمال کیا ہے۔ اگرچہ محمود پاشا فلکی نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ عرب شمسی سال سے واقف تھے۔ اور الخضری نے بھی فلکیٔ مذکور کی تائید کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ پہلے نسی کو کبس سمجھتا تھا۔ اب اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔ (محاضرات الخضری ذکر نسی مطبوعہ مصر)

لیکن قرآن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ نسیٔ کے معنی قمری سال کو بڑھا کر شمسی سال کے برابر کرنا ہے۔ یعنی دوسرے تیسرے سال ایک مہینہ بڑھا کر ۱۲ مہینوں کو ۱۳ مہینے کر دیتے تھے۔ ورنہ قرآن کو تو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ کہ (ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شہراً) یعنی ۱۲ مہینے نہیں ہوتے۔ جیسا کہ عرب کرتے ہیں: تاکہ اُسے شمسی سال کے مطابق بنائیں۔ (فی کتاب اللہِ یوم خلق السمٰوٰتِ و الارض، منہا اربعۃ حرم - ذٰلک الدین القیم - فلا تظلموا فیھن انفسکم، وقاتلو المشرکین کافۃً کما یقاتلونکم کافۃ، و اعلموا انّ اللہ مع المتقین - انّما النسیٔ زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا، یحلونہ عاماً ویحرمونہ عاماً لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ زین لہم سوء اعمالہم، و اللہ لا یھدی القوم الکافرین) یعنی کفار تو خود چار مہینے حرام مانتے تھے۔ اور بقول فلکی پاشا انہیں صرف آگے پیچھے اس لئے کر دیتے تھے کہ مسلسل تین مہینے لوٹ مار سے باز رہنا اُن پر شاق گذرتا تھا۔ حالانکہ قرآن کا مسلک صاف ہے۔ کہ چار مہینے حرام کر لینا ہی کافی نہیں۔ بلکہ اُن مہینوں میں نہ تو تقدیم و تاخیر ہو نہ بارہ مہینے سے زیادہ ہوں۔

میرے ایک حیدر آبادی کرمفرما نے یہ بتایا کہ غالباً اس سے رسول اللہ کا یہ مقصد تھا۔ کہ آیندہ سے ہمیشہ اسی موسم میں حج ہُوا کرے۔ اور سال کے بارہ مہینے ہوا کریں۔ یعنی قمری سال میں

ہر سال ۱۱ دن بڑھا کر آئے شمسی کے مطابق کر لیا جائے گا۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلعم، نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا ہے۔ (ان الزمان قد استدار کہیئۃ یوم خلق اللہ السموات والارض) یعنی موسم معتدل آگیا ہے۔ جو ۲۱ مارچ کے قریب ہوتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا (السنۃ اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلاثۃ متوالیات ذوالقعدہ، ذوالحجہ والمحرم، ورجب مضر الذی بین جمادی وشعبان۔ پھر آپ نے وہ قرآن کی آیت پڑھی۔ جو اوپر مذکور ہوئی ؛

اس امر کا مزید ثبوت کہ جاہلیہ میں کبس یعنی سال میں مہینہ بڑھانے کا دستور تھا۔ یہ ہے کہ جب رسول اللہ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو ماہ محرم میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ اور خود بھی اس یادگار حریت بنی اسرائیل کے لئے روزہ رکھنا اختیار کیا۔ یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کا پہلا مہینہ ابیب اور عربوں کا پہلا مہینہ محرم ایک ہی چاند سے شروع ہوتا تھا۔ یہودیوں میں کبس کی رسم زمانہ قدیم سے جاری تھی۔ اور عربوں کا کبس یا نسی یہودیوں کے لوند کے مہینہ سے ہمیشہ مطابق ہوتا تھا حتی کہ دونوں کا پہلا مہینہ اُن ہی تاریخوں میں شروع ہوتا تھا۔

غرضیکہ ہم نے کافی غور و خوض اور تحقیق کے بعد سیرت نبوی کے متعلق صحیح تاریخوں کو متعین کر لیا ہے۔ وہ سب قمری مہینوں سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن کبیسہ یا نسی کے بعد شمسی یا یہودی و عجمی برسوں کے مطابق ہو جاتی ہیں۔ حیات نبوی کے صحیح موسموں اور غزوات کے اصلی ماحول کے سمجھنے میں اس سے جو مدد ملتی ہے۔ وہ ظاہر ہے ؛

(نوٹ) مفصل تواریخ جاہلیہ اس کتاب کے خاتمے پر درج ہیں۔

حصہ سوم

مقدمہ سیرۃ سیدنا محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم

فہرست مضامین تیسرا حصہ

پہلی فصل

سیرت کی اہمیت

۱۔ قوموں کی ترقی اُن کی مجموعی کوشش پر منحصر ہے

دنیا کی تاریخ کا ہر صفحہ گواہ ہے، کہ قوموں کی ترقی کا راز ان کی مجموعی کوشش میں پوشیدہ ہے؛ اکیلے اکیلے کوئی کام کیا جائے تو اس سے کوئی جماعت نہ تو بن سکتی ہے نہ بگڑ ہی سکتی ہے مثل مشہور ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔

ترقی کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالت سے بہتر حالت پیدا کی جائے پستی سے بلندی اور نیچے سے اوپر جانے کے لئے سر کھپایا جائے اور اس مقصد کے لئے جان توڑ کوشش کی جائے جب ایک جماعت ایک حد تک کام کر لے تو بعد میں آنے والی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے لے اور آگے بڑھنے کی کوشش برابر جاری رہے۔

لیکن اگر پہیہ بنانے کے بعد بیل گاڑی ہی پر قناعت کر لی جاتی اور تیزی سے چلنے والی

گاڑی بنانے کی کوشش نہ کی جاتی۔ تو نہ تو گھوڑا گاڑی بنتی، نہ ریلوے انجن، نہ موٹر کار، اس قسم کی قناعت یا بے عملی کی خواہش کا دوسرا نام کاہلی ہے اور یہ اکثر قوموں کو فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض قومیں باوجود ترقی کر چکنے کے پھر پستی کی طرف چلی جاتی ہیں، اور دوسری قومیں ان سے آگے بڑھ جاتی ہیں؟ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ جو قوم ترقی کر کے پستی کی طرف جاتی ہے، وہ اپنا پرانا سبق بھول چکتی ہے اور دوسری قوم اس دوڑ میں آگے نکل جاتی ہے لیکن یہ جواب ناکافی اور ادھورا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے لئے کوشش کرنے پر مجبور ہے۔ شاید ہی کوئی انسان ایسا ہوگا، جو ہاتھ پاؤں نہ ہلائے اور روزی حاصل کر کے زندہ رہنے کی کوشش نہ کرے لیکن پھر بھی وہ رفتہ رفتہ تباہی کی طرف چلا جاتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلہ میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ جو وجوہ افراد کی تباہی کے ہوتے ہیں۔ وہی بڑی حد تک قوموں کو بھی تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک لوہار کی زندگی پر غور کیجئے۔

ایک لوہار ہے، وہ گاؤں کا رہنے والا ہے، وہاں کی ضرورتیں بھی کم ہیں۔ پھر بھی اسے کام ضرورت سے زیادہ مل جاتا ہے۔ وہ گاؤں والوں کے ہل بنا دیتا ہے۔ ان کی مرمت کر دیتا ہے وہ بیل گاڑی کا پورا لوہا بنا دیتا ہے۔ پہیوں کی ہال اپلوں میں تپا کر پہیوں پر چڑھانا جانتا ہے شاید وہ یہ بھی جانتا ہے کہ لوہا گرم کرنے سے پھیل جاتا ہے اور ٹھنڈا ہونے پر سکڑتا ہے اسی لئے وہ ٹھنڈا ہو کر پہیہ کے گھیرے پر چمٹ جاتا ہے لیکن وہ دھاتوں کی اس عام خاصیت کو دوسری جگہ استعمال کرنا نہیں جانتا نہ اسے ہلکی گاڑیاں مرمت کے لئے ملتی ہیں نہ بندوق، پستول اور بائیسکل کے بنانے کی اسے کوئی حاجت ہے۔ وہ جس حال میں ہے مگن رہتا ہے اور شہری لوہے کے تار کے باجے پر کبھی کبھی اپنا غم غلط کر لیا کرتا ہے۔

شہری لوہار ہتھوڑے اور نہائی کا استعمال تو جانتا ہی ہے لیکن وہ موٹر اور انجن کی مرمت کرلیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرزے بھی ڈھال سکتا ہے۔ خراط کی مشین سے لوہے کو چھیلتا ہے اس میں مشین سے سوراخ کرتا اور مشین ہی سے پیچ بناتا ہے۔ غرضیکہ دیہاتی لوہار کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ آگے ہی رہتا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ محنت تو شاید دیہاتی لوہار سے کم کرتا ہے لیکن اسنے چند ایسی قدرتی قوتوں کو اپنا غلام بنالیا ہے جو دیہاتی لوہار سے ہزار گنا بہتر اور تیز کام کرتی ہیں۔ یہ قوتیں کوئلہ، تیل، پٹرول اور بجلی کے استعمال سے حاصل ہوتی ہیں۔ دیہاتی لوہار جس حال میں ہے ہزاروں سال تک وہیں رہے گا۔ لیکن شہری لوہار اب انجنیئر کہلاتا ہے اسلئے کہ وہ قدرت کے چند رازوں سے واقف ہوگیا ہے اور ان کا استعمال کرکے قانع نہیں ہے۔ بلکہ آگے بڑھنا چاہتا ہے اور روزانہ نت نئی ایجادوں کی فکر میں رہتا ہے اور قدرت پر ہر فتح اسے ترقی کے زینے پر چڑھاتی جاتی ہے۔

اسی طرح وہ قومیں، جو بیلوں کی رتھوں پر بیٹھ کر جنگ کرتی تھیں اور ہاتھیوں کے گلوں سے دشمن کو روند ڈالتی تھیں۔ اُن کے سامنے جب گھوڑوں پر سوار ہونے والے آئے تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئیں۔ پھر گھڑسواروں کی برچھیوں اور کمانوں کو بندوق کی گولیوں نے شکست دے دی۔ مگر بندوق والے سوار بھی۔ فولادی گاڑیوں کی مشین گنوں کے سامنے فرار ہوگئے اور مشین گنیں ہوائی جہازوں کی بمباری کے آگے ہوا ہوگئیں۔ یہ سب اسلئے ہوا کہ ایک قوم اپنی حالت پر قایم رہی۔ اس نے اپنا پرانا سبق بھلایا نہیں بلکہ اس پر سختی سے قایم رہی اور جن لوگوں نے کوئی ترمیم کرنا چاہی۔ ان کو بے وقوف بنانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ گھوڑے کی تیزی بیل کی مشقت پر غالب آئی اور انسانی دماغ کی ترقی کی خواہش نے کاہل اور قناعت کرنے والی جماعتوں کو پامال کردیا۔

لیکن یہ چیز ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف افراد کی ترقی کی خواہش سے کام نہیں چل سکتا ترقی کی خواہش

پوری قوم یا کم از کم قوم کے اکثر افراد میں ہونی چاہیئے تاکہ جو لوگ ترقی کی راہ پر چلنا چاہیں وہ مجموعی طور پر کام کر سکیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا کر ترقی کی رفتار کو تیز کر سکیں۔ اور کاہل لوگوں کو اپنی قوت سے آگے بڑھا سکیں۔ یا اگر انہیں آگے نہ بڑھا سکیں تو اتنا تو ہو کہ وہ ترقی کرنے والوں کی راہ کا روڑا نہ بنیں ؛

قدرتی آسانیاں اور مشکلیں

لوہار یا انجنیئر کی مثال سے ایک اور نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض لوہار جسمانی یا دماغی کمزوریوں کی وجہ سے دوسرے مضبوط اور تعلیم یافتہ لوہاروں سے سبقت نہیں لے جا سکتے۔ اسی طرح قومیں اور جماعتیں بھی بعض قدرتی آسانیوں یا دشواریوں میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اور ان کی ترقی محدود ہو جاتی ہے۔

جو قومیں زرخیز ملکوں میں رہتی ہیں وہ آسانی سے آگے بڑھ سکتی ہیں۔ جہاں قدرتی ذریعے کم ہیں وہ محنت اور مشکل سے آگے بڑھتی ہیں۔ لیکن جہاں قدرتی آسانیاں بالکل نہیں ہیں۔ وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ یا رفتہ رفتہ جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے لگتی ہیں۔ ان قدرتی ذریعوں میں جغرافیائی حالات کو بہت بڑا دخل ہے۔

پھر جو قومیں موسمی اور جغرافیائی سہولتوں کی وجہ سے جماعتی طور پر سوچنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ وہ دوسروں کے مقابلہ میں جلد آگے بڑھ جاتی ہیں۔ مادی سہولتوں سے دماغی ترقی ہوتی ہے اور دماغی بلندی مادی سامان کا صحیح استعمال بتاتی ہے۔ علم کی ترقی ہوتی ہے اور عمل آسان ہو جاتا ہے۔ قوم بنتی ہے اور ترقی کرتی ہے ؛

۲۔ ہجرت اور جہاد

اسلام نے ہجرت اور جہاد کے معنی مخصوص کر دیئے۔ حالانکہ اسلام سے پہلے اور اسکے بعد

ان کا استعمال برابر ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا جب کوئی شخص اپنے گاؤں میں روزی نہیں حاصل کر سکتا تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ وہاں بھی کام نہیں چلتا تو دوسرے ملک میں جا بستا ہے۔ یہی حال عربی، تاتاری اور ہندوستانی خانہ بدوشوں کا ہے۔ جہاں چراگاہ اور پانی ملا۔ جا بسے، اور جہاں تجارت یا چوری کی آسانی ہوئی اُدھر چل دیئے۔ قومیں یہی ہی کر چکی ہیں۔ مصر سے بنو اسرائیل اسی طرح نکلے تھے۔ عربوں نے ہزاروں جزیروں کو اسی طرح وطن بنالیا تھا اور اب بھی دنیا کی مہذب قومیں اسی طرح اپنا وطن ترک کر کے دور دراز کے ملکوں میں نوآبادیاں (کلانی) بنالیتی ہیں۔ اسی ترک وطن کا نام ہجرت ہے، اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ کسی ایسے ملک میں آباد ہوا جائے جہاں قدرتی آسانیاں ہوں اور وطن کی سی مشکلیں نہ ہوں۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وطن میں شریر لوگوں یا جماعتوں کا غلبہ ہوتا ہے، وہ لوگ وطن کی ہر ایک مادی اور دماغی جنس کو اپنے نفع کے لئے اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں کمزور افراد یا جماعتوں کے لئے دو ہی راستے کھلے ہوتے ہیں، یا تو بغاوت کریں یا کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں سے کامیابی کے ساتھ وطن کو شریروں کے پنجہ سے آزاد کرائیں۔

ہجرت کی آخری صورت کا نام جہاد ہے۔ یہ ایک مسلسل کوشش ہے سچائی اور انصاف کو قائم کرنے اور انسانیت کو ذلت اور ظلم سے آزاد کرانے کا۔ اس کی شاندار مثال رسولِ عربی اور ان کے ساتھیوں کی زندگی سے ملتی ہے۔

۳۔ بعض افراد قوموں کو آگے بڑھانے کا سبب بن جاتے ہیں

قومیں عام طور پر معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کی مجبوری سے آگے بڑھتی ہیں۔ اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جو قومیں مادی ترقی نہیں کرتیں وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ زندہ رہنے کی خواہش ایک

قدرتی خواہش ہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے افراد اور قومیں برابر کوشش کرتی رہتی ہیں ٭

اس کوشش میں بعض افراد اتفاقاً کسی ایسے قانونِ قدرت کو معلوم کر لیتے ہیں - جو پوری قوم کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے طبیعیات اور کیمسٹری کا ایک ایک قانون انسانی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی کرتا رہتا ہے - آگ کی دریافت نے دنیا میں کیا کچھ انقلاب نہیں پیدا کیا - بھاپ نے کتنی قوموں کو زیر و زبر نہیں کیا - اسی طرح بجلی اور پٹرول نے دُنیا میں طوفان مچا رکھا ہے اور لوہے نے مٹی کو سونا بنانا شروع کر دیا ہے - اِن سب اتفاقی ایجادوں نے ایک نئی دنیا اور نیا انسان بنا دیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ جو قومیں نئی باتوں کو جلد قبول کر لیتی ہیں اور اپنے موجدوں کے مشاہدوں کو عام کر دیتی ہیں - وہ بہتر زندگی کی شاہراہ پا لیتی ہیں ٭

لیکن دنیا کا عجب حال ہے جب کوئی اُن کے بھلے کی بات کہتا ہے تو بہت کم لوگ اس پر کان دھرتے ہیں یا اس کے تجربے سے فائدہ حاصل کرتے ہیں - زیادہ تر یہی دیکھا گیا ہے کہ ذہنی اور مادی ٹھوکر کھا کر دھوکے میں آ کر وہ لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں - اور الٹا دھوکے کا اصلاح کرنیوالے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں - یہ ایک لمبی اور دُکھ بھری کہانی ہے - پھر بھی مختصراً چند مثالیں نیچے لکھی جاتی ہیں ٭

حضرت موسیٰ سنہ ۱۴ قم تا ۱۲۵ قم سے جب چھ لاکھ غلاموں کے غول کو آزادی کے راستہ پر چلانا چاہا - تو ان پشتینی اپاہجوں نے کیا کیا شرارتیں نہ کیں اور کس کس طرح اپنی بزدلی اور کمزوری کا ثبوت نہ دیا - کبھی جنگ سے جی چراتے تھے کبھی قانون اور ڈسپلن سے گھبراتے تھے - کبھی مصری پرستش اور مصری طرزِ خیال کی پابندی میں اپنی نجات سمجھتے تھے اور کسی طرح بھی اپنے لیڈر کا ساتھ دے کر اپنی ذہنی ترقی کرنا نہیں چاہتے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ خود حضرت موسیٰ کے حکم سے ہزاروں نافرمان تلوار کے گھاٹ اتارے گئے - آخر کار چالیس سال

صحرانوردی کی بدویانہ زندگی بسر کرنے کے بعد پُرانے بزدل ختم ہو گئے۔ نئی قوم تیار ہوئی - ان نوجوانوں نے بچپن سے سخت زندگی بسر کی تھی۔ کنعان کی فتح کا خواب اب حقیقت ہونے والا تھا۔ لیکن حضرت موسےٰؑ اب ایک سو بیس سال کے ہو چکے تھے۔ انہوں نے یہواہ (اللہ) اور بنو اسرائیل کے درمیان ایک دوسرا عہد کرایا اور بغیر کنعان کی موعودہ سرزمین میں قدم رکھے ۱۴۵۱ سنہ قبل مسیح میں انتقال کیا۔ موآب کی سرزمین میں دفن ہوئے اور توریت کے مطابق " ان کی قبر کا نشان کسی کو معلوم نہیں "۔

" بعد کے زمانے میں عموماً ہر ایک نبی بادشاہوں اور پجاریوں کی جماعت کا دشمن ہوا کرتا تھا اسلئے وہ جماعت جس کی آمدنی مندر یا معبد پر منحصر تھی - وہ ان نبیوں کو ہمیشہ پریشان رکھتی تھی - ایک قانون بھی حضرت موسےٰؑ سے منسوب کیا جاتا تھا (لیکن یہ قانون غالباً پجاریوں اور بادشاہوں کا بنایا ہوا تھا) کہ جھوٹے نبیوں کو قتل کر دینا چاہیئے۔ لیکن گو یہ چیز خطرناک تھی کہ نبیوں کو ہاتھ لگایا جائے اسلئے کہ عوام ان کے طرفدار ہوا کرتے تھے لیکن انہیں اکثر ایذا اور دُکھ پہنچایا جاتا تھا - اوریاہ (Uriah) ایک بادشاہ یہویاکم (Jehoiakim) کے ستانے سے مصر بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ حضرت زکریاؑ خود معبد کے صحن میں سنگسار کئے گئے۔ ارمیاہ (Jeremiah) پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔ اور اگرچہ بے قصور پایا گیا۔ پھر بھی انہیں قید کر دیا گیا۔ خشک کوئیں میں لٹکایا گیا۔ اور آخر کار مصر میں یہودیوں نے (بروایتے) انہیں سنگسار کر دیا۔ "

(دیکھئے ریڈ کی مارٹرڈم آف مین۔ ص ۱۷۵)

۲ جناب کنفوشس (۵۵۱ سنہ ق م تا ۴۷۹ سنہ ق م) چین کے ایک بہت بڑے مُصلح اور استاذ تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں چین کے اندر پانچ چھ ہزار آزاد سلطنتیں تھیں۔ جس طرح یونان کی پھوٹ کے زمانے میں بڑے بڑے فلسفی، اور پریشان و منفرق

یہودیوں میں نبی پیدا ہوئے۔ اسی طرح چین کی طوائف الملوکی نے کئی فلسفی اور مصلح پیدا کر دیئے تھے کنفوشس نے سیاسیات و اخلاقیات کی تعلیم کی سرپرستی کے لئے دس سال تک ایک بادشاہ کی تلاش کی۔ لیکن ہزاروں کی تعداد کے باوجود ایک بادشاہ ملا بھی تو درباریوں کی سازش نے کنفوشس کو زیادہ دن نہ ٹھہرنے دیا اور آخر کار وہ مصلح جو دنیا کو اخوت، محبت اور سیاست کی تعلیم دینا چاہتا تھا۔ ناکام و شکستہ دل اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اسی طرح ڈیڑھ سو سال بعد افلاطون نے بھی ایک رئیس کی تلاش کی تھی اور چند دنوں کیلئے اسے بھی سیراکیوز کا ظالم رئیس دایونی سیوس مل بھی گیا تھا۔ (ولز ۱۰۸)

مختلف نبیوں، فلسفیوں اور مصلحوں کا ذکر پہلے حصے میں گزر چکا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں ہو سکا۔ ان سب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدامت پرستی اور قدامت پرستی کے اجارہ داروں کے خلاف جب کسی مصلح یا حکیم نے آواز اٹھائی۔ تو اس کی آواز کو دبانے کے لئے جملہ ارتجاعی یعنی قدامت پسند قوتیں متفق ہو گئیں ؎

۳۔ انسانیت کو آگے بڑھانے میں رسولِ عربی کا مخصوص مقام ہے۔

رسولِ عربی کی مکمل سیرت اب تک نہیں لکھی گئی۔ لیکن جو کچھ حالات بھی دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ ان کی بنا پر غیر مسلموں میں دو جماعتیں بن گئی ہیں۔ ایک جماعت تو وہ ہے جو کسی خاص مقصد کی وجہ سے آنحضرت کی زندگی میں سوائے برائی کے اور کوئی چیز نہیں دیکھتی۔ دوسری جماعت وہ ہے جو تعریف کرتی ہے۔ یا تعریف کے ساتھ ساتھ نکتہ چینی بھی۔ ہم اختصار کے ساتھ ان مختلف خیال رکھنے والے لوگوں کے قول یہاں نقل کرتے ہیں۔ تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ جس شخصیت کے متعلق ہم لکھنا چاہتے ہیں۔ اسکو بحیثیت انسان کے دنیا والے کیا سمجھتے ہیں۔

"محمدؐ کی زندگی کے حالات بہت سی زبانوں میں لکھے جا چکے ہیں اور اتنی تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ کہ ان کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس موضوع پر سر ولیم میور نے جو کچھ لکھا ہے۔ دلچسپ، مفصّل اور قابل ملاحظہ ہے۔ اسی طرح ایک طویل مضمون "ڈکشنری آف کرسچین بیاگریفی" کی تیسری جلد میں "محمدؐ اور محمدیت" کے عنوان سے ریورنڈ جی۔ پی۔ بیجر کے قلم سے ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہے۔ عام انگریزی دان کے لئے مندرجہ بالا کتابیں اور "ڈکشنری آف اسلام" مصنفہ ہیوز کافی معلومات بہم پہنچا سکتی ہیں۔

"ان کی اس مکّی زندگی کی ابتدا کو جسے ابتدائی وحی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک مُصلح، مبلّغ اور نبی کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اگرچہ اُن میں جوش بھرا ہوا تھا اور اس کام کی کامیابی کا یقین تھا۔ جسے انہوں نے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اپنی زندگی کی ابتدا سے انتہا تک وہ ایک عملی انسان تھے۔ جو بدھ اور یسوعؑ ہرگز نہیں تھے۔"

(تاریخ ادبیات عرب۔ آربتھ ناٹ۔ صفحہ ۱۱۹۔ ۱۲۰)

"دنیا کے تمام انسانوں میں، سب سے زیادہ جس انسان نے نسل انسانی پر اثر ڈالا۔ وہ محمدؐ تھے۔"

(ڈریپر۔ تاریخ ترقی ذہن یورپ۔ جلد اول صفحہ ۳۲۹)

"وہ گہرے دل والا انسان جو صحرا کی پیداوار تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں، اس کی کھلی ہوئی، سوشل اور گہری روح میں جو خیالات تھے۔ ان میں جاہ طلبی کا لگاؤ بھی نہ تھا۔ وہ ایک خاموش اور بڑی روح والا انسان تھا۔ جسے خود قدرت نے پُرخلوص بنایا تھا۔ دوسروں کا تو یہ حال تھا۔ کہ وہ اقوال اور سنی سنائی باتوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور ان ہی میں مگن تھے۔ لیکن یہ شخص اپنے آپکو اقوال کے پردہ میں نہیں چھپا سکتا تھا۔ وہ تھا اور اس کی روح اور اشیاء کی حقیقت۔ ہستی کا بڑا راز

اس پر روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ اس میں اسے خوف و تکلیف بھی نظر آتی تھی اور شان و شوکت بھی۔ کوئی قول یا سنی سنائی بات اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتی تھی۔ کہ "میں موجود ہوں"۔ اس خلوص و یقین میں خدائی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا کلام ایسا کلام ہوتا ہے جو براہ راست قدرت کے دل سے نکلتا ہے۔ انسانوں کو چاہیئے کہ اس کلام کو سنیں۔ ورنہ کسی چیز کو نہ سنیں۔ اس کے علاوہ سب باتیں ہوائی ہیں۔ ہمیشہ سے اس شخص کے دماغ میں خواہ وہ سیاحی کر رہا ہو یا حجوں میں شریک ہوتا ہو ہزاروں خیالات آتے تھے۔ "میں کیا ہوں؟ یہ گہری چیز جس میں میں رہتا ہوں اور جسے لوگ دنیا کہتے ہیں۔ کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کسے کہتے ہیں؟ کن چیزوں پر ایمان لانا چاہیئے؟ مجھے کیا عمل کرنا چاہیئے؟ کوہ حرا کی چٹانیں کوئی جواب نہ دیتی تھیں۔ طور سینا خاموش تھا۔ اور صحرا کی وسعت پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیلگوں آسمان اور اس کے تارے چپ تھے۔ کہیں سے کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ خود اس شخص کی روح، اور جو کچھ خدائی الہام اس میں موجود تھا وہی جواب دے رہا تھا۔"

(ٹامس کارلائل۔ ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کرافٹ)

"لیکن کیا محمدؐ کسی نوعیت سے نبی نہ تھے؟ یقیناً ان میں نبیوں کی دو باتیں موجود تھیں۔ انہوں نے خدا کے متعلق وہ سچائی معلوم کی تھی۔ جو ان کے ہمعصروں کو نظر نہ آتی تھی۔ اور ان میں ایک نہ تھمنے والا اندرونی جوش تھا۔ جو اس سچائی کا اعلان کرانا چاہتا تھا۔ اس معاملے میں وہ بنو اسرائیل کے سب سے بہادر نبی کے ہم پلہ تھے۔ سچائی کے لئے انہوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈالی۔ وہ برسوں تک روزانہ ستائے گئے۔ انہیں سزا دی گئی۔ مال کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ہم وطنوں نے رواداری اور دوستوں نے اعتماد ترک کر دیا۔ موت کے سوا انہوں نے انتہائی مصیبتوں کا مزہ چکھا۔ اور اگر ہجرت نہ کرتے تو یقیناً قتل کر دیئے جاتے۔ پھر بھی وہ بے خوفی سے اپنا پیغام سناتے رہے

کوئی رشوت، کوئی دھمکی اور کوئی لالچ انہیں خاموش نہ کرسکا۔ انہوں نے فرمایا۔ "اگر وہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند لاکر رکھ دیں۔ تب بھی میں اپنا مقصد نہ چھوڑونگا۔" اس استقلال و عزم اور اپنی نبوت کے یقین کے ساتھ انہوں نے خدا کے ایک ہونے کا اعلان کیا۔ اور اسی سے اسلام بنا۔ دوسرے لوگ بھی بت پرستوں میں رہ کر وحدانیت کو مانتے رہے ہیں لیکن کسی نے وحدانیت کی بنا پر مضبوط اور پائدار مذہب نہیں قایم کیا۔ آپ ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے یہ تہیہ کرلیا تھا۔ کہ لوگوں سے توحید کو منوا کر چھوڑیں گے۔"

(ڈاکٹر مارکس ڈاڈس۔ محمدؐ۔ بدھ اور کرائسٹ صفحہ ۱۷-۱۸)

"وہ سلطنت اور مذہب دونوں کے سردار تھے یعنی وہ قیصر بھی تھے اور پوپ بھی لیکن وہ ایسے پوپ تھے جن میں پوپ کی سی بناوٹ اور تصنع نہ تھی۔ وہ قیصر تھے۔ مگر قیصر کی سی فوجیں ان کے پاس نہ تھیں۔ نہ کوئی مستقل فوج تھی۔ نہ باڈی گارڈ۔ نہ کوئی محل تھا نہ مقررہ آمدنی۔ اگر کبھی بھی کسی شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہوا ہے کہ میں خدا کی طرف سے حکومت کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ تو یہ حق محمدؐ کو تھا۔ اسلئے کہ انہیں حکومت کے سب اختیارات تھے۔ اگرچہ اسکے لوازم نہ تھے۔"

"تاریخ میں یہ اپنی ایک ہی مثال ہے۔ کہ محمدؐ تین چیزوں کے بانی تھے یعنی ملت، مذہب، اور سلطنت، خود امی تھے اور مشکل سے پڑھ لکھ سکتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ جو ایک نظم ہے، قانون کا دفتر ہے، دعاؤں کی کتاب ہے اور مقدس کتاب بھی ہے۔ اور آج تک نوع انسانی کا چھٹا حصہ اسکی عزت کرتا ہے۔ اسے فصاحت و بلاغت، حکمت و صداقت کا معجزہ مانتا ہے۔ محمدؐ نے صرف اسی معجزہ کا دعوے کیا تھا۔ اسی کو انہوں نے اپنا دائمی معجزہ بنایا تھا اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ ضرور معجزہ ہے لیکن اس زمانے کے حالات اور ان پر ایمان لانے والوں کی بے انتہا عقیدت کا لحاظ کرتے ہوئے اور ان کا مقابلہ گرجا کے پوپوں یا مسیحی بزرگوں سے کرنیکے بعد

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ کے متعلق سب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی چیز یہ ہے۔ کہ انہوں نے کبھی معجزے دکھانے کی طاقت کا دعویٰ نہیں کیا۔ جو کچھ انہوں نے کرنے کا دعوے کیا۔ ان کے ماننے والوں نے انہیں کرتے دیکھا۔ وہ ضرور ایسے معجزوں کو ان سے منسوب کر سکتے تھے۔ جو کبھی انہوں نے نہ دکھائے تھے اور وہ ہمیشہ معجزات دکھانے سے انکار کرتے رہے۔ اس سے زیادہ ان کے خلوص کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟ محمدؐ نے اپنی زندگی کے اخیر تک صرف ایک ہی لقب کا دعوےٰ کیا۔ اور جسے بلند ترین فلسفہ اور سچی عیسائیت ایک دن ضرور تسلیم کرے گی۔ کہ وہ رسول تھے اللہ کے خاص رسول تھے۔"

(باسورتھ سمتھ۔ محمدؐ اور محمدیت۔ صفحہ ۳۴۰)

"محمدؐ کا نظام محض نقل یا خذ ما صفا کے اصول پر مبنی نہ تھا۔ یہ الہامی بھی تھا۔ بشرطیکہ کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہو جسے جملہ اچھائیوں کے مرکز سے نکلنے والا الہام کہہ سکیں۔ میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر قربانی دیانت، اپنے مقصد پر غیر متزلزل عقیدہ، بدی کے متعلق غیر معمولی معلومات اور اس کے دور کرنے کے بہترین طریقوں پر گہری نظر، الہام کی نمایاں علامتیں ہیں۔ تو یقیناً محمدؐ کا کام الہامی تھا۔"

(ڈاکٹر لائٹنر۔ دی ٹائمز اور سینٹ جیمز گزٹ لنڈن۔ ۸ر اکتوبر ۱۸۸۷ء)

"ایک ایسا نبی جس کے پاس کوئی معجزے نہ تھے۔ ایک مذہب جس میں کوئی راز کی باتیں نہیں اور ایک اخلاق جس میں محبت کا وجود نہیں۔ جس نے خون کی پیاس کی ہمت افزائی کی، اور جو ابتدا سے انتہا تک غیر محدود عیاشی ہے۔"

(شلیگل۔ تاریخ فلسفہ)

"محمدؐ کی کردار ایک تاریخی معمہ ہے۔ اور ان کی نیت اور منصوبوں کے متعلق بہت سے

قیاسات کئے گئے ہیں۔ کیا وہ ایک فریبی تھے، ایک مذہبی دیوانے تھے یا ایک دیانتدار انسان اور ایک پیامبرِ حق تھے؟"

(ٹی۔ پی۔ ہیوز)

مندرجہ بالا اقتباسات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جناب محمدؐ عربی کو دنیا والوں نے کن کن نظروں سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی اس عظیم ترین ہستی کے متعلق اب تک دنیا والوں کو کماحقہٗ آگاہی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جب کہ نشر و اشاعت کے وہ وسائل جو آج عالمِ وجود میں آئے ہیں، پہلے موجود نہ تھے۔

۴۔ محض تعریف یا تعریض سوانحیات کے مقصد کو فوت کر دیتی ہے

ظاہر ہے کہ ہر مؤرخ یا سیرت نگار اپنے جذبات سے مجبور رہے اور جس شخص کے متعلق لکھتا ہے یا تو اس کی ہر اچھی بات کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے اور برائیوں پر پردہ ڈالتا رہتا ہے۔ یا مخالفت پہ تُل گیا تو صرف کمزوریوں ہی پر نظر رہتی ہے اور ہر برائی کو پہاڑ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

ایسی صورت میں یہ بھی ہوتا ہے کہ حامیوں کی جماعت بسا اوقات ایسی چیزوں کو اپنے ہیرو کی طرف منسوب کر دیتی ہے۔ جو یا تو اس میں تھی ہی نہیں۔ یا اگر تھیں بھی تو مخصوص حالات کے تقاضے سے تھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ عوام اور معتقدوں کی نظر میں گو وہ چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن خود وہ اپنی صحیح پوزیشن سے ہٹ جاتا ہے۔

اسلئے موجودہ سیرت میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ بلا لحاظ اس امر کے کہ دنیا والے ان باتوں کو اچھا سمجھتے ہیں یا برا۔ ہم نے بے کم و کاست رسولؐ عربی کی سیرت کے ہر پہلو کو ترتیبِ قرآن کی تاریخی روشنی میں بیان کر دیا ہے۔ اور نہ کسی چیز کو بڑھانے کی کوشش کی ہے نہ گھٹانے کی

البتہ وہ باتیں جو عوام یا خواص نے اپنی خوش فہمی کی بنا پر آپ سے منسوب کر دی تھیں۔ انکو قرآن کی روشنی میں جانچنے کے بعد اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ درج کر دیا ہے اور اس کی قطعاً پروا نہیں کی کہ کوئی اسلامی یا غیر اسلامی فرقہ اس کے متعلق اپنی من مانی رائے قایم کر چکا ہے۔

۵۔ موجودہ سیرت کا مقصد

سیرت یا سوانح کا مقصد عموماً یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ کسی انسان کی زندگی کے کارناموں کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلو سامنے آجائیں۔ اور جو لوگ تاریخی کہانیوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ایک شخص کی زندگی کے حالات سے لطف بھی حاصل کریں اور اگر چاہیں تو عبرت اور سبق بھی۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کی پوری زندگی کے حالات نہیں لکھے جاتے۔ بلکہ صرف اس زمانے کے حالات لکھے جاتے ہیں جب وہ پختہ عمر کو پہنچ کر ایک خاص مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی زندگی کے حالات جاننے والے ہی اس دنیا میں باقی نہیں رہتے۔ یا اگر رہتے بھی ہیں تو اس شخص کی معمولی ابتدائی زندگی پر توجہ نہیں کرتے۔ اور بہت سی دلچسپ اور ضروری باتیں بھول جاتے ہیں۔

ہاں اگر کوئی شخص دیانتداری سے اپنی سرگزشت خود لکھے۔ تو ضرور اس کی پوری زندگی سامنے آسکتی ہے۔ لیکن اس میں بھی اکثر یہ نقص ہوتا ہے۔ بعض وہ چیزیں جو لکھنے والے کے خیال سے دلچسپ ہوتی ہیں۔ زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں اور دوسری چیزیں جو دوسروں کے لئے دلچسپ ہو سکتی ہیں وہ رہ جاتی ہیں اور لوگ پورے طور پر ان نفسیاتی کیفیتوں کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو سوانح نگار کے محرکاتِ عمل تھے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ رسولِ عربی کی سیرت کو بچپن سے وفات تک پورے طور پر

نمایاں کریں اور تاریخ، تمدن عرب نفسیات اور احوالِ جاہلیہ کے علاوہ قرآن کریم کی ناقابل تردید روشنی میں آپ کی سیرت کا مکمل نقشہ پیش کریں۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اب تک نامکمل سیرتوں اور خوش فہم راویوں کے بیانات سے آپؐ کی زندگی پر جو پردے پڑ گئے ہیں وہ ہٹ جائیں۔ اور رسولؐ عربی کی تعلیم کے حقیقی و بنیادی خط و خال نمایاں ہو جائیں

۶۔ موجودہ سیرت کی خصوصیّت

موجودہ سیرت کی خصوصیّت یہ ہے کہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے اور قرآن ایسی کتاب ہے جس کی صحت کے متعلق کسی مخالف کو بھی شبہ نہیں۔

سیرت کے دوسرے ماخذ احادیث و سیر تاریخ وغیرہ ہیں۔ ان کے متعلق اور خود قرآن کریم کے متعلق آنے والے صفحات میں ہم تفصیل سے لکھیں گے۔ یہاں اتنا لکھنا کافی ہے کہ قرآن کو اساس سیرت قرار دے کر اب تک کوئی سیرت نہیں لکھی گئی اور یہ کوشش اپنی نوعیّت کی پہلی کوشش ہے۔

اس کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام اور بانیِ اسلام کے متعلق جو غلط نظریات بن گئے ہیں یا بنائے جاتے ہیں، سب کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور رسول عربی صلعم کا اصلی اور حقیقی مقام سامنے آجاتا ہے۔

اب تک جو کچھ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں نے سیرت اور قرآن کو الگ الگ سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس بے معنی کوشش کی وجہ سے اتنی پیچیدگیاں بڑھ گئیں کہ خود مسلمان ہر قرن میں انہیں سلجھاتے رہے۔ اور اب تک وہ نہیں سلجھیں۔ لہٰذا بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ سیرت کی یہ خصوصیت ہے کہ اسلام اور بانیِ اسلام کے متعلق، قرآن نے جو معلومات مہیّا کی ہے وہ صرف

اس سیرت سے معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ سیرت ترتیبِ نزولِ قرآن کو اصل قرار دے کر مرتب کی گئی ہے۔ اب نہ اسلام کے کسی اصل و فرع کو سمجھنے میں کوئی دقت ہو سکتی ہے نہ بانیٔ اسلام کی زندگی کا کوئی گوشہ تاریکی میں رہ سکتا ہے۔

دُوسری فصل

سیرتِ نبوی کا اصلی و بنیادی ماخذ یعنی قرآنِ حکیم

۱۔ قرآن کریم

سیرت نبوی اور اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے اہم اور نہایت قابلِ اعتبار اور مستند ذریعہ قرآن کریم ہے۔

جب جناب رسولِ کریمؐ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو خدا کی طرف سے ان کے دل پر وحی آنے لگی۔ اور یہ سلسلہ آپ کی آخر عمر تک قایم رہا۔ حسب ضرورت یہ باتیں رسول اللہؐ کے دل میں آتیں اور زبان سے جاری ہو جاتیں۔ تیئیس سال تک یہ خدائی باتیں دل میں آتی رہیں اور آپ لوگوں کو سناتے رہے۔ کلام الٰہی کا یہ مجموعہ قرآن ہے۔ ماہ رمضان میں جب آپ کی عمر چالیس سال کی تھی۔ یہ سلسلہ شروع ہوا اور ربیع الاوّل میں بعمر ترسیٹھ سال ختم ہوا۔ (یعنی تقریباً ۶۰۹ء تا ۶۳۲ء)

مکّہ میں آپ نے تیرہ سال تک یہ کلام سنایا۔ اس کے بعد مدینہ ہجرت کی اور دس سال وہاں یہ سلسلہ جاری رہا۔ یوں تو ہر اَن پڑھ آدمی کا حافظہ پڑھے لکھے آدمی کے مقابلہ میں قوی ہوتا ہے لیکن عربوں کی یہ خصوصیت تھی۔ کہ وہ حافظے کے بہت قوی تھے۔ ہر شاعر کو نہ صرف اپنا کلام۔ بلکہ

دوسرے شاعروں کے ہزارہا شعر زبانی یاد رہتے تھے۔ اسی طرح لوگوں کو عرب کے خاندانوں کے سینکڑوں شجرے اور ہزارہا نام ہی یاد نہیں تھے بلکہ وہ گھوڑوں اور کتوں کے بھی لمبے لمبے شجرے یاد رکھتے تھے۔ اسی لئے مکہ کا قرآن مسلمانوں نے لفظ لفظ یاد کر لیا تھا اور خود رسول اللہ اور ان کے ساتھی اس خدائی کلام کو نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے۔

جب آپ مدینہ تشریف لائے اور ایک حد تک اطمینان نصیب ہوا۔ اور مسلمانوں کی جماعتی زندگی شروع ہوئی۔ تو قرآن کے باقاعدہ لکھے جانے کا اہتمام شروع ہوا۔ یوں تو اکثر مسلمان قرآن کو زبانی یاد کر لیتے تھے اور ان میں سے بعض لکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن مدینہ میں تین صحابیوں کا کام ہی یہ تھا کہ وہ وحی لکھا کریں۔ استیعاب (جلد اوّل صفحہ ۲۷) سے ہر قسم کے کاتبوں کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔ جو تین صحابی کتابت قرآن پر مدینہ میں مامور ہوئے تھے انکا حال درج ذیل ہے:۔

۱۔ اُبیّ بن کعب انصاریؓ۔ بیعت عقبہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔ اور رسول اللہ انہیں قرآن کا بہترین قاری سمجھتے تھے۔ زید بن ثابت سے پہلے وہ قرآن لکھنے کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ابن سعد کا بھی قول ہے کہ مدینہ آنے کے بعد جس شخص نے سب سے پہلے قرآن لکھنے کی خدمت انجام دی۔ وہ اُبیّ بن کعبؓ تھے۔ انہوں نے زیدؓ کے ساتھ بھی قرآن لکھا تھا۔

۲۔ زید بن ثابتؓ نے غزوۂ بدر۔ سنہ ۲ھ (سنہ ۶۲۴ء) کے بعد لکھنا پڑھنا ان قیدیوں سے سیکھا تھا۔ جو قریش کی فوج سے گرفتار کئے گئے تھے۔ رسول اللہ کی وفات تک آپ برابر قرآن لکھنے کی خدمت پر مامور رہے۔ جب آپ موجود نہ رہتے تو کوئی اور صحابی یہ خدمت انجام دے دیتا تھا۔

۳۔ عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق واقدی کا بیان ہے۔ کہ مدینہ میں یہ سب سے پہلے

قریشی ہیں جنہوں نے رسول اللہ کے حکم سے قرآن کی کتابت کی تھی۔ یہ حضرت عثمانؓ کے سوتیلے بھائی تھے۔ غلط لکھنے کی وجہ سے اس خدمت سے خارج کر دیئے گئے تھے۔ اسی لئے انکی کتابت کو خود رسول اللہ نے صحیح فرمایا۔

رسول اللہ کے زمانے تک پورا قرآن ایک جگہ لکھا ہوا مصحف کی صورت میں نہ تھا۔ اگرچہ اکثر صحابیوں کو پورا قرآن مختلف ترتیبوں سے زبانی یاد تھا۔ یہاں ترتیب کے معنی صاف کر دینے کی ضرورت ہے:۔

بحث ترتیب قرآن

قرآن کا جو حصہ مکہ میں نازل ہوا تھا۔ اسے رسول اللہ نے اپنے ساتھیوں کو سنا دیا تھا۔ ان میں سے اکثر نے ۵ نبوی میں ملک حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ اور انہوں نے مکی قرآن کے اس حصے کو جو اس وقت نازل ہوا تھا یاد کر لیا تھا۔ اسکے بعد ۷ سے ۱۰ نبوی تک آپ چند ساتھیوں کے ساتھ شعب ابوطالب میں محصور رہے تھے۔ اس زمانہ میں آپ کے ساتھ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مومن اور مشرک دونوں تھے۔ اور آپ کے مومن ساتھی اور خود آپؐ اس زمانے کے قرآن کو محفوظ رکھتے تھے۔ یعنی وہ لوگ جو ہجرتِ حبشہ کر چکے تھے اس حفظِ قرآن میں شریک نہ تھے۔ اس کے بعد جب شعب ابوطالب سے آپ کو آزادی ملی تو جو قرآن نازل ہوا وہ زیادہ تر آپ نے مکہ کے باہر کے قبائل کو سنایا۔

اس طرح مکی قرآن کی چار تاریخی ترتیبیں ہو گئیں۔ ایک حصہ تو وہ تھا جو ہجرتِ حبشہ سے پہلے کا تھا۔ دوسرا ہجرتِ حبشہ سے شعب ابوطالب تک کا تیسرا شعب کا اور چوتھا اس زمانے کا جب آپ نے قبائل میں تبلیغ کی تھی۔

ابتدا میں یہ حالت تھی کہ قرآن کے چھوٹے چھوٹے حصے یعنی مفصل سورے نازل ہوتے تھے اور لوگ انہیں سن کر مختلف ترتیبوں سے یاد کر لیتے تھے لیکن جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت

نازل ہوئی تو رسول اللہ نے قرآن کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے لیئے یہ حکم دیا۔ کہ ہر نئے سورہ یا ٹکڑے کے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بڑھا دینا چاہیئے۔ اس وقت سے قرآن کے ہر ٹکڑے یعنی سورہ کو جداگانہ حیثیت حاصل ہو گئی اور لوگ مختلف سورتوں کو علیحدہ علیحدہ یاد کرنے لگے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بسم اللہ مدینہ میں نازل ہوئی اور بقول ام خالد (یہ خالد بن سعید کی بیٹی تھیں) سب سے پہلے میرے باپ خالد بن سعید بن العاص اموی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہے۔ یہ خالدؓ حضرت ابوبکرؓ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ گویا وہ تیسرے یا چوتھے مسلمان تھے۔ پھر ۵ھ نبوی میں مع اہل و عیال حبشہ ہجرت کر گئے تھے اور ۷ھ (۶۲۳ء) میں فتح خیبر کے بعد مدینہ میں رسول اللہ سے آملے تھے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۷ھ تک جتنا بھی قرآن نازل ہو چکا تھا۔ اس کے مختلف حصوں کی مختلف سورتیں نہیں بنی تھیں۔ اس کے بعد بنیں (دیکھیئے اصابہ جلد اول۔ ترجمہ خالد بن سعید) اور (ابوداؤد۔ میں ابن عباس کی روایت۔ کہ کان رسول اللہ لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزل علیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ رواہ ابوداؤد) رسول اللہ نے اپنی زندگی ہی میں قرآن کے مختلف حصوں کو مختلف سورتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور ۷ھ کے بعد قرآن کا ایک خاص نظم قایم کر دیا تھا۔ اس نظم میں یہ بات تھی کہ رسول اللہ نے مکہ کی بعض سورتوں میں ان آیتوں کو ملا دیا تھا جو مدینہ میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ آیتیں محدثین نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں۔

لیکن اس زمانے میں یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کہ سورتوں کو کسی خاص ترتیب سے یاد کیا جائے۔ مومن اور کافر سب رسول اللہ کی زندگی اور ان کی جدوجہد سے واقف تھے۔ اور ہر شخص آپ سے سن کر فوراً یہ سمجھ لیتا تھا۔ کہ قرآن کے مختلف حصے کس زمانے سے متعلق ہیں اکثر صحابیوں کی زندگی ہی اس کشمکش میں گزری تھی اور وہ قرآن کی ایک ایک آیت کی تاریخ نزول اور

وجہ نزول سے آگاہ تھے۔ غرضیکہ انہوں نے قرآن کے مختلف حصوں کو اور بعض نے پورے قرآن کو حفظ کر لیا تھا اور بعض نے پورا قرآن جمع کر لیا تھا۔

اس زمانے میں ہماری دنیا کاغذ سے ناواقف تھی۔ اگرچہ چینی بہت ہی قدیم زمانے میں کاغذ بنا چکے تھے۔ لیکن یہ فخر صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ انہوں نے مشرق سے مغرب تک کاغذ کی صنعت کو پھیلا دیا۔ ترکستان میں مسلمانوں کو چند چینی قیدی جو چین کی کاغذ سازی کی صنعت کو جانتے تھے۔ ہاتھ آ گئے تھے۔ ان سے یہ صنعت سیکھ کر مسلمانوں نے اسے چھپا کر راز نہیں رکھا۔ بلکہ اسے عام کر دیا اور بہت زیادہ ترقی دی۔ جتنے کہ یوروپ والے تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اسی کاغذ کی بدولت دنیا سے اور خصوصاً یوروپ سے جہالت کی تاریکی دور ہوئی اور کہتے ہیں کہ دنیا پر مسلمانوں کا سب سے بڑا احسان یہی ہے۔ کہ انہوں نے کاغذ بنانا سکھایا۔ ڈریپر کہتا ہے کہ "جس طرح بطلیموسوں کے زمانہ میں سکندریہ میں کتابوں کے نقل کرنے کا محکمہ میوزیم میں قائم تھا۔ اسی طرح ہر گرجے اور مسیحی خانقاہ کے ساتھ کتابوں کے نقل کرنے کا ایک کمرہ الگ تھا۔ لیکن سوائے چین کے اور سب قدیم سلطنتیں مثلاً یونان، روما اور مصر پڑھنے والی جماعت کی بنیادوں پر قائم نہ تھی اور کل معلومات زبانی ہی ایک سے دوسرے شخص تک پہنچتی تھی۔ لیکن جب اسپین کے مسلمانوں نے ولینشیا اور مرقیہ کے باریک سن سے کاغذ بنا کر رواج دیا تو مشکل حل ہو گئی۔ اس سے پہلے دمشق میں روئی سے خریطۂ دمشقی (CHARTA - DAMASCENA) بنتا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے چین میں کئی قسم کے کاغذ بنتے تھے۔ تقریباً ۱۴۴۰ء میں یوروپ میں طباعت کا فن ایجاد ہوا اور دنیائے علم و عقل میں انقلاب آ گیا۔ علم زبان سے نہیں بلکہ تحریر سے ایک دوسرے کو پہنچنے لگا اور منبر کی جگہ کتاب اور اخبار نے لے لی۔ وہ انسان جو چپ چاپ گرجے میں بیٹھ کر ہفتہ میں ایک دفعہ وعظ سن آتے تھے۔ اب خود پڑھ کر سوچنے لگے۔ اور اصلاح مذہب (REFORMATONE) بغاوتِ مشن کا دروازہ کھل گیا۔ اور آخرکار سلطنت سے کلیسا کو علیحدہ کر دیا گیا۔ زبانی خطابت کی جگہ پریس نے لے لی۔ اور

انسان کی ذاتی رائے کو مذہب و بائبل کی تفسیر کے لئے آزادی مل گئی۔ لوتھر پر کفر کا فتوےٰ لگا اور وہ ذات باہر کر دیا گیا۔ لیکن وہ کب ماننے والا تھا۔ اس نے اس فتوے کو ہزاروں کے سامنے آگ لگا دی۔"

(یورپ کی ذہنی ترقی۔ جلد دوم۔ صفحات ۱۹۹ - ۲۱۵)

لیکن قرآن کی تدوین کے زمانہ میں کاغذ کا علم لوگوں کو نہ تھا۔ بابل میں مٹی کے کچے ٹھیکروں پر حرف کندہ کئے جاتے تھے۔ پھر انہیں آگ میں پکا لیتے تھے۔ مصر و ہندوستان میں بعض درختوں کے پتّوں اور چھالوں پر نوکدار قلم سے لکھتے تھے اور انہیں پے پی رس اور بھوج پتر کہتے تھے۔ ان پر لکھے ہوئے بہت پرانے نمونے اب تک موجود ہیں۔ عرب میں اور دوسرے ملکوں میں بھی پتھر کی سلّیوں پر قوانین کندہ کر دیتے تھے۔ روما میں اس قسم کی قانونی تحریریں عام تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بھی خدائی قانون الواح پر لکھا گیا تھا۔ ایران میں بہستن (بے ستوں) کے کتبے اور ہندوستان میں اشوک کے کتبے اب تک موجود ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب سے انسان نے غاروں میں تصویریں کھینچنا شروع کیں اسی وقت سے پتھر، ہڈی کے ہموار ٹکڑوں اور جانوروں کی کھالوں اور جھلیوں پر کتابت شروع ہو گئی تھی۔ پوری اوستا، توریت اور بعض دوسری کتابیں بیل کے چمڑوں پر لکھی ہوئی تھیں۔

قرآن ان ہی چیزوں پر لکھا ہوا تھا۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کو زبانی یاد تھا۔ رسول اللہؐ نے گو قرآن کی آیتوں کو مختلف سورتوں میں مقررہ مقامات پر رکھ دیا تھا۔ لیکن وہ ایک جلد میں مصحف کی صورت میں جمع نہ تھا۔ خود مصحف کا لفظ بعد کی اصطلاح ہے۔ جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مکمل قرآن کے لئے استعمال ہوئی۔

حاکم نے مستدرک میں جمع قرآن کے متعلق لکھا ہے۔ کہ قرآن تین مرتبہ جمع کیا گیا:-

۱- اوّل تو رسولؐ اللہ کی زندگی میں زیدؓ بن ثابت سے روایت ہے۔ کہ ہم رسول اللہ کے سامنے رقعوں سے قرآن جمع کیا کرتے تھے (عن زید بن ثابت قال کُنّا عند رسول اللہ صلعم نؤلف القرآن من الرقاع)

۲- دوسری دفعہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ہُوا۔ زیدؓ بن ثابت سے بخاری نے روایت کی ہے کہ اہل یمامہ کے قتل ہونے کے بعد مجھے ابوبکرؓ نے بلایا تو میں وہاں گیا۔ ان کے پاس عمرؓ بن الخطاب بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ میرے پاس آئے اور انہوں نے جنگ یمامہ میں قرآن کے قاریوں کے قتل کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر اسی طرح لڑائیوں میں قاریوں کا قتل ہوتا رہا۔ تو قرآن کا بہت سا حصہ جاتا رہے گا۔ اور ان کی رائے ہوئی کہ میں جمع قرآن کا حکم دوں۔ یہ سنکر میں نے ان سے کہا کہ ہم وہ چیز کیسے کر سکتے ہیں۔ جسے رسولؐ اللہ نے خود نہیں کیا۔ تو عمرؓ نے کہا کہ واللہ یہ اچھی بات ہے۔ اور بار بار یہی بات کہنے کے لئے میرے پاس آتے رہے۔ حتےٰ کہ اللہ نے اس بات کو میرے دل میں اتار دیا۔ اور میں نے بھی وہی رائے قائم کر لی جو عمرؓ نے قایم کی ہے۔

پھر زیدؓ کا بیان ہے کہ ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم ایک عقلمند اور اچھے چلن کے نوجوان ہو اور رسول اللہ کے زمانہ میں کاتب وحی رہ چکے ہو لہٰذا قرآن کو ڈھونڈھ کر ایک جگہ جمع کر دو۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو ہٹا دینے کا حکم دیتے تو یہ مجھ پر اتنا گراں نہ گزرتا جتنا قرآن کو جمع کرنے کا حکم تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے لکھی ہوئی چیزوں (عیسب ولخاف وغیرہ) اور لوگوں کے دلوں (یعنی انکے حافظے) سے پورا قرآن جمع کر دیا۔ صرف ایک آیت ابوخزیمہ انصاری کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ تھی۔ یعنی سورۂ توبہ کی آخری آیت۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ .... (ک ت -۶۸)

حضرت ابوبکرؓ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ عمرؓ اور زیدؓ مسجد نبوی کے دروازہ پر بیٹھیں۔

اور کتاب اللہ کے متعلق دونوں کے پاس اگر کوئی شخص دو گواہیاں لائے تو اس کو لکھ لیں (اخرج بن ابی داؤد من طریق ہشام بن عروہ عن ابیہ)

ابن حجر کا قول ہے۔ کہ دو شاہدوں سے مطلب اس کا حفظ ہونا اور لکھا ہوا ہونا ہے۔
لیکن سخاوی نے جمال القرا میں لکھا ہے کہ دو شہادتوں سے یہ مراد ہے کہ دو شخص اس بات کی شہادت دیں کہ یہ رسول اللہ کے سامنے لکھا گیا تھا۔ صرف حفظ ہونا کافی نہ تھا (ک ت۔ ۶۹)

۳۔ حاکم کا بیان ہے۔ تیسری مرتبہ قرآن عثمانؓ کے زمانہ میں جمع ہوا (یعنی اس کی سورتوں کو ایک خاص ترتیب دی گئی)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زید نے مختلف سورتوں کو جس طرح رسول اللہ نے مرتب کر دیا تھا شہادتیں لے لے کر الگ الگ لکھ لیا۔ لیکن مختلف سورتوں کو ایک دوسرے کے بعد رکھ کر ان کی کوئی ترتیب متعین نہیں کی۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد جتنا بھی لکھا ہوا قرآن تھا۔ وہ صحف، لخاف، رقاع، عسب اقتاب اور اضلاع پر لکھا ہوا تھا اور ایک ڈوری سے بندھا ہوا آپ کے گھر میں موجود تھا۔ لیکن زیدؓ نے جب حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے قرآن جمع کیا تو وہ سب سورتیں خلیفۂ وقت کے پاس ایک مجموعہ میں محفوظ رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس یہ مجموعہ رہا۔ اور ان کی شہادت کے بعد آپ کی صاحبزادی ام المومنین حفصہؓ کی حفاظت میں رہا۔

غرضکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے فوراً بعد ۱۱ھ میں ہی زیدؓ نے خلیفۂ وقت کے حکم سے باقاعدہ شہادت کے ساتھ صحیفوں میں لکھ دیا تھا۔ لیکن جب ۲۵ھ میں خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کے حکم سے امیر معاویہؓ نے آرمینیا اور آذربائیجان پر حملہ کیا تو اس فوج میں مختلف مفتوحہ ملکوں کے مسلمان ساتھ تھے۔ شام کا لشکر حبیب بن مسلمۃ الفہری کی سرداری میں تھا۔ عراق کا

لشکر سلمان بن الباہلی کی سرداری میں تھا اور مدائن کے لشکر کے سردار حذیفہ بن یمان تھے۔ یہاں باب الابواب (دربند) کی لڑائی میں ہر ملک کے مسلمان جمع ہوئے تو حذیفہ بن یمان نے دیکھا کہ مختلف ممالک کے لوگ مختلف قرأتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ عراق والے عبداللہ بن مسعود کی قرأت مانتے تھے اور شام والے اُبی بن کعب کی۔

لوگوں میں دوسری قرأتیں بھی رائج تھیں۔ اسلئے کہ حضرت علیؓ نے اپنا قرآن ترتیب نزول کے مطابق جمع کیا تھا۔ جو اگرچہ انہوں نے اپنی خلافت میں رائج نہیں کیا لیکن ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس ترتیب و قرأت کی بھی پیروی کرتے ہوں۔ اسی طرح اہل بصرہ ابو موسیٰ الاشعری کی قرأت کی پیروی کرتے تھے۔ اور اُن کے قرآن کا نام لباب القلوب رکھا تھا اور اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں۔ کہ مختلف آیتوں کو مختلف سورتوں میں ایک خاص ترتیب و نظم سے رسولؐ اللہ نے رکھا تھا اور آپکی پیروی ہر شخص کرتا تھا۔ لیکن مختلف سورتوں کی کوئی خاص ترتیب مقرر تھی یا نہ تھی۔ اس کے متعلق تین قول ہیں:-

(ا) پہلا قول یہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے ان سورتوں کی ترتیب بتادی تھی۔ اس کے حامی ابوبکر بن الانباری۔ ابوجعفر النحاس اور ابن الحصار تھے۔

(ب) دوسرا قول یہ ہے۔ کہ ترتیب سور اجتہاد صحابہ پر منحصر تھا۔ اسکے حامی امام مالک، قاضی ابوبکر اور ابوالحسین احمد بن فارس تھے۔ (دیکھیے کتاب مسائل الخمس اور ک۔ ت صفحہ ۷۸)

(ج) تیسرا قول یہ ہے۔ کہ بعض توقیفی ہیں اور بعض کی ترتیب اجتہاد صحابہ پر منحصر ہے۔ قاضی ابومحمد بن عطیہ، ابوجعفر بن الزبیر اسکے حامی تھے۔

ترتیب سُوَر کے سلسلہ میں یہاں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ صحیح بخاری میں یوسف بن مالک سے مروی ہے۔ کہ " میں ایک روز

حضرت عائشہؓ کی خدمت میں موجود تھا۔ کہ ایک عراقی آیا اور اس نے پوچھا کہ کفن کونسا اچھا ہوتا ہے انہوں نے فرمایا۔ کہ یہ سوال فضول سا ہے۔ مرنے کے بعد کیسا ہی کفن ہو۔ تیرا کیا نقصان ہے۔ پھر اس نے ام المومنین سے ان کا مصحف دیکھنے کے لئے مانگا۔ آپؓ نے پوچھا۔ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ میں اپنا قرآن اسی کے مطابق جمع کرنا چاہتا ہوں۔ آپؓ نے فرمایا۔ "جیسا بھی تیرے پاس ہے (یعنی جس ترتیب سور سے تیرے پاس ہے) اس کے پڑھنے میں تیرا کیا نقصان ہے" پھر کہا۔ کہ واقعہ یہ ہے کہ پہلے مفصل (یعنی چھوٹی چھوٹی) سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ جن میں جنت دوزخ کا ذکر تھا۔ پھر جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو حلال حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر سب سے پہلے یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو۔ تو عرب کہتے کہ ہم شراب کبھی ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ یا پہلے یہ حکم نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو وہ اس کو چھوڑنے سے انکار کر دیتے۔

جب مکہ شریف میں یہ آیت نازل ہوئی کہ (بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر) تو میں چھوٹی بچی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی۔ ہاں جب سورہ بقر اور نساء نازل ہوئیں تو میں رسول اللہ کی خدمت میں موجود تھی"۔ یہ کہہ کر آپؓ نے اپنا مصحف نکالا اور اس عراقی کو سورتوں کی آیتیں لکھوا دیں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے۔ کہ مہاجرین میں عبداللہ بن مسعود سے بہتر کوئی قاری نہ تھا۔ یہ جامع قرآن بھی تھے۔ لیکن ان کا قرآن نہ ترتیب نزول کے مطابق تھا۔ نہ اس ترتیب کے مطابق تھا۔ جو حضرت عثمانؓ نے دی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے قرآن سے معوذتین یعنی سورہ ۱۱۳ اور سورہ ۱۱۴ کو الگ رکھا تھا اور تشہد کو قرآن میں داخل کر لیا تھا

(اتقان ۷۵)

لیکن نووی نے شرح تہذیب میں اور ابن حزم نے بھی لکھا ہے۔ کہ یہ ان پر تہمت ہے۔

(اتقان ۸۵)

یہ نہایت قدیم الاسلام تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد رسولؐ اللہ کی خدمت گاری میں رہتے تھے۔ انہوں نے دو ہجرتیں کی ہیں۔ یعنی ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ، بدر۔ اُحد۔ خندق، بیعتِ رضوان اور کل غزوات میں رسولؐ اللہ کے ساتھ تھے۔ رسولؐ اللہ کے بعد بھی یرموک کی جنگ میں شریک تھے۔ رسولؐ اللہ سے یہ اقرب الناس سمجھے جاتے تھے۔ اسی لئے بہت سے صحابہ اور تابعین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ کہ اگر کسی شخص کو میں امیر مقرر کرتا کہ وہ دوسرے سے مشورہ نہ کرے تو میں ابن اُم عبد (یعنی عبداللہ بن مسعود) کو کرتا۔ جب عمرؓ بن الخطاب نے عمارؓ بن یاسر کو کوفہ کا امیر کر کے روانہ کیا تو ان کے ساتھ عبداللہؓ بن مسعود کو بھیجا کہ وہ معلم اور وزیر ہیں۔ ان دونوں کے قول کو سنو اور اطاعت کرو۔ انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ انہوں نے سب سے پہلے بلند آواز سے مکہ میں قرآن پڑھا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ اور ان میں کچھ چشمک سی ہو گئی تھی۔ جس پر انہیں حضرت عثمانؓ نے مدینہ واپس بلا لیا تھا۔ اور وفات تک وہیں قیام رہا۔

ابن سعد کہتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کر دیا تھا اور جب ۳۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ تو حضرت عثمانؓ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ یہاں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ جب تک وہ کوفہ کے معلم و قاضی رہے وہ قرآن کی تعلیم اسی ترتیبِ سُوَر کے ساتھ دیتے رہے۔ جس طرح انہوں نے اپنا قرآن مرتب کیا تھا۔ زید بن ثابت گو کاتبِ قرآن تھے۔ مگر عبداللہؓ بن مسعود پر انہیں تفوق حاصل نہیں تھا۔

عبداللہؓ کا قول ہے کہ میں خود رسولؐ اللہ سے ستر سورتیں سیکھ چکا تھا۔ حالانکہ زیدؓ چوٹیاں رکھائے ہوئے پھرتے تھے۔ یعنی بالکل بچے تھے۔ اسی لئے جب زیدؓ بن ثابت کا جنگ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کی تالیف کے لئے تقرر کیا۔ تو عبداللہ بن مسعود نے

اسے ناپسند کیا۔ اور علانیہ اس ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ سنہ ۱۱ھ سے سنہ ۳۲ھ تک وہ اپنی قرأت یعنی اپنی ترتیب دی ہوئی سورتیں لوگوں کو سکھاتے رہے۔ ان کی تعلیم کوفہ سے عراق میں پھیلی۔ سنہ ۲۱ھ تک آپ کا قیام حمص (شام) میں رہا۔ اور جب زیادؓ بن حنظلہ کے بعد عمارؓ بن یاسر کا تقرر بحیثیت امیر کوفہ کے ہوا تو سنہ ۲۱ھ سے عبداللہؓ بھی عراق ہی میں رہے۔ اور قاضی و معلمِ قرآن رہے۔

ان کے علاوہ اُبی بن کعب انصاری جو زید بن ثابت سے پہلے وحی لکھا کرتے تھے، ان کا قرآن بھی ایک خاص ترتیب سے مرتب تھا۔ وہ بھی نہ ترتیبِ نزول کے مطابق تھا نہ مصحفِ عثمانی کے مطابق۔ رسولؐ اللہ سے روایت ہے۔ کہ میری اُمت کا بہترین قاری اُبیؓ ہے اور اُبیؓ سے آپؐ نے فرمایا تھا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں تم کو قرآن سناؤں۔

جس طرح عراق والے عبداللہؓ بن مسعود کی پیروی کرتے تھے اسی طرح اہلِ دمشق (شام) اُبی بن کعب کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔ انہوں نے اپنا قرآن بصرہ سے قریب ایک گاؤں میں جمع کیا تھا جسے لوگ قریۃ الانصار کہتے تھے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کا جمع کیا ہوا قرآن جس کی سورتیں الگ الگ قرطاسوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ تھا مسلمانوں کو الگ الگ سورتیں معلوم تھیں۔ لیکن ان کی کوئی خاص ترتیب نہ تھی۔

(دیکھیئے۔ الفہرست۔ الندیم صفحہ ۲۸)

اہلِ حمص حضرت مقدادؓ کی قرأت کو سب سے بہتر جانتے تھے۔ غرضیکہ بہت سی قرأتیں رائج تھیں۔

اختلافِ قرأت | یہ اختلافِ قرأت سورتوں کی ترتیب کے متعلق تھا۔ قرآن کی آیتوں کی ترتیب

خود رسول اللہؐ نے دے دی تھی۔ اور سورتیں بھی متعین کر دی تھیں۔ اسلئے نہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ کہ ہر سورت کن کن آیتوں پر مشتمل ہے۔ نہ یہ ہو سکتا تھا کہ آیتوں کی ترتیب کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا مفہوم ہی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو جاتا۔ اور رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں مختلف آیتوں کا مختلف سورتوں میں جو نظم قایم کیا تھا وہ باقی نہ رہتا۔

اختلاف قرأت سے یہ بھی مطلب نہیں کہ لوگوں کے تلفظ اور لہجے میں اختلاف تھا۔ اسلئے یہ اختلاف نیچرل ہے۔ اور بعض حروف اور لہجے ایسے ہیں۔ جو خاص خاص قوموں کی زبانوں اور گلوں کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ اختلافات اب تک باقی ہیں اور جب تک دنیا کی ایک زبان نہ ہو جائے باقی رہیں گے۔ افغان تشدید بمشکل سے ادا کرتے ہیں۔ جگادھری والے غیر مشدد حرف کو بھی مشدد بولتے ہیں۔ سنسکرت میں ہائے مخلوط کثرت سے ہے۔ ایرانی اور یوروپین، باوجودیکہ ایرین زبان بولتے ہیں۔ ہائے مخلوط نہیں ادا کر سکتے۔ انگریز ٹ اور ڈ بولتے ہیں۔ لیکن فرنچ اور عرب انہیں بول ہی نہیں سکتے۔ اسی طرح گو، جرمن۔ فرنچ اور چینی غین بول سکتے ہیں۔ لیکن انگریز اس عربی حرف کو ادا نہیں کر سکتے۔

اختلاف قرأت صرف ترتیب سُوَر میں تھا۔ اسلئے کہ جہاں سے اختلاف شروع ہوا تھا۔ وہ لوگ عرب تھے۔ اُن کا تلفظ عربی تھا۔ اور جن لوگوں کی قرأت کی وہ پیروی کرتے تھے۔ وہ بھی عرب تھے۔ اور رسول اللہؐ کی زبان سے قرآن سن اور سمجھ چکے تھے۔ عموماً عبداللہؓ بن مسعود اور اُبیؓ بن کعب کے سے ماہرین زبان و قرأت کی پیروی کی جاتی تھی۔

یہ سب اصحاب خالص عرب تھے۔ قریش کے تلفظ و لہجے سے واقف تھے۔ بلکہ رسول اللہؐ کے قول کے مطابق بہترین قاری و عالم قرآن تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف ترتیب سُوَر کا تھا۔ جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اس قول سے بھی ثابت ہے۔ کہ جب حضرت عثمانؓ نے

حذیفہؓ بن یمان کی رپورٹ پر زیدؓ بن ثابت کے مرتب کردہ قرآن کی پیروی کا حکم دیا۔ تو عبداللہؓ بن مسعود نے ایک خطبہ دیا اور کہا (ایأمرونی ان اقرأ القرآن علی قرأۃ زید بن ثابت؟) تعجب ہے۔ کہ مجھے حکم دیا جاتا ہے۔ کہ میں زیدؓ بن ثابت کی قرأت کی پیروی کروں؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں رسول اللہؐ سے ستر سورتیں سیکھ چکا تھا۔ حالانکہ زیدؓ بچے تھے۔ واللہ قرآن میں کوئی ایسی چیز نازل نہیں ہوئی کہ میں نہ جانتا ہوں کہ کس کے متعلق وہ نازل ہوئی ہے اور مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا کوئی نہیں ہے (ولو اعلم احدا تبلغنیہ الابل اعلم بکتاب اللہ منی لاتیتہ) اگر میں کسی کو اپنے سے زیادہ عالم پاتا۔ تو اس کے پاس حاضر ہوتا۔ پھر جو کچھ کہا تھا اس پر حیا کی اور کہا (ما انا بخیر منکم) میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔" (اصابہ - ۳۶۱)

حاصل کلام یہ ہے۔ کہ حذیفہؓ جب کوفہ واپس آئے۔ تو انہوں نے لوگوں کو اس اختلاف قرأت سے ڈرایا۔ لیکن عبداللہؓ بن مسعود کے پیرؤں نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا اور حذیفہ نے غصہ میں کہا کہ اگر میں امیر المومنین عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو رائے دوں گا۔ کہ اس کا علاج کریں۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے دو گروہ آذربایجان میں ایک دوسرے کی تکفیر محض اختلاف قرأت کی وجہ سے کر رہے تھے۔ بلکہ فساد پر تیار تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ کو بھی ناخوشی ہوئی۔

حذیفہؓ مدینہ آئے اور حضرت عثمانؓ کو اختلاف امت پر توجہ دلائی اور پورا قصہ بیان کر کے سب کو ایک قرأت پر جمع کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے صحابہ سے ۳۰ھ میں مشورہ کیا۔ ان میں حضرت علیؓ بھی تھے (ابن الاثیر - ج۳ - ص۴۲) آپ نے ان اوراق کو جن پر زیدؓ نے ۱۱ھ میں قرآن لکھا تھا۔ اُم المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے پاس سے منگوایا اور ایک کمیٹی بنادی

کہ اس کی نقل کر لی جائے۔ نقل کرنے والوں کی اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل چار اشخاص تھے۔

۱۔ زیدؓ بن ثابت۔

۲۔ عبداللہؓ بن الزبیر۔

۳۔ سعیدؓ بن العاص۔

۴۔ عبداللہؓ بن حارث بن ہشام۔

ان لوگوں کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ اگر کسی لفظ کے متعلق اختلاف ہو تو وہ اسی طرح لکھا جائے جس طرح قریش بولتے ہیں۔ زیدؓ کے علاوہ باقی اشخاص قریش کے قبیلہ سے تھے۔

(اتقان۔ ۵۹)

اس قرآن کی نقلیں کوفہ، بصرہ، بحرین، یمن، شام اور مکہ روانہ کی گئیں۔ ایک نقل حضرت عثمانؓ کے پاس رہی جسے "امام" کا نام دیا گیا تھا۔ میور کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ کا قرآن "امام" قرطبہ پہنچا۔ وہاں سے اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد فارس میں تھا۔ ابن بطوطہ کا قول ہے کہ یہ جامع بصرہ میں تھا۔ اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ماسکو کے مسلم کتابخانہ میں ہے۔ جہاں ۱۹۰۴ء میں یہ بخارا سے لایا گیا ہے۔" (ا۔ت ۶۱)

شام کا نسخہ جامع اموی دمشق میں سلطان عبدالحمید خان کے زمانہ تک موجود تھا۔ لیکن مسجد میں آگ لگ جانے کی وجہ سے نذر آتش ہو گیا۔

سالم بن عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ جس زمانے میں امیر معاویہؓ کی طرف سے مروان مدینہ کا امیر تھا۔ تو اس نے ام المومنین حفصہؓ سے وہ صحیفہ منگوایا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔ مگر انہوں نے نہیں دیا۔ ان کے انتقال کے بعد عبداللہ بن عمر سے مروان نے اس صحیفہ کو منگوا لیا۔ اور چاک کرا دیا۔ اور کہا کہ یہ کام اسلئے کیا ہے۔ کہ زمانہ گزرنے کے بعد لوگ

اس مصحف کو لے کر اختلاف نہ پیدا کرنے لگیں۔

جہاں تک اختلاف کا تعلق ہے۔ حضرت عثمان رضؓ کے سرکاری مصحف سے سوائے عبداللہ رضؓ بن مسعود کے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ جہاں تک ترتیب آیات کا تعلق ہے۔ وہ چونکہ رسولؐ اللہ کی مقرر کردہ تھیں۔ ان سے کوئی اختلاف کر ہی نہ سکتا تھا۔ الفاظ کے تلفظ میں اگر اختلاف تھا تو وہ بھی سطحی تھا۔ اس لئے کہ جس زبان میں رسولؐ اللہ نے قرآن دیا تھا۔ وہی زبان اس کے لئے سند تھی۔ اور رسولؐ اللہ کی زبان عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھی۔ اور اگر کوئی قبیلہ حتّیٰ کو عتّیٰ یا آیاک کو ھیاک کہتا تھا تو وہ اس تلفظ کے لئے قدرت نے اسے مجبور بنایا تھا۔ اور قیاس غالب یہی ہے کہ زیدؓ بن ثابت نے جو کاتبِ وحی بھی تھے۔ قرآن کا تلفظ رسولؐ اللہ کے تلفظ کے مانند ہی لکھا ہوگا۔ اور جب حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمع قرآن کیا اس وقت بھی صحابہ کی شہادت نے کسی تلفظ کو غیر فصیح نہ ہونے دیا ہوگا۔ پھر بھی عبداللہ بن مسعود نے اختلاف کیا۔ وہ عبداللہ رضؓ بن مسعود جو رسولؐ اللہ کے ساتھ بحیثیت خادم کے رہتے تھے اور خود بھی مکہ میں عرصہ سے رہتے تھے اور ان کے صحتِ تلفظ اور صحتِ قرآن پر خود رسولؐ اللہ شاہد تھے۔ پھر انہوں نے کس بنا پر اختلاف کیا؟ وجوہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ انہیں یقین تھا اور ہمیں بھی یقین ہے کہ رسولؐ اللہ کی صحبت میں مسلسل رہنے کی وجہ سے جس صحت سے وہ رسولؐ اللہ کے قریشی تلفظ کو ادا کر سکتے تھے وہ اس کی کافی ضمانت تھی۔ کہ بمقابلہ دوسروں کے خصوصاً زیدؓ بن ثابت انصاری کے ان کے طرزِ ادا کو فیصلہ کن تسلیم کیا جائے اور کسی کمیٹی کی رائے پر نہ چھوڑا جائے خواہ اس میں کثرت قریشیوں ہی کی ہو۔ جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی کمیٹی سے ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اختلاف تلفظ باقی ہے۔ اور عبداللہؓ بن مسعود نے جہاں جہاں سرکاری مصحف کے تلفظ سے اختلاف کیا ہے وہ ہر قرآن میں حاشیہ پر درج کر دیا جاتا ہے

اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اور ان کے کوفہ کے ساتھیوں نے اس مصحف کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا۔ جو دربار خلافت سے وہاں بھیجا گیا تھا اور جب ان کے پاس بھی یہ گشتی حکم پہنچا۔ کہ سرکاری مصحف کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محو کر دیا جائے تو عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے تابعین نے اس سے قطعی انکار کر دیا۔ اور برسر منبر ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ کہ جس کا جی چاہے اپنے مصحف میں تبدیلی کر لے۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ میں نے رسول اللہؐ سے سیکھا ہے اس کو ترک کر کے من یغلل یأت بما غل یوم القیامۃ کا مصداق بنوں۔ واللہ۔ رسول اللہؐ کے اصحابؓ سمجھا کرتے تھے کہ میں کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالموں میں سے ہوں۔"

اس سلسلہ میں شقیق بن سلمہ کا بیان ہے کہ ان کی کسی نے تردید یا نکتہ چینی نہیں کی۔ مگر زہری کا قول ہے بعض صحابیوں کو ابن مسعودؓ کا قول پسند نہیں آیا۔ لیکن ابن مسعودؓ کا سرکاری مصحف کی ترتیب سُوَر سے اختلاف تھا۔ یعنی جو ترتیب سُوَر زیدؓ نے دی تھی۔ وہ ترتیب نزول کے مطابق نہ تھی۔ اسلئے وہ قرآن کی سورتوں کی جدید ترتیب کو پسند نہیں کرتے تھے اور قرآن کی قرائت اسی ترتیب سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جو زیدؓ نے دی تھی۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ اختلاف تلفظ کا نہ تھا۔ بلکہ اختلاف قرائت سُوَر یا اختلاف ترتیب نزول کا تھا۔

۲۔ جہاں تک ترتیب سُوَر کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق ہم حضرت عائشہؓ کا قول اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اس سے اور بہت سے صحابیوں کے عمل سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں اگر تلاوت کے لئے کوئی بھی ترتیب سُوَر رکھی جائے۔ اب تک عالم اسلامی میں یہ رواج ہے کہ قرآن کی پانچ۔ سات۔ بارہ یا زیادہ سورتوں کا مجموعہ اپنی اپنی پسند کے مطابق ترتیب دے لیا جاتا ہے اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سنّیوں کے علماء تسلیم کرتے ہیں کہ ترتیب سُوَر باجتہاد صحابہ ہوئی ہے۔ اگر توقیفی ہوتی یعنی رسول اللہ سے بتا جاتے تو صحابہ کیوں اس سے

اختلاف کرتے رہے ہیں شیعہ علماء۔ تو وہ قائل ہیں۔ کہ موجودہ قرآن ہی تھا۔ جس کی پیروی حضرت علیؓ بن ابی طالب نے بھی کی اور جو قرآن ترتیب نزول کے مطابق انہوں نے جمع کیا تھا۔ اسے اپنی خلافت کے زمانے میں بھی شایع و رائج نہیں کیا۔ لہٰذا قرآن کے متعلق اگر بقول حضرت عائشہؓ یہ معلوم ہو کہ اس کے مضامین و احکام کی ترتیب نزول کیا ہے تو کافی ہے۔ یعنی سورتوں کو کسی ترتیب سے بھی پڑھے۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔

لیکن عبداللہؓ بن مسعود یہ چاہتے تھے۔ کہ ان ہی کی ترتیب سُوَر بھی باقی رہے۔ اور گو اُبیؓ بن کعب۔ اور حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ نے اپنی اپنی ترتیب سُوَر کو مصحف عثمانی کے مطابق کرلیا اور کوئی اختلافی آواز بلند نہیں کی۔ لیکن عبداللہؓ بن مسعود ان چار بڑے قاریوں میں سے تھے جن کے متعلق خود رسول اللہ کا حکم تھا۔ کہ ان سے قرآن سیکھو۔ ان میں سے صرف عبداللہؓ بن مسعود ہی وہ شخص تھے جو مہاجر تھے۔ دوسرے مہاجر یعنی جو قریش کے تلفظ اور رسول اللہ کی صحبت سے فیضیاب ہوچکے تھے۔ وہ سالمؓ مولی ابوحذیفہ تھے۔ اور وہ جنگ یمامہ میں شہید ہوچکے تھے باقی دو حضرات انصار تھے۔ ان میں سے معاذ بن جبل انصاری حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں وفات پاچکے تھے۔ صرف ایک انصاری یعنی اُبیؓ بن کعب باقی تھے۔ جنہوں نے اس ترتیب سے جو سرکاری کمیٹی نے دی کوئی اختلاف نہیں کیا۔ تلفظ کے اعتبار سے تو کمیٹی کے تین اراکین کی رائے کو زیدؓ بن ثابت تک پر ترجیح تھی۔ رہا یہ امر کہ ترتیب سُوَر کس طرح ہو۔ اس میں کسی کو اختلاف ہی نہ تھا اور صحابہ کی کثرت رائے اسی طرف تھی کہ کل دیار و امصار میں ایک ہی ترتیب سُوَر رائج ہو تو بہتر ہے اس سے یہ فائدہ تھا کہ لوگوں کو ایک ہی ترتیب سے قرآن کو حفظ اور نقل کرنے میں آسانی ہوسکتی تھی اور یہ اندیشہ تھا کہ عوام میں اختلاف ترتیب (یعنی اختلاف قرأت) سے الجھن پیدا ہوجائے گی۔ اور لوگ سمجھنے لگیں گے۔ کہ کئی قسم کے قرآن یعنی مختلف ترتیب مضامین کے قرآن دنیا میں موجود ہیں

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس زمانے میں کتابت قرآن تو بہت زیادہ رائج ہو چکی تھی لیکن نہ رسم خط میں اصلاح ہوئی تھی۔ نہ قرآن پر اعراب لگے تھے۔ نہ نقطہ دار حروف میں نقطے تھے چونکہ پڑھنے والے عرب تھے اور عربی زبان ان کی مادری زبان تھی۔ لہذا انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ پھر قرآن زیادہ تر نماز میں پڑھا جاتا تھا اور لوگ مجبور تھے کہ جو کچھ نماز میں پڑھیں وہ حفظ ہو۔ کسی لکھے ہوئے قرآن کو دیکھ کر نماز میں قرآن نہیں پڑھا جاتا تھا اسلئے چھوٹی سورتیں تو اکثر لوگوں کو خود بخود یاد ہو جاتی تھیں۔ البتہ لمبی لمبی سورتیں چند بار پڑھنے کے بعد یاد ہوتی تھیں۔ اسی لئے مصحفِ عثمانی میں یہ اہتمام ہے کہ :-

۱- پہلے سبع طوال۔ یعنی سات لمبی سورتیں درج کی گئی ہیں (۲ تا ۹)

۲- ان کے بعد مئین۔ یعنی تقریباً سو آیتوں والی سورتیں ہیں۔ جو چھبیس ہیں۔ (۱۰ تا ۳۵)

۳- ان کے بعد مثانی ہیں۔ جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ یہ پندرہ ہیں۔ (۳۶ تا ۵۰)

۴- پھر مفصل ہیں۔ یعنی وہ چھوٹی چھوٹی سورتیں جو ایک دوسرے سے بار بار علیحدہ کی گئی ہیں۔ مفصل کے معنی جڑاؤ گلوبند کے بھی ہیں۔ یہ پچاس ہیں۔ (۵۵ تا ۱۱۴)

بہر حال عبداللہ بن مسعود کی رائے تھی جو ترتیبِ سُوَر انہوں نے دی ہے اور جو تلفظ وہ کرتے ہیں وہی قایم رکھا جائے۔ تلفظ تو ان کا باقی رہا اور ان کے علاوہ بھی دوسرے مستند تلفظ جاری ہیں۔ لیکن ان کی ترتیب قرآن کچھ عرصہ تک تو رہی۔ لیکن ۳۲ھ میں ان کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ زیدؓ بن ثابت ان کے بعد عرصۂ دراز تک زندہ رہے اور مصحفِ عثمانی کی ترتیب عام طور سے مسلمانوں میں رائج ہو گئی ۔

حاکم کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جو تالیف قرآن ہوئی۔ اس میں یہ ہُوا کہ مختلف سورتوں کو ایک ترتیب سے مرتب کر دیا گیا (اتقان صد ۵۹) یعنی جمع ابوبکرؓ اور تالیف عثمانؓ میں فرق ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مختلف سورتوں کو الگ الگ مکمل طور پر لکھا گیا تھا لیکن حضرت عثمانؓ نے ان سورتوں کو جو کسی ترتیب سے نہ تھیں۔ ایک خاص ترتیب دی۔ اور سوائے عبداللہ بن مسعود اور ان کے تابعین کے اور کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور چونکہ مصحف عثمانی کی ترتیب توقیفی نہیں ہے۔ بلکہ اجتہاد صحابہ پر مبنی ہے۔ اسلئے عبداللہ بن مسعود یا دوسرے مجتہدوں کو پورا حق ہے۔ کہ وہ قرآن کو جس ترتیب کے ساتھ چاہیں پڑھیں۔

یہی قرآن جو تئیس سال کے قریب قریب رسولؐ اللہ پر خدا کی طرف سے آتا رہا۔ انہی لفظوں میں، اور اسی ترتیب آیات، اور اسی تلفظ کے ساتھ اب تک کل عالم میں موجود ہے۔ جس میں رسولؐ اللہ نے دنیا کو مخاطب کر کے دیا تھا۔ اس کی مختلف سورتوں میں آیتوں کی ترتیب خود رسولؐ اللہ نے دے دی تھی۔ لیکن اس کی سورتوں کو مختلف ترتیبوں سے لوگوں نے حفظ کر لیا تھا اور لکھ لیا تھا۔

خلیفہ اوّل نے رسولؐ اللہ کی وفات کے فوراً بعد ہی ان سورتوں کو کل مسلمانوں کی شہادت کے ساتھ قرطاسوں پر لکھوا لیا تھا۔ اور خلیفہ ثالث نے ان سورتوں کو ایک خاص ترتیب دے دی تھی۔ جن میں سے بعض تو اسی ترتیب کے مطابق ہیں جو رسولؐ اللہ تلاوت قرآن میں ملحوظ رکھتے تھے اور بعض کی ترتیب ان صحابہ اور علمائے قرآن کے اجتہاد پر مبنی ہے جو مدینہ میں موجود تھے۔ اس ترتیب کو کل عالم اسلام نے قبول کر لیا تھا۔ صرف حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ وہی ترتیب مان لی جائے جو

انہوں نے اپنے قرآن کی قایم کر رکھی ہے۔ لیکن اختلاف قرأت یعنی اختلاف تلفظ کو جو مختلف قاریوں اور خود عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کو تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ ترتیب سُوَر وہی ہے جو حضرت عثمانؓ کی مقرر کردہ کمیٹی نے دی تھی۔

اگر اس کا علم ہو کہ کونسی سورت یا آیت کس موقعے پر نازل ہوئی تھی۔ جیسا کہ صحابیوں اور تابعین کو تھا اور اب بھی علماء کو ہے تو موجودہ مصحف یعنی مصحف عثمانی ترتیل کے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر ارتقائے اسلام اور رسول اللہ کی سیرت کا تاریخی مطالعہ کرنا ہو تو قرآن کو سیرت کے ساتھ ساتھ اسی ترتیب سے پڑھنا ضروری ہے جس ترتیب سے یہ نازل ہوا ہے؛

۲۔ یورپ والوں کی قرآن کے متعلق رائیں

وہی ٹامس کارلائل جس نے آنحضرت کو بزرگ ترین نبی قرار دیا ہے۔ قرآن کے متعلق یوں لکھتا ہے:۔

"مجھے کہنا پڑے گا۔ کہ جتنی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ ان میں قرآن کی سب سے زیادہ تکلیف دہ پڑھائی ثابت ہوئی ہے۔ یہ ایک تھکا دینے والا، خام، بے جوڑ اور الجھے ہوئے خیالات کا مجموعہ ہے۔ جس میں بار بار چیزوں کو دہرایا گیا ہے۔ طول خیالی اور پھنساوٹ ہے نہائت ہی خام اور بے جوڑ ہے۔ مختصر یہ کہ ایسی الجھن ہے جس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ سوائے ادائے فرض کے خیال کے کوئی چیز کسی یوروپین کو قرآن پڑھنے پر آمادہ نہیں کر سکتی"۔

سیموئیل زویمر جس کا مقصد عیسائیت کو بڑھانا ہے۔ قرآن کے متعلق کہتا ہے:۔

"اس کتاب کو مسلمان اپنے نبی کا بڑا زندہ معجزہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ ایک خاص قسم کی تصنیف ہے۔ یہ نئے عہد نامہ (انجیل وغیرہ) سے کسی قدر چھوٹی کتاب ہے۔ اس میں ایک سو چودہ

باب ہیں جن کے عجب عجب عنوان ہیں۔ جو اس باب کے کسی لفظ یا جملہ سے لئے گئے ہیں مثلاً گائے، شہد کی مکھی، عورت، مال غنیمت، چیونٹی، مکڑی، دھواں، قلم وغیرہ۔ اس کتاب میں تاریخی ترتیب سے مضامین نہیں ہیں۔ نہ اس میں منطقی سلسلہ ہے۔ نہ خطابی خاتمۂ کلام اس کے الجھے ہوئے جملے ایک ہی ساتھ واقعہ اور وہم، قانون اور افسانہ، دعا اور بددعا کو بیان کر دیتے ہیں مسلمان بھی بغیر تفسیر کے اسے نہیں سمجھ سکتا مسلمان اسے زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے نہایت ہی خوبصورت سمجھتے ہیں۔ اور اس کے ماخذ اور مضامین کے اعتبار سے اسے معجزہ سمجھتے ہیں۔ عرب کے ادبی نقطۂ نظر سے یقیناً یہ عجیب و غریب کتاب ہے، اس کا ترنم دل کو لبھا لیتا ہے۔ اور کبھی کبھی نہایت ہی شاعرانہ خیالات کو نہایت شاندار زبان کا لباس پہنایا گیا ہے۔ . . . . اس کی تعلیم میں بہت سی خرابیاں ہیں:

(ا) یہ تاریخ کی غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔

(ب) اس میں نہایت خرافات افسانے لکھے ہوئے ہیں۔

(ج) یہ ایک غلط حال دنیا کی پیدائش وغیرہ کا بتاتا ہے۔

(د) یہ وہمی باتوں سے بھرا پڑا ہے۔

(ہ) یہ غلامی، بیبیوں کی کثرت، طلاق، مذہبی تعصب، پردہ اور عورتوں کی ذلت، اور سوشل زندگی کو گندا کرتا ہے۔

یہ سب خرابیاں تو معمولی درجہ کی ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ قرآن ہمیشہ گناہ سے نجات حاصل کرنے کے مسئلہ کو ہمیشہ معمولی درجہ دیتا ہے، اور قربانی سے معافی یا نجات حاصل کرنے کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے قرآن اُن سب مقدس کتابوں سے ادنےٰ درجہ کی کتاب ہے جو مصر قدیم، ہندوستان اور چین میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کے خلاف یہ مذہب توحید الٰہی کو

بتاتا ہے۔" (زویمر۔ اسلام، نیویارک۔ ۱۹۰۴۔ صفحات ۹۰-۹۱)

سیل کا ترجمۂ قرآن یورپ میں بہت مشہور ہے۔ اس کے متعلق سٹینلی لین پول اپنی کتاب (خطبات و گفتگوئے محمدؐ رسول اللہ میکملن۔ لندن ۱۹۰۵ء) کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

"اس ترجمہ کی جلدوں پر اگر کوئی نظر ڈالتا بھی نہ پسند کرے تو وہ قابل الزام نہیں ہے اس لئے کہ اتنی بُری چھپی ہیں۔ اتنی بدنما جلدیں ہیں۔ اور اس کے شایع کرنے اور چھاپنے میں اس بدذوقی کا اظہار کیا گیا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اور کتاب کے اندرون کے متعلق، ٹائپ اور کاغذ نہیں۔ بلکہ نفس مضمون کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کہ کسی طرح یہ پڑھنے والے کے لئے دلچسپ نہیں ہو سکتا۔

سیل نے قرآن کو قدیم طریقہ والوں کی ترتیب کے مطابق درج کر دیا ہے یعنی تاریخی ترتیب سے درج نہیں کیا۔ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ سیل کے زمانے میں قرآن کی تاریخی ترتیب دریافت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس پرانی ترتیب کا یہ نتیجہ ہے کہ الجھی ہوئی عبارت کا اثر دل پر پڑتا ہے اور کارلائل پر بھی اس بات کا اثر پڑا۔ اور کارلائل ہی نہیں۔ بلکہ موجودہ نسل کے اکثر آدمیوں پر یہی اثر پڑا ہے۔ محمدؐ کے متعلق عام لوگوں کی جو معلومات ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبوّت کی زبان میں بولا ہوا غیر منظم کلام کسی طرح دل کو نہیں لبھا سکتا تھا۔

"سیل کے ترجمۂ قرآن کے متعلق عوام کا طرزِ عمل بڑی حد تک بے جا نہ تھا۔ لیکن اس ترجمہ کی خرابیوں کو اگر سیل سے منسوب کیا جائے یا کسی حد تک وہی اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے تو لوگوں کا خیال قرآن کی طرف سے بدل سکتا ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کوئی بڑی کتاب نہیں ہے۔ اور پھر یہ ذہن نشین کیجئے کہ یہ کتاب اتنی غیر منظم اور بے ترتیب نہیں ہے۔ جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس کی آیتوں کی تعداد کا لحاظ کیا جائے تو قرآن عہد جدید کا صرف دو تہائی ہے

اور اگر یہودی بزرگوں کی ان کہانیوں کو جو محمدؐ نے بار بار دہرائی ہیں۔ حذف کر دیا جائے۔ تو یہ کتاب صرف اناجیل و اعمال کے برابر ہے اخبار نیویارک ہیرلڈ کا سنڈے ایڈیشن اس سے تین گنا بڑا ہوتا ہے۔ بہرحال قرآن کے بنیادی مضامین اس اندازے سے بھی بہت کم ہیں۔

"قرآن کا ابہام زیادہ تر اس کی معمولی ترتیب کی وجہ سے ہے یعنی لمبی سورتیں پہلے اور چھوٹی سورتیں بعد میں درج کی گئی ہیں مسلمان اس ترتیب پر مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ جو بعض دوسری مقدس کتابوں سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ بہرحال جرمن نقادوں نے ایسا طریقہ معلوم کر لیا ہے۔ کہ تخمیناً تاریخی ترتیب سے اسے مرتب کر لیا جائے۔ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن جو نتیجے نکلے ہیں وہ یقینی ہیں۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ قرآن کی سورتیں (یا جیسا کہ میں انہیں خطبات محمدؐ کے نام سے لکھنا پسند کرتا ہوں) بعض یقینی تاریخی زمانوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اور اگرچہ ہم ہر خطبہ کا خاص تاریخی مقام متعین نہ کر سکیں۔ ہم بہر صورت بتا سکتے ہیں۔ کہ یہ کس زمانے سے متعلق ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ محمدؐ کی تعلیم اور ان کے طرز بیان اور طریقہ کے ارتقاء پر صاف روشنی پڑتی ہے۔"

"جب قرآن کو اس طرح مرتب کر لیا جائے جیسا کہ مسٹر راڈول نے کیا ہے اور جیسے لوگوں کو کثرت سے پڑھنا چاہیئے۔ تو قرآن کی بے ترتیبی اور الجھن کا اثر دماغ سے جاتا رہتا ہے اور ہمیں ایک عظیم الشان دماغ کی ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے جس میں ہمیں ایک مقدس روح کی کمزوری اور طاقت دونوں کی جدوجہد نظر آتی ہے اور ایک بزرگ انسان کی لازمی تلوّن مزاجیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی ان خطبات محمدؐ کو پڑھے جنہیں میں نے پروفیسر نولڈیکے کی ترتیب تاریخی کے مطابق مرتب کیا ہے۔ تو وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان کا کوئی مخصوص

مقصد نہیں ہے۔ یا ان میں نظم و ترتیب نہیں ہے یہ ممکن ہے ان میں نحو کا دب بنے والی ہم آوازی ہو۔ میں بھی مانتا ہوں کہ وہ اکثر سیلانی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا ارادہ اور خیال کا مقصد اتنا ہی واضح اور صاف ہے جتنا کہ روز روشن۔"

(لین پول خطبات و گفتگوئے محمدؐ۔ دیباچہ)

۳۔ قرآن کی اہمیت اور وہ علوم جو قرآن کی وجہ سے پیدا ہوئے

ہم نے اوپر دیکھا۔ کہ قرآن وہ مجموعہ مضامین ہے جو رسول اللہؐ نے دنیا کو دیا۔ جو نہایت احتیاط سے جمع کیا گیا اور اب تک اپنی اصلی حالت پر باقی ہے۔ دنیا کی کوئی مقدس کتاب نہ اس احتیاط سے جمع کی گئی۔ نہ خود کسی مذہب کے بانی نے اس کتاب کو باقی رکھنے کے متعلق اتنی دلچسپی لی۔

خود مسلمانوں نے قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے متعلق جو حیرت انگیز کام کیا ہے۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ اس کو مفصّل بیان کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے لیکن یہ بتانے کے لئے کہ قرآن کی وجہ سے کتنے علوم و فنون مسلمانوں نے زندہ کر دیئے۔ اور کتنوں کو ایجاد کر دیا مختصر طور پر ہم درج ذیل کرتے ہیں۔ اگر تفصیل سے دیکھنا ہو تو الندیم کی 'الفہرست'، ابن خلکان کی 'وفیات الاعیان' اور حاجی خلیفہ کی انسائیکلوپیڈیا ہزاروں مصنفوں کے نام بتا سکتی ہیں۔

کتابت قرآن نے لکھنے پڑھنے کو بہت ترقی دی۔ اور علم کے متعلق سب سے پہلی سورت شروع ہوئی جب اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی۔ اس وقت بقول بلاذری مکہ میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے:

عمر بن الخطابؓ، علیؓ بن ابی طالب، عثمانؓ بن عفانؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ۔ طلحہؓ،

یزید بن سفیان، ابوحذیفہ، حاطب، ابوسلمہ، ابان بن سعید، خالد بن سعید، عبداللہ بن سعد، حویطب، ابوسفیان، معاویہ، جہیم۔ علاء الحضرمی،

بلاذری کا قول ہے۔ کہ مرامر۔ اعلم اور عامر ساکنان بولان نے عربی خط سریانی خط کی مناسبت سے ایجاد کیا تھا۔ پھر ان سے اہلِ انبار نے یہ خط سیکھا۔ اُن سے اہلِ حیرہ نے، ان سے بشیر بن عبدالملک صاحب دومتہ الجندل نے، اور اس سے سفیان بن اُمیہ بن عبدشمس اور ابوقیس نے مکہ میں یہ خط سیکھا۔

بقول ابن الندیم پہلے مکی خط تھا۔ پھر مدنی بنا، پھر بصری ہُوا۔ پھر کوفی خط ہو گیا۔ اسکے بعد اور بہت سے خط ایجاد ہوئے۔

پہلے قرآن میں نقطے دار حرفوں میں نقطے نہ تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی ہدایت سے ابوالاسود نے نقطے ایجاد کئے۔ بعض کہتے ہیں کہ نصر بن عاصم نے یہ کام کیا۔ اور بعض کہتے ہیں حجاج بن یوسف کے حکم سے نصر بن عاصم یا یحییٰ بن العمیر نے نقطے اور اعراب ایجاد کئے۔ یہ سب پہلی صدی کے نصف تک ہُوا۔

رفتہ رفتہ کتابت خوشنویسی میں بدل گئی۔ خلیفہ ولید کے زمانہ میں خالد بہترین کوفی خوشنویس تھا۔ مسجد نبوی میں سورہ والشمس زرین حروف میں اسی کے قلم سے لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہارون الرشید کے زمانے میں حسام بصری اور مہدی کوفی مشہور تھے۔ مامون کے زمانے میں احول ماہر فن تھا۔ غرضکہ اس فن نے یہ ترقی کی کہ اسے فنِ شریف قرار دیا گیا۔ سلاطین، وزراء اور امراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ جو سب سے پہلے خوشنویسی سیکھتے اور اس کی قدر کرتے تھے سینکڑوں خط ایجاد ہوئے۔ مثلاً مرصع۔ نسخ، ریاس، پھر رقاع و غبار۔ پھر ابن مقلہ نے بدیع ایجاد کیا۔ یہ بے مثل خوشنویس تھا۔ آخر میں ثلث، نسخ۔ تعلیق۔ ریحان، محقق۔ رقاع کو زیادہ ترقی ہوئی

اور اکبر کے زمانے میں اشرف خاں تعلیق کا ماہر کامل تھا۔ اس سے پہلے امیر تیمور کے زمانے میں نسخ اور تعلیق سے ملا کر میر علی تبریزی نے نستعلیق ایجاد کیا تھا۔ لیکن ابوالفضل کہتا ہے کہ اس سے پہلے بھی یہ خط لکھا جاتا تھا۔

(ب) کاغذ سازی

پہلے پتوں، چھالوں اور کھالوں پر لکھائی ہوتی تھی۔ دنیا پر قرآن کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کی بہترین کتابت کے لئے فن کاغذ سازی کو اتنی ترقی دی۔ کہ کل دنیا میں پھیل گیا۔ اس کی ترقی سے کتابیں سستی ہوئیں اور کتابوں نے پڑھنے والوں کو سوچنے اور سمجھنے کی طرف مائل کیا۔ فلسفہ بڑھا۔ پھر سائینس نے اس کی جگہ لے لی اور دنیا مہینوں کی دُوری منٹوں میں طے کرنے لگی۔

(ج) مدرسے

کتابوں نے مدرسوں کو ترقی دی۔ ہر مسجد اور گرجے کے ساتھ ایک مدرسہ اور ایک محکمۂ نقل قایم ہوگیا۔

(د) علم تفسیر قرآن

جب مسلمانوں نے دنیا کی دو بڑی شہنشاہتوں سے ٹکر لی۔ تو مختلف قوموں اور مذہبوں کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔ جن کی زبان عربی تھی۔ وہ تو قرآن کو کما حقہٗ سمجھتے تھے۔ لیکن رسولؐ اللہ کے صحابیوں کی وفات کے بعد اس کے سمجھنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت پڑی۔ اول یہ کہ عربی زبان کی لغت اور گرامر متعین ہو جائے اور دوسرے یہ کہ صحابیوں نے رسولؐ اللہ کو جو کہتے اور کرتے دیکھا ہے وہ بھی تاریخی حیثیت سے مدون ہو جائے۔ پہلی چیز نے ادب و لغت پیدا کیا، اور آخری ضرورت نے علم الحدیث بنایا۔ اور پھر ہر زمانے میں کثرت سے تفسیریں لکھی گئیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

(ہ) لغت و گرامر

لغت و گرامر کی ضرورت نے اسلام سے پہلے کا جتنا کلام

نظم و نثر کی سب کو جمع کرا دیا۔ اور عربی زبان کا تقابلی مطالعہ بھی شروع ہوگیا۔ اس طرح ایک نیا لٹریچر تیار ہوگیا۔

(و) علم حدیث رسولؐ اللہ کے قول اور فعل کے متعلق مسلمانوں نے نہایت چھان بین کے ساتھ حالات جمع کئے ہیں۔ اسے حدیث کہتے ہیں۔ ابتدا میں اس کی ضرورت اس لئے ہوئی تھی کہ رسولؐ اللہ کی زندگی اور اسلام کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ لیکن بعد میں بعض مسلمانوں نے حدیثوں میں بناوٹی باتیں داخل کرنا شروع کر دیں اور اپنے سیاسی یا مذہبی مسلک کو ان سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اسلئے محققوں نے چند عقلی اصول تیار کئے اور جو حدیث ان کے معیار پر صحیح اُتری اس کو مانا اور کمزور اور بناوٹی باتوں کو چھوڑ دیا۔

(ز) فن رجال صحیح اور بناوٹی حدیثوں میں امتیاز کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ یہ معلوم ہو کہ جن لوگوں نے حدیث کی روایت کی ہے وہ سچے اور سمجھدار تھے یا نہیں۔ لہٰذا ہزارہا راویوں کی سوانحعمریاں مرتب کی گئیں۔ اسے علم رجال کہتے ہیں۔

(ح) علم تاریخ و جغرافیہ اگر قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق پڑھا جائے تو وہ ایک تاریخ کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے مسلمانوں نے دنیا میں فن تاریخ و جغرافیہ کو جن علمی اصولوں پر قائم کیا۔ وہ آج تک اپنی آپ مثال ہیں۔ فلسفۂ تاریخ اور قوموں کے بننے بگڑنے کے متعلق جو نظریات مسلمانوں نے بنائے وہ بھی قرآن ہی کے رہین منت ہیں۔ اسی طرح جغرافیہ اور سیاحت کے شوق کو اتنی ترقی ہوئی۔ کہ ہر سمندر میں مسلمانوں کے جہاز نظر آنے لگے۔ یورپ والوں کا قول ہے کہ جہازیوں کا سمت نما

جو عربوں کی ایجاد ہے۔ کاغذ کے بعد مسلمانوں کا دنیا پر دوسرا اہم احسان ہے۔

(ط) فلسفہ اور طبعی علوم جہاں جہاز رانی اور خشکی کے سفروں کی وجہ سے عربوں نے نجوم و ہیئت پر علمی انداز میں غور و فکر شروع کی۔ وہاں قرآن کے حکم کے مطابق زمین و آسمان کی ہر چیز اور طبعی علوم کا باقاعدہ سائنٹفک مطالعہ شروع کر دیا۔ یونان کے حکماء زندہ کئے گئے اور پھر موجودہ سائنس کی راجر بیکن سے بہت پہلے بنیاد ڈال دی۔ طب، طبعیات، ہندسہ، ریاضی، کیمیا۔ نباتات وحیوانات کا علم، ہیئت اور دوسرے طبعی علوم کو مسلمانوں نے قرآن کو سمجھنے اور قرآن کے حکم کے مطابق خدا کی نشانیوں (آیات اللہ) پر غور و فکر کرنے کے لئے وہ کام کیا۔ کہ دنیا بہت آگے بڑھ گئی۔ اور یورپ کا ذہنی انقلاب ان ہی کی بدولت ہوا۔

(ی) علوم مغازی و سیر قرآن اور سیرت کے سمجھنے کے لئے غزوات کی تفصیلی تاریخ جاننا ضروری ہے۔ اس پر مسلمانوں نے خاص توجہ کی۔ اسلئے یہ چیز عام دلچسپی کی بھی تھی اور آنحضرتؐ کے زمانے کے سیاسی اصول بھی ان سے معلوم ہوتے تھے اس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کسی قدر تفصیل سے کریں گے۔

۴۔ قرآن سمجھنے میں دشواریاں اور اُن کا حل

قرآن، انجیل سے بہت چھوٹی کتاب ہے۔ لیکن لین پول کا یہ قول بالکل سچا ہے۔ کہ مسلمان بھی اسے بغیر تفسیر کے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ کیوں ہے؟ کیا قرآن کی زبان اتنی مشکل ہے کہ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو گئی ہے؟ یا اس کا طرز بیان اتنا پیچیدہ ہے کہ انسان اسکا عادی نہیں؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور جیسا کہ قرآن خود بار بار کہتا ہے کہ یہ ایک آسان کتاب ہے

تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ لوگ باوجود اتنی تفسیروں کے اس مختصر کتاب کے مضامین سمجھنے میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں؟ ہم یہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھ کام کرنے والوں کی وفات کے بعد قرآن کے سمجھنے کی دقّت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور جب مختلف فتنے اور سیاسی ہیجان کم ہوئے اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے مضبوط سلطنت قایم کرلی تو انہیں علوم کی طرف توجہ ہوئی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قرآن سمجھ سے باہر ہوتا جاتا ہے۔ پھر کیا تھا۔ پوری قوم کی قوم قرآن سمجھنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ قرآن مرکز علوم بن گیا اور جو شخص جس فن کا ماہر تھا اُس نے اس نقطۂ نظر سے قرآن کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً

اوّل۔ لغوی دشواریاں

چونکہ قرآن نے عرب میں ایک علمی انقلاب پیدا کر دیا تھا اور لکھنا پڑھنا عام طور پر جاری ہو گیا تھا۔ اسلئے اکثر لفظوں اور محاوروں کے معنی جو غیر متعین تھے وہ متعین ہو گئے۔ قرآن کی بہت سی اصطلاحات ابتدا میں کچھ تھیں اور قرآن کا نزول ختم ہونے تک دوسرے معنی بھی ان کے ساتھ پیدا ہو گئے تھے اس لئے صحابہ کا دَور ختم ہوتے ہی قرآن کے بہت سے لفظ غریب ہو گئے۔ یعنی وہ لفظ عام طور پر یا تو استعمال ہوتے ہی نہ تھے یا ان کے معنی بدل گئے تھے اور لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو گئے تھے۔ محاوروں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور طرز بیان بھی علمی بنیادوں پر قایم کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک ساتھ ہی بہت سے لغوی علموں کی تحقیق و تدوین شروع ہو گئی۔

(۱) لغت

الفاظ کو جمع کرنے اور ان کے معنی متعین کرنے کے سلسلہ میں بڑے بڑے لغوی پیدا ہو گئے۔ مثلاً

ابوعمرو اسحاق بن مرار الشیبانی (۹۶ - ۲۰۶ھ / ۸۲۵ء) مصنف لغت کتاب الجیم و نوادر کبیر وغیرہ

عبدالملک الاصمعی۔ دور عباسیہ کا مشہور مصنف (۱۲۳ - ۲۱۶ھ / ۷۴۰ - ۸۳۱ء)

ابو عبیدہ، ابو نواس کا استاد تھا۔ اور الاصمعی سے اس کی چشمک رہتی تھی۔
۱۱۴ - ۲۱۰ھ
۷۳۳ - ۸۲۶ء

ابو زید الانصاری (ماہر قیا اور غریب اللغات)۔ ۹۰ سال سے زیادہ زندہ رہا۔
۱۱۹ - ۲۱۵ھ
۷۳۵ - ۸۳۰ء

ابو عثمان - المبرد کا استاد تھا - المتوفی ۲۴۹ھ

ابو العیناء - تیسری صدی ہجری کا مشہور لغوی تھا۔

ابن قتیبہ - صاحب کتاب المعارف و ادب - الکاتب وغیرہ - ۲۱۳ - ۲۷۰ھ / ۸۲۹ - ۸۸۴ء

ابن دُرید - نحوی - شاعر - ماہر انساب تھا۔ ۲۲۳ - ۳۲۱ھ / ۹۳۳ء - اس نے اپنے استاد ابو بکر الانباری کی مدد سے پندرہ سال میں کتاب العزیزی غریب القرآن کے متعلق تحریر کی۔

ب - غریب القرآن

لغت کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن کے ایک ایک لفظ کی تحقیق ہوئی اور جو لفظ بنی امیہ کے زمانہ تک غریب ہو گئے تھے۔ ان کی لغتیں تیار ہو گئیں۔ ان میں راغب اصفہانی اور ابو حیان کی المفردات مشہور ہیں۔ زجاج، فراء، اخفش اور ابن الانباری نے بھی معنی القرآن کے متعلق بہت کام کیا ہے۔

ج - غیر حجازی الفاظ

قرآن میں قریش کے خالص عربی استعمال ہوئی ہے۔ مسافروں اور حاجیوں کی آمد و رفت نے سینکڑوں سال کے عرصہ میں بہت سے عربی مگر غیر حجازی الفاظ زبان میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ تحقیق کی گئی کہ کون کون سے لفظ یمن کے تھے یا عمان کے بنو ھوازن کے تھے۔ یا بنو کنانہ - بنو تمیم وغیرہ کے۔

د - غیر عربی الفاظ

اسی طرح بہت سے فارسی، یونانی، رومی، نبطی - عبرانی -

حبشی۔ قبطی۔ سریانی۔ زنگی۔ مغربی اور ہندی لفظ عربی بن گئے تھے اور قریش کی زبان پر رواں تھے۔ یہ ایک اہم ترین کام تھا۔ جس میں مزید تحقیقات کی گنجایش باقی ہے۔

لسانیات کے سلسلہ میں موجودہ زمانے میں بہت کچھ کام ہؤا ہے۔ اور مذاہب اور زبانوں کے ماخذوں کے متعلق بہت سے نظریات بنے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام قرآن ہی کی وجہ سے شروع ہؤا۔

مکہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان کی ایک منزل تھا۔ اور ان لفظوں کے علاوہ جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ بہت سے غیر عربی لفظ عام طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اگر ہر زمانے اور ہر قوم کے لفظ کلام عرب سے جمع کئے جائیں تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن قوموں سے کس کس زمانہ میں عربوں کا اختلاط زیادہ رہا۔ اور کہاں کہاں سے ان کے تجارتی اور سیاسی تعلقات تھے۔

(ہ) حروف مقطعات

قرآن کے شروع ہی میں حروف مقطعات کی یعنی ان حرفوں کی بحث آجاتی ہے۔ جو الگ الگ بعض سورتوں کے شروع میں لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً الف۔ لام۔ میم۔ یا حا میم عین سین۔ قاف وغیرہ۔ ان کے معنی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو گئے ہیں یعنی ان کے متعلق قطعی طور پر یہ معلوم نہیں کہ ان کا کیا مفہوم ہے۔ اسی لئے بہت سے نظریات بن گئے ہیں۔ اگر دوسری زبانوں اور خصوصیت سے اس زمانے کے عربی کلام میں اس قسم کے استعمال کو تلاش کیا جائے تو اُن حرفوں کو قطعی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

(و) وجوہ اور نظائر

ایک ہی لفظ کے کئی معنی بھی ہوتے ہیں۔ اور مختلف لفظ ہم معنی بھی ہوتے ہیں۔ ان کا سمجھنا کسی زبان کے سمجھنے کے لئے

بہت ضروری ہے۔ نظائر کا تعلق لفظ سے ہوتا ہے اور وجوہ کا معنی سے ہوتا ہے۔ اس پر کافی کام ہوا۔ مثلاً

وجوہ :- صلاۃ کے دو معنی ہیں۔ رحمت و عبادت۔
ھدی کے سترہ معنی ہیں۔ ثبات۔ بیان۔ دین۔ ایمان۔ امام۔ قرآن حجت وغیرہ
فتنہ کے کئی معنی ہیں۔ شرک۔ قتل۔ گناہ۔ مرض۔ عبرت وغیرہ
قضاء کے کئی معنی ہیں۔ فراغ۔ امر فیصل وغیرہ۔
امرت کے کئی معنی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

(ز) مستثنیات فی المعنی | پھر اس سلسلہ میں وہ لفظ علیحدہ کئے گئے جو صرف ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ اور اگر ان میں مستثنیات تھے تو وہ بتائے گئے

مثلاً :- اسف کے معنی ہمیشہ حزن کے ہوتے ہیں۔ بعل ..... شوہر ... سوائے
اسف کے معنی حزن۔ الا ایک مقام پر (دیکھیے اتقان فصل ۴۹)

زوج " " بعل "
خرس " " بکم "
طمانیتہ " " سکینہ "
نار " " سعیر "

غرضیکہ لغت کے سلسلہ میں جو کام قرآن کی وجہ سے ہوا۔ وہ حیرت انگیز ہے۔ لغت کے بڑے بڑے امام پیدا ہوئے۔ اور لغت کے متعلق کوئی معلومات ایسی نہ تھی۔ جو بہم نہ پہنچائی گئی ہو۔ امام ثعالبی نیشاپوری کی کتاب فقہ اللغۃ اور سیوطی کی کتاب المزہر ؎

(ھ) تدوین کلام جاہلیہ | کہا گیا ہے۔ کہ ان الشعر دیوان العرب یعنی عرب کے متعلق

جو کچھ آپ جاننا چاہیں وہ ان کے اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے۔ ان کی سوشل، دینی اور سیاسی زندگی کی پوری کیفیت ان کے کلام سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ان کی نفسیاتی کیفیتوں کی پوری جھلک اور ان کے فلسفہ اور ادب کا ہر پہلو اُن کے کلام سے نمایاں ہے۔ ان کی مفاخرت، شجاعت اور سخاوت و مروّت اور ان جذبات کے نتائج شراب، جوا، انتقام، مہمان نوازی سب کی مکمل تاریخ مل جاتی ہے۔

حماد الراویہ، مفضل ضبی، ابو تمام اور دوسرے مؤلف کافی مشہور ہیں کلام جاہلیہ بہت کچھ جمع ہوا ہے اور بہت کچھ بعد میں تصنیف بھی ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے۔ اہل زبان کے لئے یہی کلام سند کا درجہ رکھتا تھا۔ بہت سے شاعروں کے دیوان جمع کر لئے گئے ہیں۔ پھر منتخبات کثرت سے ہیں۔ ان کے علاوہ جاحظ۔ ابن قتیبہ۔ مبرّد۔ تیسری صدی ہجری کے۔ اور ابن عبدربہ، قالی و ابو الفرج اصفہانی وغیرہ چوتھی صدی کے مشہور نثر نگار گزرے ہیں۔ ان کتابوں میں بھی کثرت سے کلام جاہلیہ کے شواہد موجود ہیں۔

دوم۔ گرامر کی دشواریاں

(۱) نحو

عربی زبان سامی زبان کی نہایت ترقی یافتہ صورت ہے۔ جب سامیوں کا بابل میں دور دورہ تھا اور وہ مصر و عرب (بلکہ سندھ تک) پر چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت سے سامی زبان دنیا میں پھیل رہی تھی۔ جس طرح بعد میں آریوں کا دور دورہ ہوا اور ایرین زبان مختلف شاخوں میں تقسیم ہو گئی۔ حتّٰے کہ قدیم ایرین اور موجودہ یورپ اور ہندوستان کی سینکڑوں زبانوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ اسی طرح سامی زبان کی مختلف شاخوں میں ایک شاخ عربی زبان ہے۔ جو ہزاروں سال سے برابر ترقی کر رہی ہے۔ اور چونکہ

عرب پر دوسرے زبان والوں کا سیاسی غلبہ کبھی نہ ہوا تھا۔ اسلئے اپنی خصوصیات میں عربی زبان دوسری سامی زبانوں سے زیادہ خالص اور زیادہ بہتر حالت میں موجود ہے:

قرآن کے زمانے میں عربی تحریری زبان نہ رہ گئی تھی۔ لیکن اس کی گرامر اور بیان کے طریقے متعین ہو چکے تھے۔ شاعری بہت عام تھی اور ہر صنف میں ترقی کر چکی تھی۔ اور ذخیرۃ الالفاظ لاتناہی تھا۔ اسی لئے خود عربوں کو ماہرین زبان اور شعراء سے لفظوں کے صحیح معنی پوچھنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسی لئے یہ ضروری ہوا کہ صرف و نحو اور معانی و بیان کے متعلق مستند معلومات کتابوں میں لکھ لی جائے۔ اس سلسلہ میں مشہور مصنف درج ذیل ہیں:۔

ابو الاسود الدئلی تابعی (سنہ ۶۰۳ - ۶۸۸ء)، نے حضرت علیؓ کے حکم سے گرامر مرتب کی

خلیل بن احمد (سنہ ۱۰۰-۱۷۰ھ / ۷۱۹ - ۷۹۱ء)۔ نے لغت پر کتاب العین سب سے پہلی کتاب لکھی

سیبویہ (۱۲۰-۱۶۱ھ / ۷۴۷-۷۷۹ء) شاگرد خلیل۔ زبردست نحوی و لغوی تھا خلیل کی مدد سے نحو پر ایک مستند تصنیف کی۔ جس کا نام "کتاب" تھا۔ یہ بصری نحویوں کا سرگروہ تھا۔ اور عربی نحو کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اسی زمانہ میں الامین بن ہارون الرشید کا استاد الکسائی بھی تھا۔ اور کوفہ کے نحویوں کا سرگروہ مانا جاتا تھا۔ (۱۱۲-۱۸۹ھ / ۷۳۳-۸۰۵ء)

الفراء (۱۴۴-۲۰۷ھ / ۷۶۱-۸۲۲ء) جس نے نحو و لغت پر خلیفہ المامون کے حکم سے مشہور کتاب الحدود تصنیف کی اور ایسی ہی ایک کتاب قرآن کے متعلق لکھی۔

ان کے بعد بہت سے نحوی پیدا ہوئے۔ جن میں المبرد (۲۸۵ھ / ۸۹۸ء) صاحب کامل، الاخفش الاوسط، ابو عمر الشیبانی اور ابو بکر الانباری مشہور ہوئے ہیں۔

(ب) معانی۔ بیان۔ بدیع پھر گرامر ہی کے سلسلہ میں ان قاعدوں کی تحقیق کی گئی۔ جن کو

جان کر ایک بات کو کئی طریقوں سے بیان کر سکتے ہیں۔ تاکہ جو بات بیان کی جائے وہ پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اور جو لفظ استعمال ہوں۔ وہ یا تو ان ہی معنوں پر دلالت کریں جن کیلئے وہ بنائے گئے ہیں۔ یا صرف ایک جزو پر یا ان سے وہ معنی مراد لئے جائیں جو نہ کلی طور پر اسکے ہیں۔ نہ جزئی طور پر ہو سکتے ہوں۔

پھر علم بدیع کلام کی خوبیاں، خواہ لفظی ہوں یا معنوی، بتانے کے لئے وضع کیا گیا اور صنایع لفظی و معنوی پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔

(ج) تشبیہ استعارہ المبرد کا قول ہے۔ کہ اگر یہ کہا جائے کہ عربی زبان تشبیہوں اور استعارول سے بھری پڑی ہے۔ تو یہ غلط نہ ہوگا۔

اگر دو ایسی چیزوں کو جو جدا جدا ہوں۔ ایک کو دوسری کے کسی وصف سے مشابہت دی جائے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ وصف مذکور ہو۔

اسی طرح علم بیان میں استعارہ کو تشبیہ پر فوقیت دی جاتی ہے۔ تشبیہ حقیقت ہوتی ہے اور استعارہ مجاز ہے۔ اس سے فصاحت کلام بڑھ جاتی ہے۔ اس میں مشبہ بولتے ہیں اور مشبہ بہ مراد لیتے ہیں۔ یعنی جس لفظ سے مستعار لیتے ہیں (مشبہ منہ) اس کے معنی مراد کرتے ہیں۔ لیکن لفظ مستعار بولتے ہیں۔ ایک کو ذکر تے ہیں دوسرے کو حذف کر دیتے ہیں ؛

(د) کنایہ۔ تعریض زمخشری کا قول ہے۔ کہ کسی لفظ کا ذکر کریں۔ مگر وہ لفظ نہ بولیں۔ جو اس کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسی واسطے کنایہ کو تصریح سے زیادہ بلیغ مانا گیا ہے۔ لیکن استعارہ کو کنایہ سے بھی زیادہ بلیغ تسلیم کیا گیا ہے۔

اگر ایک چیز کا ذکر کریں جس سے کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ ہو۔ جس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو اسے تعریض کہتے ہیں۔

(۵) مقدّم مؤخر

ہر کلام میں ترتیب الفاظ ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اگر کوئی لفظ یا جملہ مقدم کر دیا جائے اور دوسرا مؤخر تو کبھی کبھی اہلِ زبان بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ زبانی بولنے میں تو مختلف لفظوں اور جملوں کو الگ کر کے بولا جا سکتا ہے مگر تحریر میں یہ دقت ہے کہ بغیر ٹھیراؤ کے نشانات کے کام نہیں چلتا۔ مثلاً

انزل علی عبدہ الکتاب (ولم یجعل لہٗ عوجا) قیما میں 'قیما' کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ انزل علی عبدہ الکتاب قیما، ولم یجعل لہٗ عوجا اس طرح بہت سی آیتوں میں تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے اور ان سب کے متعلق تحقیق کر کے بتا دیا گیا ہے۔ فہم قرآن کے لئے ان کا جاننا ضروری ہے۔

سوم۔ تاریخی دشواریاں اور اُن کا حل

(۵) تاریخ مذاہب و اقوام

اگر آپ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ تو وہ مذاہب و اقوام کے فلسفہ اور اخلاق کی تاریخ معلوم ہو گی۔ قرآن کا وہ حصّہ جو مکّی ہے۔ اس میں یہ خصوصیّت زیادہ نمایاں ہے۔ مدنی حصہ میں مسلمانوں کی طرف روئے سخن زیادہ ہے اور وہ اسلام کے اس زمانے کی سیاسیات کی تاریخ کہی جا سکتی ہے جب ایک سلطنت کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں۔ اسی لئے جب کبھی ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں ہمیشہ قبل اسلام کی سیاسی۔ معاشرتی اور ذہنی تاریخ کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ اسلام کو بغیر اس تاریخی پس منظر کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ خود قرآن نے اُس قسم کی تاریخی مثالیں دے کر اسلام کی تصوّر کو مکمل بنایا ہے۔ اسی لئے بعد میں آنے والوں نے ابتدائے عالم سے اسلام تک کی متعدد تاریخیں جمع کیں اور دنیا میں اس سلسلہ کی جو کچھ معلومات تھی وہ جمع کر دی۔ شروع میں جیسا کہ

عام قاعدہ ہے۔ صرف واقعات جمع کئے گئے۔ بعد میں ان واقعات پر بحث و نقد کے بعد رائیں قایم کی گئیں اور یہ فن مکمل ہو گیا۔

وسٹن فلڈ نے مسلمان مؤرخوں کی جو فہرست بنائی ہے۔ اس میں وہ پہلے ہزار سال میں ۶۹۰ ہیں۔ تاریخیں صرف سیاسی نہیں ہیں۔ بلکہ علم و فن کے ہر شعبہ کی تاریخیں موجود ہیں۔ مثلاً اغانی میں شعراء اور مغنیّوں کے حالات ہیں۔ ثعالبی نے یتیمۃ الدھر میں ہر ملک کے شعراء الگ الگ بیان ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ابن ابی عصیبہ نے عیون میں اطبّاء کا حال لکھا ہے ذہبی نے طبقات قایم کر کے حفاظِ حدیث کا حال لکھا ہے۔ سبکی نے حفاظ شافعی کے حالات لکھے یاقوت نے ابجدی ترتیب سے اسی طرح کی تاریخی کتاب لکھ ڈالی۔ غرضیکہ تاریخی معلومات کا کوئی گوشہ خالی نہ رہا۔ اس تلاش و تحقیق کی ابتدا ان تاریخی کتابوں سے ہوئی جن کا تعلق رسول اللہ کی زندگی سے تھا۔ اس سلسلہ میں سیرت رسول اللہ دو طرح پر جمع ہوئی۔ ایک خالص محدثانہ رنگ میں اور دوسری مغازی یا جنگی کارناموں کے ڈھنگ میں۔

و۔ مغازی و سیر قرآن اور اسلام کو رسول اللہ کی سیرت سے علیحدہ کر کے سمجھنا ناممکن ہے اس لئے لوگوں نے آنحضرت کی سیرت کی طرف خاص توجہ کی اور خصوصیت سے غزواتِ نبوی کے مفصل حالات جمع کئے۔

غزوات کی ابتداء مدینہ آکر ہوئی تھی۔ اس سے پہلے مکی زندگی میں چونکہ بالکل پُرامن زندگی تھی۔ اور شمشیر زنی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس زمانے کے حالاتِ زندگی چند صفحوں سے زیادہ محفوظ نہیں۔ حالانکہ اسلام کی اصلی کشمکش اور اساسی تعلیم کا زمانہ مکّہ ہی تھا۔ یہاں رسول اللہ نے تیرہ سال کے قریب قریب اخلاقیات کے بنیادی اصول اور اسلام کی حقیقی تعلیم دی تھی اور یہیں وہ جماعت تیار ہوئی تھی جس نے دنیا میں اس اسلامی روح کو زندہ رکھا۔ جو انہیں

رسولِ عربی سے میراث میں ملی تھی۔

مکہ ہی میں قرآن کا دو تہائی حصہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ اس لئے اگرچہ سیرت نگاروں اور محدثوں نے اسلام کے اس حقیقی کشمکش کے زمانے کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ لیکن خود قرآن اس کمی کو بالکل پورا کر دیتا ہے اور ہمیں اسلامی تحریک کے مختلف ابواب کی ایک ایک سطر صاف اور واضح طور پر نظر آجاتی ہے۔ موجودہ سیرت کی یہی خصوصیت ہے۔ کہ قرآن نے جو کچھ رسول اللہ اور اسلام کے متعلق بتایا ہے وہ سیرت کے سلسلہ میں پورے طور پر تاریخی ترتیب کے ساتھ بتا دیا گیا ہے۔ اس طرح سیرتِ رسول اللہ کا ہر پہلو مکمل ہو جاتا ہے اور اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال اور ان کا تاریخی ارتقا صاف صاف سامنے آجاتا ہے۔

حافظ ابن حجر نے اسماء الرجال کی بہت سی کتابوں کی مدد سے راویانِ حدیث کی سوانحِ عمریاں ایک جگہ جمع کر دی ہیں۔ اس کتاب کا نام تہذیب التہذیب ہے اور بارہ جلدوں میں حیدر آباد سے شایع ہو چکی ہے۔ اس میں قدیم سیرت نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔

رجال کی دوسری کتابوں میں بھی بعض نام ملتے ہیں۔ بعد میں جن لوگوں نے سیرتیں لکھیں۔ ان میں ان کتابوں سے کافی مدد لی اور ان کی عبارتیں اکثر کتابوں میں موجود ہیں لیکن کتابیں ہمیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔ چونکہ مغازی سننے سنانے کا شوق شروع زمانے ہی سے پیدا ہو گیا تھا اور یہ بات فطری بھی ہے کہ لوگ اپنے بزرگوں اور قوموں کی فتوحات کا حال سنیں لہٰذا یہ چرچا عام تھا۔

سیرت پر سب سے پہلی کتاب عروہ بن الزبیر المتوفی ۹۴ھ نے لکھی تھی۔ یہ حضرت

ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے۔ ان کی روایتیں جو اکثر کتابوں میں پائی جاتی ہیں نہایت مستند ہیں ؂

بنو امیہ کے زمانے میں جب حدیث و مغازی کو سلطنت کی طرف سے جمع کرنے اور بیان کرنے کا حکم ہوا تو عاصم بن قتادہ انصاری (ف ۱۲۱ھ) دمشق کی مسجد میں بیٹھ کر باقاعدہ مغازی و سیر کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لیکن صاحبِ تصنیف تھے۔

امام زہری (ف ۱۲۴ھ) نے فن مغازی پر ایک کتاب لکھی تھی سہیلی کا خیال ہے اس فن میں یہ سب سے پہلی تصنیف تھی۔ حالانکہ عروہ اس سے پہلے سیرت پر ایک کتاب لکھ چکے تھے۔ ممکن ہے کہ زہری کی تصنیف میں حالات و واقعات کی زیادتی یا ترتیب کی خصوصیت پائی جاتی ہو اور اسی لئے اسے پہلی تصنیف کہا گیا ہو۔ ان کا تعلق دربار بنو امیہ سے تھا اور ہشام بن عبدالملک کے بچوں کے معلم تھے۔ ان کے دو شاگرد مشہور ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ، اور محمد بن اسحاق۔

موسیٰ بن عقبہ (ف ۱۴۱ھ) نے سیرت پر جو کتاب لکھی تھی وہ ہمیں نہیں مل سکتی۔ لیکن عرصہ دراز تک وہ عام طور پر متداول تھی اور اس کے حوالے اکثر کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ خاندان زبیر کے غلام تھے اور امام مالکؒ نے فن حدیث ان سے سیکھا تھا۔ انہوں نے محدث ہونے کی حیثیت سے مغازی کی روایتوں کو جانچ جانچ کر لکھا تھا۔

محمد بن اسحاق (ف ۱۵۱ھ) فن مغازی کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن محدثین ان کی بعض روایتوں پر اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ یہود و نصاریٰ کو ثقہ سمجھ کر ان سے روایت حدیث کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن اسحق کی سیرت نے عربی نثر نگاری کا

دروازہ کھول دیا۔ ابن اسحاق کا دادا یسار تھا جو عین تمر پر گرفتار ہوا تھا اور مدینہ میں جو قیدی سب سے پہلے لائے گئے تھے ان میں سے ایک تھا۔ ابن اسحاق کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ یعنی ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ یا ۱۵۲ھ بتائی جاتی ہے۔ وہ امام ابو حنیفہؒ کے مقبرہ (مقبرۂ خیزران) میں دفن ہیں۔ انہوں نے اپنی سیرت خلیفہ منصور کے سامنے حیرہ میں پیش کی جہاں سے وہ رے اور جزیرہ تک مشہور ہو گئی۔ امام مالکؒ نے ان کی بعض روایتوں کو صحیح نہیں مانا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ شیعیت کی طرف مائل تھے۔

وہ اہل کتاب سے روایت کرتے تھے اور انہیں اہل علم قدیم کے نام سے پکارتے تھے لیکن ابن سعد اور طبری ان کی روایتوں کو صحیح مانتے ہیں اور اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں۔ اور امام بخاری نے اپنے رسالہ جزء القراۃ ان کی سندوں کو صحیح مان کر نقل کیا ہے بہر حال ابن اسحاق کی سیرت آج کل صرف ابن ہشام کی سیرت کے ذریعہ سے موجود ہے اور طبری و ابن سعد کی روایتوں کو اگر لے لیا جائے۔ تو پھر اس سیرت کی ہر کمی پوری ہو جاتی ہے۔

عبدالملک بن ہشام الحمیری (المتوفی ۲۱۸ یا ۲۱۳ھ) یہ ایک مشہور اور ثقہ محدث تھے۔ انہوں نے ابن اسحاق کی سیرت کو مرتب کر کے اور چند اضافوں کے ساتھ شایع کیا تھا۔ یہ انساب کے بہت بڑے ماہر تھے اور ابن اسحٰق کی اس کمی کو بھی اپنی تصنیف میں پورا کر دیا ہے ۱۸۶۰ء میں وسٹنفلڈ نے گوٹنجن سے شایع کیا ہے۔ اور مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔

قاضی محمد بن عمر الواقدی الاسلمی المدنی (۱۳۰-۲۰۷ھ) بیان کیا جاتا ہے کہ یہ فقہ میں امام مالک بن انس اور سفیان الثوری کے شاگرد تھے

اس کے علاوہ یہ ابن جُریج محدث سے مل چکے تھے۔ فقہ، حدیث اور مغازی کے ماہر تھے۔ ہارون الرشید نے انہیں بغداد کے قطر شرقی کا قاضی مقرر کیا تھا۔ انہوں نے واقعات کو تاریخی تسلسل کے ساتھ جمع کرنے میں خاص اہتمام کیا تھا۔ قاضی واقدی نے ان واقعات کو جو آنحضرت کی سیرت کے متعلق عام طور پر مشہور تھے۔ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی روایات میں بعض ایسی اہم باتیں ملتی ہیں جو دوسروں نے بیان نہیں کیں۔ یا جن پر لوگوں نے پردہ ڈالنے کی سعی نامشکور کی۔

قاضی واقدی کی دیانت و صداقت کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ انہوں نے روایات کو محض اسلئے ترک نہیں کیا۔ کہ ان کی رائے میں یا بعض دوسروں کی رائے میں وہ باتیں قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتیں۔ اسی لئے ان کے مخالفین نے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ لغو بیان تھے اور بے ہودہ قسم کی روایتوں کو لکھتے تھے۔ حالانکہ جن روایتوں کو بے ہودہ سمجھا جاتا ہے انہیں قرآن و حدیث کی روشنی میں جانچنے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام نے اس قسم کی روائتیں یا تو تصنیف کر لی تھیں یا اصل واقعہ کو گھٹا بڑھا کر بیان کی تھیں۔ لیکن قاضی واقدی نے نہایت دیانت سے ان سب روایتوں کو جمع کر دیا۔ اور کوئی روایت اپنی طرف سے تصنیف کر کے مغازی میں داخل نہیں کی واقدی جھوٹے نہیں۔ بیان کرنے والے جھوٹے یا مبالغہ کرنے والے ہو سکتے تھے۔

محمد بن سعد کاتب الواقدی (۱۶۸-۲۳۰ھ)

یہ قاضی واقدی کے کاتب اور مشہور محدث ہیں۔ ان کی کتاب "طبقات" میں دو جلدیں سیرت میں اور باقی دس حالات صحابہ میں ہے۔ اور ساخاؤ (Sacham) کی نگرانی میں برلن سے شایع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ واقدی کی روایات کثرت سے بیان کرتی ہے

لیکن چونکہ اس میں ہر روایت کی سندیں مذکور ہیں۔ اس لئے اس کو واقدی کے مقابلہ میں بہتر مانا جاتا ہے۔

محمد بن جریر ابو جعفر الطبری (شوال ۳۱۰ھ) یاقوت نے اپنی کتاب میں ان کے حالات سب سے زیادہ بیان کئے ہیں۔ طبری نہایت مشہور محدث۔ فقیہ۔ قاری۔ مؤرخ اور مفسر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیعہ کے حامی تھے لیکن خطیب بغدادی نے اس سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے تفسیر اور تاریخ پر الگ الگ تین تین ہزار صفحے لکھے ہیں۔ ان کی تفسیر بہترین تفسیر اور تاریخ مکمل ترین تاریخ مانی جاتی ہے۔ بعد کے مؤرخوں نے ان ہی کی تاریخ کبیر کے خلاصے لکھے ہیں۔

سیرت کے متعلق ان کی تاریخ سے بعض ایسے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ جو دوسری سیرتوں میں اس تفصیل سے درج نہیں ہیں۔

ز۔ احادیث علم حدیث سے رسول اللہ کے اقوال افعال و احوال معلوم ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے آپ کے اقوال و افعال حجت ہیں۔ اسی لئے جب اسلامی تعلیم کا مسلمانوں میں رواج ہوا تو جن باتوں کے متعلق قرآن میں صاف اور صریح ہدایتیں نہ ملتی تھیں۔ ان کے لئے سنت رسولؐ سے مدد لی گئی۔ گویا قرآن کے سمجھنے کے لئے علم حدیث کی بنیاد پڑی۔

لیکن قرآن نے مسلمانوں کے عمل کے لئے یہ بھی بتا دیا تھا۔ کہ علاوہ قرآن اور سنت رسولؐ کے دوسرے رسولوں اور مفکروں کے اقوال و افعال بھی قابل تقلید ہیں۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہوں۔ اس طرح علم کا دروازہ انسانی عقل و فہم کے سامنے کھول دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ علم کسی شخص یا جماعت کی میراث نہیں ہے۔ یہ ہوا اور پانی کی طرح عام ہے

اور نہ صرف ہر شخص اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ ہر مسلمان پر خواہ وہ مرد ہو یا عورت علم حاصل کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ بعد کے آنے والے لوگوں نے علم کے معنوں کو محدود کر دیا کوئی علم سے صرف قرآن کا علم مراد لیتا تھا۔ کوئی حدیث اور کوئی فقہ۔ لیکن قرآن کی پہلی ہی آیتیں علم سے عام علم مراد لیتی ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ اس وقت نہ قرآن تھا۔ نہ حدیث نہ فقہ۔

زمانۂ رسالت میں بہت کم لوگوں نے حدیثیں لکھی تھیں۔ مسلمان جو کچھ سنتے تھے۔ زبانی یاد رکھتے تھے۔ انہیں رسول اللہؐ کا حکم تھا۔ سوائے قرآن کے اگر کسی نے کچھ لکھ رکھا ہو جس کا تعلق مجھ سے ہو تو اسے مٹا دے (لا تکتبوا عنی غیر القرآن) اور اگر ایسا نہ کریگا کہ تو وہ جہنم میں اپنے بیٹھنے کی جگہ بناتا ہے۔ غالباً اس حکم کی یہ وجہ تھی۔ کہ قرآن و حدیث ساتھ ساتھ لکھنے میں دونوں کے مخلوط ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یا ممکن ہے کہ بعض لوگ قرآن کی بیاض میں نہ صرف حدیث بلکہ شعر و شاعری اور دوسری یادداشتیں بھی لکھ لیتے ہوں گے۔ اس لئے قرآن کے ساتھ دوسری چیز لکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ خواہ وہ حدیث ہو یا اور کوئی چیز ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ حدیثوں کو عرصۂ دراز تک زبانی ہی روایت کرتے رہے اور کاغذ سازی عام ہو جانے کے بعد بھی یہی صورت رہی کہ احادیث زبانی ہی یاد کرنا بہتر سمجھتے تھے۔

چونکہ حدیث کی روایت زبانی ہوتی تھی۔ اسلئے اس کے الفاظ وہی نہیں ہوتے تھے۔ جو رسول اللہؐ نے کہے ہوں۔ اسی طرح وہ حدیثیں جو رسول اللہؐ کے افعال و احوال کو بیان کرتی ہیں۔ راوی کے قوتِ مشاہدہ و ادراک کے مطابق ہوتی ہیں۔ یعنی ایسی حدیثیں بہت ہی کم ہیں۔ جن کے الفاظ وہی ہوں۔ جو رسول اللہؐ کے منہ سے نکلے ہوں یا وہ ایسے مشاہدے پر مبنی ہوں۔ جس میں راوی نے اپنی روایت میں کوئی کمی زیادتی نہ کی اور نہ خود

بیان کرنے والے کے جذبات کا اس پر اثر پڑا۔ اسلئے محدثین نے حدیث کی دو قسمیں کر دیں۔
(۱) اول تو حدیث متلو یعنی وہ کلام جو رسول اللہ نے لفظاً بلفظاً بتایا ہو۔ یہ کلام اللہ یا قرآن ہے
(۲) دوم۔ حدیث غیر متلو، یعنی وہ کلام جس کی آپ نے تلاوت نہ کی بلکہ لوگوں نے سن کر اپنے لفظوں میں بیان کیا ہو۔ اسے حدیث، خبر۔ لغت اور اثر بھی کہتے ہیں۔

اس طرح محدثین کے کئی طبقات بیان کئے گئے ہیں:۔

(۱) پہلا طبقہ صحابیوں کا ہے۔ جن صحابیوں کو رسول اللہ کی صحبت میں رہنے کا زیادہ موقعہ ملا۔ یا جو زیادہ صاحب بصیرت تھے انہیں دوسرے صحابیوں پر ترجیح دیجاتی ہے۔
(۲) دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے۔ جنہیں صحابیوں کی صحبت نصیب ہوئی یہ تابعین کہلائے۔

(۳) تیسرا طبقہ تبع تابعین کا ہے۔ یعنی جنہیں تابعین سے استفادہ کا موقع ملا۔
(۴) پھر علمائے مجتہد۔ شاغلین بالحدیث۔ حدیث پر لکھنے والوں اور شرح کرنے والوں کا درجہ ہے۔

صحابہ کے بعد عدل وضبط امام مالک (المتوفی ۱۷۹ھ) میں تھا۔ انہوں نے سب سے پہلی کتاب حدیث کی لکھی۔ پھر بخاری ف ۲۵۶ اور مسلم ف ۲۶۱ نے صحیحین لکھیں۔ حدیث لکھنے والوں میں یہ پہلے طبقہ کے محدث ہیں۔

دوسرا طبقہ ان لکھنے والوں کا ہے۔ جنہوں نے مندرجہ بالا کتابوں سے روایتیں لیکر لکھیں۔ مثلاً ابو داؤد، ترمذی۔ نسائی۔ دار قطنی وغیرہم۔

جس طرح محدثین کے طبقات قرار پائے اور اس سلسلہ میں روایت کرنے والوں کی زندگی کی چھان بین کر کے ہزارہا راویوں کے حالات زندگی جمع کر لئے گئے اور بقول شپرنگر

دنیا اس قسم کی جد و جہد کا نمونہ اب تک نہ پیش کر سکی۔ اسی طرح درایت یا تنقیدِ حدیث کے بھی اصول بنائے گئے۔ اور اصولِ روایت و درایت نے مسلمانوں کے فنِ حدیث کو بہت بلند معیار پر پہنچا دیا۔

اہلسنت کے مشاہیر محدثین

نمبر سلسلہ	نام	نام کتاب	عمر	کیفیت
۱	امام مالک بن انس	موطّا	۹۰ - ۱۷۷	
۲	امام محمد بن اسمٰعیل البخاری	صحیح بخاری	سمرقند ۲۵۶ - ۱۹۴	۷۲۷۵ حدیثیں جمع کیں۔
۳	امام مسلم بن حجاج نیشاپوری	صحیح مسلم	نیشاپور ۲۶۱ - ۲۰۴	
۴	ابوداؤد السجستانی		بصرہ ۲۷۵ - ۲۰۲	
۵	ابوعیسیٰ الترمذی		۲۷۹	
۶	احمد بن شعیب النسائی		مکہ - ۳۰۳	
۷	محمد بن یزید بن ماجہ		۲۷۳ - ۲۷۹	
۸	ابوالحسن رزین	کتاب التجرید	۵۲۰	
۹	الحمیدی	کتاب الجمع	بغداد ۸۰۸	صحیحین کو جمع کر دیا۔
۱۰	امام ابوبکر البیرقانی	جامع البرقانی	۴۲۵	دونوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو جمع کیا۔
۱۱	امام ابومسعود الدمشقی	جامع الدمشقی		

جمہور نے چھ اصلی کتابیں قرار دی ہیں لیکن امام نووی نے امام مالک کی مؤطا کو اس میں شریک نہیں کیا اور بعد کی پانچ کتابوں کو اصولِ خمسہ قرار دیا ہے بعض نے امام مسلم کے بعد

امام مالک کا درجہ دیا ہے۔ اور بعض نے امام مالک کو ابن ماجہ کے بعد رکھا ہے لیکن حق یہ ہے کہ امام مالک کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اور ان کی کتاب قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب مانی جاتی ہے جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ اس کے بعد صحاح ستہ ہیں جو بخاری سے شروع ہوکر ابن ماجہ پر ختم ہوتی ہیں۔

مشاہیر حفّاظ | مندرجہ بالا سات کتابوں کے بعد حفاظ حدیث کا درجہ ہے۔ یہ سات ہیں:-

نمبر سلسلہ	نام	سکونت وعمر	کیفیت
۱	الدارقطنی شافعی	بغداد ۳۸۵ - ۳۰۵	بغداد کے ایک محلہ کا نام دارقطن تھا
۲	الحاکم نیشاپوری	نیشاپور ۴۰۵ - ۳۲۱	
۳	عبدالغنی المصری	مصر ۴۰۹ - ۳۳۲	
۴	ابو نعیم اصبہانی	اصبہان ۴۳۰ - ۳۳۴	
۵	ابن عبدالبر	مغرب ۴۱۳ - ۳۶۸	
۶	الخطیب البغدادی	بغداد ۴۶۳ - ۳۹۲	
۷	البیہقی	نیشاپور ۴۵۸ - ۳۸۴	

شیوخ المحدثین المتقدمین

۱	ابن خزیمہ نیشاپوری	۳۱۱	
۲	ابن حبان تمیمی	۳۵۴	
۳	ابو عوانہ عجمی	۲۳۹	مسند

نمبر سلسلہ	نام	سکونت۔عمر	تصنیف	کیفیت
۴	الحاکم نیشاپوری	۴۰۵	المستدرک علی الصحیحین طبع حیدرآباد	
۵	ابو یعلی	موصل ۳۰۷	سنن	
۶	الدارمی	سمرقند ۲۵۵	مسند	
۷	البزار	رملہ ۲۷۲	مسند الکبیر	
۸	الطبرانی	اصفہان ۳۰۶	مسند۔ سو سال زندہ رہے	

ثانوی درجہ کے شیوخ

نمبر سلسلہ	نام	سکونت۔عمر	تصنیف	کیفیت
۱	الخطابی		معالم السنن، اعلام السنن، غریب الحدیث	
۲	ابن الجوزی الحنبلی	بغداد ۵۱۰-۵۷۷		واعظ مورخ
۳	النووی	نوی ۶۳۱-۶۷۶	شارح صحیح مسلم	
۴	ابن الاثیر	موصل ۶۰۶	جامع الاصول، مناقب الاخیار	اسکا بھائی مورخ تھا
۵	البغوی الشافعی	۵۱۶	مصابیح۔ شرح السنہ	
۶	ابن الصلاح	دمشق ۶۴۳		
۷	الصاغانی		المشارق	لغوی
۸	شمس الدین کرمانی	۶۸۶	شارح بخاری	معانی
۹	تورپشتی شیرازی	۶۶۰	شارح مصابیح	
۱۰	قاضی عیاض	مغرب ۵۴۴	کتاب الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ	

اہل تشیع کے مجموعے

اہل سنت والجماعت یعنی ان مسلمانوں کے علاوہ جو چاروں خلفاء رسولؐ اللہ کو برحق مانتے تھے۔ مسلمانوں میں کئی اور سیاسی جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک جماعت خوارج کے نام سے مشہور کی گئی ہے۔ اسلئے کہ وہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری حصہ کو خلافت رسولؐ اللہ نہیں مانتے۔ بلکہ دنیاوی سلطنت سمجھتے ہیں اور بعد میں آنے والے خلفاء کو بھی بادشاہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اقوال دوسروں کی زبانی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس جماعت کو سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ مٹا دی گئی اسلئے ان کا کوئی لٹریچر باقی نہیں۔

شیعیان حضرت علیؓ کی جماعت اب تک باقی ہے اور ان میں بھی متعدد فرقے ہیں۔ بعض صرف حضرت علی کی خلافت کو سچی اسلامی خلافت مانتے ہیں۔ بعض ان کی خلافت کو پہلے تین خلفاء کی خلافت سے بہتر مانتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی اختلاف ہے۔ اسلئے اس جماعت نے اپنی حدیثوں کی کتابیں بھی جمع کی ہیں۔ جو یہ ہیں :-

(۱) الکافی از محمد بن یعقوب الکلینی۔ المتوفی ۳۲۸ھ۔

(۲) من لا یستطہرہ الفقیہ۔ از محمد بن علی بن بابویہ القمیؒ (۳۸۱ھ)

(۳) تہذیب الاحکام از محمد الطوسی (ف ۴۵۹ھ)

(۴) الاستبصار۔ اس میں مندرجہ بالا کتاب کے اقتباسات ہیں۔

(۵) نہج البلاغہ از علی بن طاہر الشریف المرتضی (۴۳۶ھ) یا ان کے بھائی رضی الدین بغدادی نے، حضرت علیؓ کے اقوال جمع کئے ہیں

۲۔ ناسخ منسوخ

اکثر علمائے اسلام نے قرآن میں ناسخ آیتیں اور منسوخ آیتیں مانی ہیں، نسخ کے لغوی معنی چار ہیں (۱) ازالہ۔ یعنی اللہ القائے شیطان کو زائل

کر دیتا ہے اور اپنی آیتوں کو محکم بنا دیتا ہے (فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ۔

۲۔ تبدیل۔ یعنی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دینا (واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ)

۳۔ تحویل۔ مثلاً میراث کا تناسخ یعنی میراث ایک سے دوسرے کی طرف تحویل ہونا۔

۴۔ نقل کرنا ایک جگہ سے دوسری جگہ۔ مثلاً کسی کتاب سے نقل تیار کرنا اور پہلی کو منسوخ کہنا۔ یہ صورت قرآن سے متعلق نہیں ہے۔ سیوطی کا قول ہے کہ اتنے آدمیوں نے ناسخ منسوخ آیتیں جمع کی ہیں۔ کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ان میں ابو داؤد سجستانی، ابو جعفر النحاس الانباری اور ابن العربی وغیرہ مشہور ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ رسول اللہ پر خدا کی طرف سے حسب ضرورت بعض معنی دل پر نازل ہوتے تھے وہ انہیں لفظوں کا جامہ پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ لیکن نبی بھی انسان ہی ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی بعض ایسی تمنائیں پیدا ہو سکتی ہیں جنہیں القائے شیطان یا نفسانی خواہشات سے نسبت دی جا سکے (سورہ الحج) ایک دفعہ رسول اللہ نے اسی قسم کی تمنا کے ماتحت یہ کہہ دیا کہ قریش کی بعض دیویاں لات، منات اور عزیٰ بھی خدا سے شفاعت کر سکتی ہیں۔ قریش اس سمجھوتے سے خوش ہو گئے۔ لیکن فوراً خدائی طاقت (جبریلؑ) نے اس کی صحت کر دی اور کہا کہ یہ بات اس طرح سے میں آپ کے پاس نہیں لایا۔ یہ شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ کے حکم سے وہ باتیں منسوخ کی گئیں اور محکم آیتیں بیان ہوئیں (سورہ والنجم)

اس کے علاوہ بعض آیتوں کو رسول اللہ بھول جاتے تھے تو پھر دوسرے وقت خدا کی طرف سے

اس سے بہتر یا ویسی ہی آیتیں نازل ہو جاتی تھیں اور آپ لوگوں کو سنا دیتے تھے (ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا)

لہذا یہ کہنا درست نہیں کہ قرآن کی بعض آیتیں منسوخ ہیں۔ جو باتیں القائے شیطانی تھیں وہ قرآن میں موجود ہی نہیں۔ نہ ان پر قول اللہ ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ وہ قرآن کی آئتیں ہی نہ تھیں۔ موجودہ آیتوں میں سے بعض اوامر و نواہی کی آئتیں منسوخ مانی جاتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زمانے اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بعض احکام میں ترمیم کر دی گئی۔ اور یہ ہر قانون کا خاصہ ہے۔ کہ وہ اس طرح بدلتا رہتا ہے۔ یہ نسخ نہیں۔ ترقی یا تبدیلی کہی جا سکتی ہے اور جن حالات میں ایک حکم دیا گیا تھا۔ اگر وہی حالات پھر موجود ہوں تو وہ حکم منسوخ نہیں بلکہ قایم ہے۔ گویا قرآن میں ایک آیت دوسری آیت کی ناسخ نہیں ہو سکتی نہ ہے۔

ط۔ تکرار نزول

قرآن میں بہت سی باتوں کو مختلف الفاظ اور بیان کے ساتھ دہرایا گیا ہے، ہر موقع پر بیان کا نیا انداز، اور رسائل کے لحاظ سے ایسا جواب ہے۔ کہ اسکے ذہن میں سما جائے۔ جو لوگ ترجموں کے ذریعے سے، یا بغیر تاریخی ترتیب کے ان بیانات کو پڑھتے ہیں۔ انہیں یقیناً الجھن ہوتی ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے۔ کہ اکثر مضمون ہی خبط ہو جاتا ہے موجودہ سیرت میں اس اغلاق کو دور کر دیا گیا ہے۔

ی۔ مبہمات و مشکلات اور اختلاف و تناقص

(۱) قرآن میں بعض آئتیں ایسی ہیں کہ جنکے متعلق یہ نہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ کس خاص شخص یا جماعت کے لئے ہیں۔ احادیث نے ان مبہمات کو صاف کر دیا ہے اور یہ تاریخی مشکل دور ہو گئی ہے۔

(۲) قرآن میں بعض معنوی مشکلات تھیں۔ ان کو حل کرنے کی کوشش بلیغ کی گئی ہے۔ اس کا تعلق لغت، نحو اور علم معانی سے ہے۔ لیکن تاریخ بھی اس میں بہت مدد دیتی ہے

(۳) بعض بیانات میں اختلاف و تناقص معلوم ہوتا ہے۔ ان کو صاف کیا گیا ہے۔ اسکا تعلق تاریخ سے ہے اور سیرت نبوی و احادیث سے اس مشکل کو حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(س) سب سے بڑی تاریخی مشکل: ترتیب نزولِ قرآن

چونکہ قرآن کریم ایک ہی مرتبہ کتابی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش نہیں کیا گیا بلکہ حسب ضرورت اس کی آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ اس لئے اس کے نزول کی ایک تاریخی ترتیب ہے۔ موجودہ قرآن میں جو سورتیں اور آئتیں ہیں وہ تاریخی ترتیب سے نہیں ہیں۔ مختلف سورتوں میں آیتوں کا انسجام خود رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ لہذا ترتیب آیات کے لحاظ سے سب سورتیں وہی ہیں۔ جیسی رسول اللہ نے بنادی تھیں اور جو آیتیں جس سورۃ میں جس ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ وہ اب تک اسی حالت میں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی رسول اللہ کی دی ہوئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ترتیب اجتہاد علماء پر مبنی ہے۔ واقعہ بہر حال کچھ بھی ہو۔ ہم جب کبھی قرآن کا تاریخی مطالعہ کرنا چاہیں گے۔ تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا۔ کہ قرآن کی ترتیب نزول کیا تھی۔ صرف اسی قسم کے مطالعے سے ہم اسلام کو سمجھ سکتے ہیں۔ ورنہ تفسیریں لکھی جائیں گی۔ اور قرآن ہمیشہ ہمارے فہم سے دور رہے گا۔

ترتیب نزول کے متعلق بعض احادیث ہیں۔ لیکن انہیں جانچنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہیں۔ اس لئے خود قرآن کی داخلی شہادت سے ہمیں ترتیب معلوم کرنا چاہیئے۔

مقام شکر ہے۔ کہ کئی سال کی جدوجہد کے بعد ہم نے اس قسم کی کل کوششوں کو یکجا کر کے ان پر تنقید کی ہے اور آخر میں ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اور اسی ترتیب کے مطابق ہم موجودہ سیرت میں قرآن کریم کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب ترتیب نزول قرآن کریم کے نام سے الہ آباد سے شایع کی جا چکی ہے۔ اور ہم جزم ویقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ قرآن کی اس سب سے بڑی تاریخی مشکل کے حل ہو جانے کے بعد اب سیرت و قرآن کا کوئی گوشہ تشنۂ تشریح و تفسیر نہیں رہتا۔

چہارم فلسفیانہ دشواریاں

نظریۂ علم اور قرآن

فلسفہ کیا ہے؟

ولیم جیمز نے فلسفہ کی جامع اور سادہ تشریح کی ہے۔ وہ اپنی کتاب "فلسفہ اور اس کے نقاد" (Philosophy and its Critics) میں کہتا ہے کہ "فلسفہ کا مسئلہ ہمیشہ یہ رہا ہے۔ کہ تشریح کے ان اصولوں کو دریافت کرے جو بلا استثنا ہر شے کی حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی وہ عناصر جو خدا، انسان، جانور اور پتھر غرضکہ ہر شے میں مشترک ہیں۔ یہ کائنات کے جلوس کے زیجا و یجا کی تلاش کا نام ہے (اسے نظریہ ہستی کہتے ہیں) اس کے ساتھ ساتھ علم کے احوال کی تلاش (جسے نظریۂ علم کہتے ہیں) اور عمل انسانی کے نہایت ہی عام اصولوں کی تحقیق (علم الاخلاق) بھی فلسفہ میں داخل ہے۔"

جان لوس نے خوب کہا ہے۔ کہ ہر شخص کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ اور انسانی علم کا مسئلہ حقایق اشیاء کی ماہیت دریافت کرنے سے زیادہ گہرا ہے مثلاً کسی عقیدہ (بات) کو لے لیجئے۔ اور تحقیق کیجئے۔ کہ کیوں آپ نے اسے مانا ہے۔

(۱) کیا اس کو محض اسلئے مان لیا۔ کہ ہر شخص اسے مانتا ہے اور عام طور پر یہی مانا جاتا ہے؟

(۲) کیا پروپاگنڈا کرنے والوں نے آپ کو یہ بات منوادی ہے۔ اور مذہبی سند کی وجہ سے آپ نے مان لی ہے ؟

(۳) کیا اس کے متعلق دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ ضرور سچ ہے ؟ یعنی یہ چیز حدس پر مبنی ہے !

(۴) کیا آپ اس پر اسلئے یقین رکھتے ہیں۔ کہ اس طرح ماننے میں کام چل جاتا ہے۔ اور انسان کی فلاح کے لئے یہ عقیدہ ضروری معلوم ہوتا ہے ؟

(۵) کیا یہ عقل (یعنی تجربہ) کی بنیادوں پر قایم ہے ؟"

(جان لیوس۔ مقدمہ فلسفہ۔ صفحہ ۱۱)

"غرضکہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی فلسفہ ہوتا ہے۔ چاہے اس نے اپنے عقاید کی جانچ کی ہو یا بلا سمجھے بوجھے کسی رائے اور عقیدے کے بھروسے زندگی کاٹ دی ہو۔ جس طرح ہر شخص کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ اس طرح مختلف زمانوں میں قوموں کے فلسفے بھی بدلتے رہتے ہیں کسی فلسفہ کو کامل سچائی نہیں کہہ سکتے۔ تاریخی حالات کا ان پر اثر پڑتا رہتا ہے اور وہ محدود ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر فلسفی کی تردید کرنے والا دوسرا اتنا ہی بڑا فلسفی موجود ہے۔"

(لیوس۔ ۹۱)

لہذا فلسفہ نہ صرف عقاید کی جانچ کرتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کرتا ہے۔ کہ عقاید کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اور کیوں کسی ایک زمانے میں ایک فلسفہ مقبول ہوتا ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرا۔ اس کے علاوہ فلسفہ کا یہ بھی کام ہے کہ وہ اس کی تحقیق کرے۔ اگر عقاید کے اثر انسان کے عمل پر پڑتا ہے تو کیا کوئی ایسی بھی چیز ہے جو عقائد پر اثر ڈالتی ہے

اس طرح فلسفہ کے دو طریقے ہو جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو سقراط کی طرح عقاید کی

جانچ ہے اور وہ عوام کے فلسفہ اور صداقت کی گہرائیوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔

دوسرا طریقہ عقایدِ انسانی کی تبدیلی کی علم دریافت کرتا ہے۔ یعنی وہ عقیدے کیوں اور کس طرح بدل جاتے ہیں۔

قرآن نے ان دونوں طریقوں کا استعمال کیا ہے اور فلسفہ کے بنیادی مسائل پر ایک قطعی رائے دی ہے۔ ان کی تفصیل اور بعض دشواریاں آگے بیان کی جاتی ہیں۔

فلسفۂ الٰہیات (Metaphysics) کے دو مہتم بالشان مسئلے ہیں اور یونانی فلسفیوں سے بہت پہلے ان مسائل پر غور و خوض شروع ہوگیا تھا۔

یہ کائنات کیا ہے یعنی وجود کی حقیقت۔ یا بقول فلاسفہ "ماہیتِ اشیاء" کیا ہے۔ فلسفے کی یہ شاخ نظریہ وجود، نظریہ ہستی۔ یا حکمت نظری کی وہ شاخ ہے جس میں بقول ابن سینا (مباحث مشرقیہ) ایسے امور کو معلوم کرتے ہیں۔ جو اپنے وجود خارجی و ذہنی کسی میں بھی مادہ کے محتاج نہ ہوں۔ غرضکہ اسی قسم کے غور و فکر کے سلسلے میں عجیب عجیب خیال آرائیاں ہوئیں کوئی بولا ہر جگہ روح ہی ہے، مادہ بھی خیال کی ایک صورت ہے۔ کوئی کہنے لگا۔ یہ سب فریب نظر ہے۔ ہر چند کہیں کہ 'ہے' نہیں ہے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ خود علم کیا ہے اور کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ یہی مسئلہ علم (Epistemology) ہے۔ جس کے متعلق یورپ والوں نے مسلمانوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاک، برکلے، ہیوم اور کانٹ پیدا کئے۔ گویا یورپ کی اقلیت نے پندرھویں یا سولھویں صدی میں جب آنکھ کھولی تو اس نے تفکر و تدبّر فی خلق اللہ کی حقیقی بنیاد ڈالی۔ پھر بھی موجودہ عہد کا مورخ فلسفہ الفرڈ وائٹ ہیڈ (A. N. Whitehead) کہتا ہے کہ جو کچھ بھی دوسری بنیادوں پر کہا جائے لیکن دے کارت کے پیروؤں کے نزدیک صداقت کا معیار یہ تھا۔ کہ وہ اسے بلا دلیل سمجھ

مانتے تھے۔ اور حقیقت میں جسے وہ عقل یا دلیل کہتے تھے وہ صرف انجیل مقدس سے پوشیدہ قسم کی اپیل تھی۔ یعنی ان کا مقصد یہ تھا۔ کہ پرانے عقاید کو کسی نہ کسی طرح نئے خیالات کے مطابق بنا دیا جائے۔" (Modern Philosophy A to Ben. Walls)

بہر حال لاک (۱۶۳۲ - ۱۷۰۴) نے دے کارت کے مذہب ارتیابی کو کام میں لاکر "پیدائشی تصورات" کی دھجیاں اڑا دیں۔

افلاطون (۴۲۷ - ۳۴۷ ق م) کا خیال تھا۔ کہ عالم شہود کا علم۔ مشاہدے اور تجربے سے نہیں۔ بلکہ عالم مثال سے حاصل ہوتا ہے۔ اس عالم مثال میں عالم شہود کی ہر شے مثالی صورت میں موجود ہے۔ وہ شہود دنیا کے نقص سے بھاگ کر عالم مثال کے کمال میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ اس فراری ذہنیت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس زمانے ایتھنز کی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔

ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) نے کہا۔ کہ جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے ہوتا ہے۔ عالم مثال میں کلیات کا ہونا ایک فرضی شے ہے۔ لیکن ارسطو کو قطعی طور پر تجربے اور مشاہدے کا حامی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی ہیئت محض خیال آرائی اور حیاتیات کا مجموعہ رطب و یابس ہے۔ اور چونکہ یونان میں غلامی کا عام رواج تھا۔ لہذا وہ معاشی طور پر اقتصادی انسان کو نہ سمجھ سکا۔ اور سکندر کی شہنشاہیت کا معاون کہ دنیا میں انفرادیت پسندی اور یونانی آمریت کو چھوڑ گیا۔

افلاطون و ارسطو کی تعلیمات کے مدرسے کہ ہزار سال تک نصرانی شہنشاہ جسٹی نی آن (Justinian) کے حکم سے بند رہے۔ لیکن ان کے فلسفے پر حاشیے چڑھتے رہے۔ اور نو افلاطونیت کا تصوف یا مذہبیت نصرانی کلیسا میں مقبول ہو گیا۔ ارسطو کو ہسپانوی مسلمانوں نے

زندہ کیا۔ اور ابن رشد نے الٰہیات میں وحدتِ وجود کو داخل کر دیا۔ اور چونکہ مسلمانوں سے تعلیم حاصل کرنا۔ جاہل پوپوں کے نزدیک کفر تھا۔ خصوصاً اسلئے کہ ارسطو خلودِ روح کا منکر سمجھا جاتا تھا۔ اسلئے تیرھویں صدی مسیحی کی ابتدا تک کلیسا نے ارسطو کا مطالعہ ممنوع قرار دے رکھا تھا۔

لیکن علم کسی خاص فرقے کی میراث نہ رہی۔ دنیا میں تغیرات آئے۔ مسلمانوں نے مشرق و مغرب کو ایک کر دیا۔

مسلمانوں کی ہیئت اور طب نے دنیا کو مسخر کر لیا اور ان کے عقلی فلسفے نے لاک ہیوم اور کانٹ پیدا کر دئے۔ جو کہتے تھے کہ کل علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے، گو ان ہی کے ساتھ میل برانش اور بارکلے یہ کہتے رہے کہ مافوق الفطرت طریقے سے علم کی آمد ہوتی ہے۔ کانٹ نے تنقیدی فلسفے کو یورپ میں شروع کیا اور اس امر کی تحقیق کی کہ مرکب قضیے (Synthetic judgements) کیونکر خود بخود (a priori) ممکن ہیں؟ یعنی جن چیزوں کا علم تجربہ نہیں دیتا وہ علم کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ علم کا مادّہ خارج سے حاصل ہوتا ہے اور 'صورت' داخل میں بنتی ہے۔ اس کی بنیادی صورتیں "مکان و زمان" ہیں۔ جو حدسی طور پر ہمارے ذہن سے احساس میں منتقل ہوتی ہیں۔ گویا تجربے کا امکان قوتِ متخیلہ کے ذریعے ہوتا ہے۔

علمِ غیب اور علمِ شہود

مسئلہ علم کی فلسفیانہ صورتیں تو بعد میں پیدا ہوئیں۔ لیکن متمدّن زندگی کی ابتدا ہی میں، دو باتیں انسانوں کے سامنے آ گئی تھیں۔

(۱) پہلی بات یہ تھی کہ توہم پرستی اور قوانین فطرت کی کم آگہی کی وجہ سے علت و معلول کے سلسلے کا لزوم انسانوں کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا۔ اسلئے وہ سمجھتے تھے۔ کہ

ہمارے مشاہدات اور تجربات بے بنیاد ہیں۔ اور اگر بعض امور مضبوط و منظم معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کا کیا بھروسہ کہ جو کچھ ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ وہ واقعہ ہے۔ فریب نظر نہیں ہے۔

اس لئے ہر ظاہر کے ایک یا متعدد باطن ہیں۔ اور جب ہمیں مشاہدے میں حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی تو یقیناً غیب یا باطن کا علم ہمارے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اور وہی سچا علم ہے۔

(۲) باطن یا غیب کا علم ایسی روحوں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے جو عام طور پر نظر نہیں آتیں۔ لیکن وہ روحیں (جنہیں عرب جن کہتے تھے) بعض مخصوص انسانوں کی دوست بن جاتی ہیں اور انہیں غیب کا علم دیتی رہتی ہیں۔

علم

علم یا جاننے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان اس چیز کو اپنے ظاہری حواس سے محسوس کر کے جانے اور دوسرے یہ کہ باطنی حواس سے معلوم کرے۔ ظاہری حواس یعنی سننے۔ دیکھنے۔ سونگھنے۔ چکھنے اور چھونے کی قوتوں کے ذریعہ سے مادی چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے اور باطنی حس یعنی ذہن سے ہم مادی چیزوں کی صورتوں کو دماغ (نفس) میں قایم کرتے ہیں اور ان کے آپس کے رشتوں کو سمجھتے ہیں۔ اس طرح صورت سے معنی کی طرف جاتے ہیں۔ اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اپنے عقیدے بنا لیتے ہیں۔

فلسفہ یا حکمت بعد کی چیز ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ کل کی بات ہے۔ تحقیق سے معلوم ہو چکا ہے۔ کہ سب سے پہلا بن مانس پانچ لاکھ سال پہلے اس زمین پر چلتا پھرتا اور علم حاصل کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ علم طبقات الارض اور علوم طبعیہ سے ہم صرف عام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ افکار اور خیالات کی ابتدائی تاریخ بابل کے کتب خانوں اور مصر و سندھ کے

آثار سے شروع ہوتی ہے اور وہ بھی اپنی نوعیت میں اتنی گہری نہیں ہے کہ ہم علم انسانی کے ہر درجہ پر تاریخی ترتیب کے ساتھ نتیجے نکال سکیں۔ اسلئے یونانی فلسفہ کو کل کی بات کہنا بے جا نہیں۔ مسیح سے چھ سو سال پہلے یونان میں انسانی دماغ نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ وہ حقایق اشیاء اور اپنے علم کی تصدیق کے متعلق سوالات کرکے ان پر مختلف رائیں قایم کرسکے۔

ہمارے عقیدے ہمارے علم سے بنتے ہیں۔ علم ناقص بھی ہوتا ہے اور صداقت سے قریب ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنے علم کے متعلق چھان بین کریں اور جو عقیدہ قایم کریں۔ وہ سوچنے سمجھنے اور تحقیقات کرنے کے بعد قایم کریں تو گویا ہم نے فلسفہ (یا حکمت) کی ابتدا کردی۔ سقراط نے یہی کام شروع کردیا تھا۔ اور لوگوں پر ان کے عقیدوں کی قلعی کھلنا شروع ہوگئی تھی۔ جس سے آخرکار وہ اتنا تنگ آگئے۔ کہ غریب فلسفی کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔

ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ کہ انسان اپنی جہالت اور نادانی پر قایم رہنا کیوں پسند کرتا ہے۔ اور سچی بات اسے کیوں کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ انسانی ترقی کی راہ میں جب کوئی مصلح یا رہبر ایسی چیز بتاتا ہے جو انسانیت کو اس کے مقصد زندگی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ تو ہمیشہ قدامت پسند معلموں اور ذہنی سرمایہ داروں کی ایک جماعت سچائی کا گلا گھونٹنے پر تل جاتی ہے اور اپنی جاتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے کے خیال سے دوسروں کو سچے علم کی روشنی سے محروم کردینا چاہتی ہے۔

کسی عقیدے کو لے لیجئے اور دیکھیئے کہ وہ کس طرح پیدا ہوا۔ اس طرح انسانی علم کی حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کیجئے۔ کہ ایک زمانے میں یہ عقیدہ عام ہے کہ زمین فرش کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور اتنی لمبی چوڑی ہے۔ کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے،

اس عقیدے پر انسانی عقل کی رسائی کس طرح ہوئی۔ نیچے لکھی ہوئی باتوں میں سے ایک نہ ایک بات سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے:۔

۱۔ لوگوں نے مان لیا ہے کہ زمین چوڑی چکلی ہے۔ جس سے پوچھو یہی مانتا ہے اور یہی کہتا ہے۔ اپنے بچوں کو بھی یہی بتاتا ہے۔ یا

۲۔ پرانی کتابیں۔ یا پرانا علم رکھنے والے یہ کہتے ہیں۔ کہ زمین اتنی لمبی چوڑی ہے۔ کہ خیال سے باہر ہے۔ یا

۳۔ دل میں اس کا یقین خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ زمین لمبی چوڑی ہے۔ گویا یہ ایسی سچائی ہے جس کے لئے دلیل کی کوئی ضرورت نہیں ۔ Intinti Knowledge) یا

۴۔ اس سے بحث نہیں کہ حقیقت کیا ہے۔ زمین چپٹی ہے۔ یا گول ہے۔ اس کے مان لینے میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ کہ زمین چوڑی چکلی ہے۔ اسی میں ہمیں انسانیت کی بھلائی معلوم ہوتی ہے اور بس یا

۵۔ ہمارے مشاہدے اور عقل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کہ زمین چوڑی چکلی ہے۔ اور اسکی کوئی حد نہیں۔

اگلے وقتوں میں سوسائٹی کا نظام کچھ اس طرح کا بن رہا تھا۔ کہ جسمانی طاقت رکھنے والے سردار یا بادشاہ، آقا یا رب کہلاتے تھے اور ایک قبیلہ یا کئی قبیلوں پر حکومت اور انکی حفاظت کرتے تھے۔ وہ لوگ جو سرداروں کو جنگ پر روانہ ہونے کی شبھ گھڑی بتاتے تھے۔ یا عوام کو کھیتی کے موسم کی ابتدا کی خبر دیتے تھے۔ یا پھونک جھاڑ اور دوا علاج کرتے تھے وہ ایک مذہبی گروہ بن رہا تھا۔ اس طرح ایک ہی جماعت میں دو قسم کے لوگ بن رہے تھے

یعنی بعض تو ایسے تھے جو اپنی جسمانی بناوٹ کی وجہ سے لڑنے اور سرداری کرنے کے کام کو انجام دیتے تھے۔ اور بعض ایسے تھے جو اپنی عقل اور تجربے سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سپاہی اور فراست رکھنے والوں (پروہت یا پرسیٹ تنازعہ ۲) کی دو جماعتیں بن گئیں۔ اور دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے فائدے کے گروں ورکیبوں کو نہ صرف ترقی دینے کی کوشش شروع کر دی۔ بلکہ اپنے پیشے کے قیمتی رازوں کو جہاں تک ہو سکا عوام سے چھپانے کی کوشش بھی شروع کر دی۔

لیکن اس کشمکش میں علم ایک جماعت کے قبضہ میں آگیا۔ اور رفتہ رفتہ علم و عقل والی جماعت نے دوسری جماعتوں کو بطور خود سوچنے اور رائے قائم کرنے سے محروم کر دیا اگر کوئی چاہتا کہ خود اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے کوئی رائے قائم کرے تو یہ اس کے لئے بہت ہی مشکل ہو گیا۔ اس طرح لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ بلا وجہ وقت اور محنت ضایع کرنے سے یہ بہتر ہے، کہ جب ضرورت ہو عقل والی جماعت سے پوچھ لینا اور اس پر عمل کرنا ہی مناسب ہے اور گویہ اندھی تقلید علم و تجربہ کے دائرہ کو تنگ کرتی تھی۔ لیکن بظاہر رسم و رواج کی پابندی سے کسی کا کوئی نقصان نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح علم رکھنے والی جماعت میں کئی طرح کے ماہر پیدا ہو گئے۔

وحی والہام

دنیا میں جب سے غور و فکر اور سوچ وبچار کی ابتدا ہوئی۔ اسی وقت سے وحی، الہام یا اسی قسم کے دوسرے لفظ ایجاد ہو گئے۔ یہ لفظ اس تخیل کو ظاہر کرنے کے لئے بنائے گئے تھے۔ جو کسی ان دیکھی طاقت سے علم کو انسان تک پہنچانا ظاہر کرتے تھے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ حصول علم کے دو ذریعے مانے جاتے تھے:-

۱۔ ظاہری ذریعے۔ یعنی ہمارے حواس اور تدبر و تعقل۔ اور

۲۔ ایسے ذریعے جو ماورائے تجربہ ہوں۔ یعنی وحی و الہام۔

اس سے کسی کو انکار نہیں۔ کہ ہمارے علم کا ذریعہ ہمارے ظاہری و باطنی حواس ہیں۔ لیکن اس سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہے۔ کہ سوائے حواس کے دوسرے ذریعوں سے بھی علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس مسئلے کی اجمالی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

تاریخ

پرانے زمانے میں جن ملکوں میں تمدن کی ابتدا ہوئی تھی۔ ان سب میں یہ بات مشترک تھی۔ کہ وہ وحی یا الہام کے قائل تھے۔ اور ہر قوم میں کاہن۔ پیشینگو، نجومی ساحر اور شاعر پائے جاتے تھے۔ جن کا تعلق روحانی دنیا سے ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ زمانہ قدیم میں ہر شے کا ایک روحانی تصور۔ ہر درخت کا ایک جن، اور ہر دریا یا پہاڑ پر کسی نہ کسی روح یا بھوت کا سایہ مانا جاتا اور یہی جن بھوت انسانوں کے دوست بھی ہوتے تھے اور دشمن بھی۔ انہیں خبریں بھی پہنچاتے تھے اور مریض کے لئے دوا بھی تجویز کرتے تھے۔ حتیٰ کہ پوشیدہ خزانوں کے راز اور چھپی ہوئی باتوں (یعنی علمِ غیب) کے متعلق بھی ان سے کاہنوں، ساحروں اور شاعروں کو مدد مل سکتی تھی۔

سایہ یا آسیب

اس سلسلے میں ہر شخص جانتا ہے۔ کہ لوگوں میں یہ بھی عقیدہ تھا۔ کہ دنیا کی اچھی یا بری روحیں انسانوں میں حلول کر جاتی ہیں۔ اور بعض امراض کو آسیب یا حلول مانا جاتا تھا۔

جزائر سینڈوچ (Sandwich) میں بادشاہ میں خدا حلول کر لیتا ہے۔ اور پھر انسانوں سے گفتگو کرتا ہے۔ فجی میں پجاریوں کے ذریعے خدا سے بات چیت ہو سکتی ہے۔"

(دیکھئے صفحہ ۱۳۹ (B. Thompson: Fijians, London 1908)

"عک عادی خاندان (۲۸۰۰ قبل مسیح سے ۳۶۰۰ ق م تک) کی قدیم مذہبی کتابوں سے (جواب فیلاڈلفیا یونیورسٹی میں موجود ہیں) یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں آسیب کا تخیل موجود تھا اسی طرح وی ‍ ‍ ‍ ‍ نے من (Wenamon) مصری جو رامی زیز دوازدہم کے زمانے میں فینیقیہ بھیجا گیا تھا۔ کہتا ہے کہ وہ لوگ خدا کے حلول یا سائے کے قائل تھے۔"

(دیکھئے ہسٹنگز انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ ص ۱۳۴)

'عکاد' بلند یا پہاڑی زمین کو کہتے ہیں۔ عکادی قوم، قدیم کلدی قوم ہے اور عراق کے شمالی پہاڑی ملک میں مغربی ایران تک آباد تھی۔ حضرت ابراہیمؑ (۲۱۲۰ ق م) کلدیہ کے ایک بندرگاہ "اُر" کے ایک شیخ قبیلہ تھے، عرب اور فلسطین کے بعض قبائل ان ہی کی نسل سے ہیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں رہا کہ شہنشاہ حمورابی (۲۱۲۳ - ۲۰۸۰ ق م) کے زمانے میں جو "دینا فی مشعرم" (فیصلہائے عادلانہ۔ یعنی Code of Hammurabi) مرتب ہوا وہ ان قدیم رسموں کا مجموعہ تھا۔ جو عرصۂ دراز سے عکادی قوم میں رائج تھے اور جو سامی نسل کے مذہب اور رسم و رواج سے مل جل کر ایک نئی شکل اختیار کر چکے تھے۔

سامی نسل یمن سے دنیا میں پھیلی

رابرٹ آنڈرسن کی رائے ہے کہ سامی نسل کا ابتدائی وطن جنوبی عرب (یمن) تھا۔ جہاں انہوں نے خانہ بدوش زندگی کو ترک کر کے زراعتی زندگی شروع کر دی تھی۔ وہاں سے اس نسل کے گروہ یکے بعد دیگرے تجارت یا لوٹ مار کے لئے منتشر ہوتے رہے۔ کچھ جنوبی مصر میں آباد ہو گئے اور ایتھی اوپی مشہور ہوئے۔ اس ملک یعنی حبشہ کی زبان جی از (Geez) یعنی مہاجروں کی زبان کہی جاتی ہے یہ سامی زبان ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایتھی اوپی زبان سے نکلی ہے۔ اسی نسل کے لوگ چار ہزار سال قبل مسیح میں کلدیہ پہنچ جاتے ہیں اور وہاں عکادی (یعنی تورانی) آبادی میں مل جل جاتے ہیں

اور ان کے مذہب، قانون اور لٹریچر کا استعمال کر کے ایک قوم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے سامی مہاجر فینیقیہ، شام اور فلسطین میں آباد ہو جاتے ہیں، اور (شاید اس زمانے سے بہت پہلے جبکہ وہ خانہ بدوش حالت میں چرواہوں کی زندگی بسر کرتے تھے) وہ مصر پر حملہ کر کے وہاں کے بادشاہ بن بیٹھتے ہیں اور حی عکسو (Hyksos) یا چوپان بادشاہ کہلاتے ہیں۔"

(دیکھیئے آر۔ ای۔ انڈرسن کی کتاب Extinct Civilization of the East. pp. 20-21)

شہنشاہ حمورابی نے جس قانون کی تدوین کی تھی، وہ یمنی عربوں، عکادی تورانیوں اور شمیریوں کے تمدنوں کے اختلاط کا نتیجہ تھا۔ سحر اور جادو کے متعلق جو قانون شہنشاہ حمورابی نے بنایا تھا۔ وہ جنوبی عرب کے سامیوں کے خیالات کا آئینہ تھا۔ بابلی حکومت سامیوں ہی کی تھی۔ اسلئے ڈاکٹر سائس (Sayce) کی رائے بالکل صحیح ہے۔ کہ "قانون اور رسم و رواج میں دوسری قوموں کے مقابلے میں سامی قوم کے خیالات کو غلبہ اور ترجیح تھی اور پرانے زمانے میں جو کام ساحر کا تھا وہ حمورابی کے زمانے میں پروہت (Priest) انجام دینے لگا تھا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وحی و الہام سے نہ صرف ساحر ہی کام لیتے تھے۔ بلکہ مذہبی جماعت کے سرگروہ (یعنی پروہت) بھی الہامی باتیں بتاتے تھے۔

عرب کے شاعر و کاہن اپنا تعلق روحوں سے اور ایران کے شاعر سروش فرشتے سے بتاتے تھے۔ اور یونان میں میوزین شاعر اور مغنی کی مدد کیا کرتی تھیں۔ لیکن یونانی فلسفیوں اور ہندوستانی رشیوں نے وحی و الہام کے سلسلے میں تخیل کو منطق سے ملانے کی کوشش کی۔ ویدوں کے مصنفوں نے علم کا ماخذ ایک ابدی و سرمدی آواز کو قرار دیا۔ جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے

اور جسے حواسِ ظاہری کو بند کرنے کے بعد انسان "ادم" کی شکل میں سنتا ہے۔

تنزیل کے مختلف معنی (کلام، کلمہ، قول حق، نور، ھدیٰ) (آمد و آورد، قول نفسی، قول غیر)

لوگاس (Logos) اور لغت ہم معنی اور ہم ماخذ الفاظ ہیں۔ کلمہ۔ لفظ۔ بول۔ شبد قول۔ کلام۔ ورڈ۔ نطق۔ سب کا تعلق ان بامعنی آوازوں سے ہے۔ جو انسان کے منہ سے نکلتی ہیں۔

(یوحنا) رسول کی انجیل دوسری صدی مسیحی میں لکھی گئی۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے "ابتدا میں لوگوس (یا کلمہ) تھا۔ یہ کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ ہی خدا تھا" یہی کلمہ گوشت و خون بن کے خدا میں واصل تھا اور مسیح ہی کلمۃ اللہ کے طور پر دنیا میں بھیجا گیا۔

بقول انسائیکلوپیڈیا برطانی :۔ "یہ اصطلاح قدیم فلسفے اور دینیات میں عام طور پر رائج تھی۔ یہ ایک جاری و ساری عقل کے تصور کو ظاہر کرتا ہے جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور کسی قدر فرق کے ساتھ ہندوستان، مصر اور ایران کے فلسفوں میں موجود ہے۔ البتہ اس تصوّر کو یونانی اور عبرانی فلسفے نے خاص طور پر ترقی دی۔ اسکے مدارج یہ ہیں :۔

۱۔ یونانی لوگاس یونانی دماغ اس کائنات کو منظم سمجھتا تھا اور اسی لئے اسے عقل کا ماحصل جانتا تھا۔ اور یہ شروع سے آخر تک ان کے فلسفے، اخلاق اور دینیات پر چھایا ہوا تھا۔ اسکے تین مدارج نمایاں ہیں: ہرقلیتوس، رواقیین، اور فیلو۔

ہرقلیتوس: (چھٹی صدی قبل مسیح) کل کائنات میں لوگوس کو جو انسانی عقل سے

مشابہ تھی، جاری وساری بتاتا تھا۔ اور یہی عین کائنات بھی ہے۔ روح بھی اسی کا جز ہے یہ اضافت یا عقل ہے نہ کہ لفظ یا نطق۔

رواقیین (Stoics) بھی اپنے نظامِ فلسفہ میں لوگوس کو نمایاں جگہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ کہ دنیا کی ایک غایت ہے۔ اور ایک عامل اس کو چلا رہا ہے۔ اسی کو لوگوس بھی کہتے ہیں اور خدا بھی۔ مردہ مادہ کو عقل اسی طرح زندہ کرتی ہے۔ اسے قانونِ تخلیق کہتے ہیں۔

ان کے بعد یہودی لوگوس کا تصوّر میدان میں آیا۔ اور تین عقدے بیان ہوئے لوگوس خدا کا لفظ 'کن' ہے۔ جس سے کل کائنات پیدا ہوئی (تکوین ۱) لوگوس فرشتہ ہے جسکی صورت میں خدا ظاہر ہوتا ہے اور معاہدے کرتا ہے (تکوین۔ ۱۱۔ ۱۳ وغیرہ)
لوگوس خدا کی عقل ہے (کتاب ایوب وامثال) ترگوم میں یہ تینوں عقیدے مل جاتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں۔

فیلو: یہودی تھا اور سکندریہ کے فلسفے کا بیان کرنے والا تھا۔ اس پر افلاطونیت، اشراق، رواقیت اور یہودیت کا اثر پڑا تھا۔ اور اس نے تورات کے کلمہ کو یونانی لوگوس کا ہم معنی بتایا۔ گویا ایک خدا تھا اور لوگوس بھی دوسرا خدا خدا کے اندر تھا اور اس دنیا کو تیسرا خدا مانا جاتا تھا۔

تنزیل وحی یا الہام کا انسانی زندگی سے تعلق

زمانہ قدیم میں علوم وفنون کی اجارہ داری ایک خاص جماعت سے ہو گئی تھی۔ جسے مذہبی جماعت یا برہمن کہہ سکتے ہیں۔ یہ جماعت دیوتاؤں سے علم حاصل کرتی تھی اور اگر اس جماعت سے باہر کا کوئی شخص کسی نئی ایجاد کو سامنے لاتا تھا تو پہلے اسے ٹاٹ باہر کر دیا جاتا تھا اور پھر ہر

اس شخص کو جو اس کے کہے پر عمل کرتا تھا۔ اس کا ساتھی سمجھ کر اسے بھی ٹاٹ باہر یعنی جلاوطن یا برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ یہ حالت موت سے بھی بدتر سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے کہ ایسے شخص کا خون مباح تھا۔ اور اسے کہیں پناہ نہ مل سکتی تھی۔ یورپ میں یہ حالت پندرہویں صدی کے بعد تک رہی اور ہزاروں بے گناہ جاہل پادریوں کی اجارہ داریوں پر قربان کر دیئے گئے۔ موسیقی جرم تھی حتے کہ بلبل کا نغمہ سننا بھی شیطانی کام تھا۔ کولمبس یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ زمین گول ہے۔ نہ کوئی یہ بتا سکتا تھا۔ کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ علم کیمیا ممنوع تھا اسلئے گندھک اور شیشے کے برتنوں کے ذریعے سے جادوگری کرنا مذہب کے خلاف تھا۔ اسی لئے دنیا ایک جگہ قائم تھی اور تجدید و ترقی کی راہیں پوپوں اور دستوروں نے بند کر رکھی تھیں۔

انسانی زندگی میں آزاد خیالی کو بلند جگہ حاصل ہے لیکن قدامت پرستی (یعنی مذہبی اجارہ داری) نے لکیر کا فقیر بننے کے لئے ہر شخص کو بزور شمشیر یا بزور مقاطعہ مجبور کر رکھا تھا۔ پھر بھی انسان دیوتاؤں کے نام پر کچھ نہ کچھ ترقی کر رہا تھا۔ یہ ترقی زندگی کے تین پہلوؤں یا شعبوں سے متعلق تھی۔ اور ان تینوں میں وحی والہام دیوتاؤں کے یہاں سے حاصل ہوتا تھا

(۱) سوشل الہامات کا تعلق علم الاخلاق اور قانون سے تھا۔ نصیحت کی باتیں یا اچھی باتیں اخلاق سے متعلق تھیں۔ خواہ وہ قصاص پر آمادہ کرنا ہو۔ یا کسی قوم کے دیوتاؤں کو برا بھلا کہنا۔ اسی طرح قانون و سیاست میں اپنی قوم ہی کی بھلائی پیش نظر ہوتی تھی۔ حتے کہ اکثر صورتوں میں راجا یا بادشاہ یا چند امرا۔ اپنے بھلے کو قوم کا بھلا سمجھتے تھے اور جہاں قوم کو ذاتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہاں پجاریوں کی ذات کا بھلا ہو گیا تو سب کا بھلا مانا جاتا تھا۔ نیچ ذات، عورت، غلام اور غیر ملکی کو مجبوری و محکومی کی حالت میں رکھنے کے لئے

ضروری تھا۔ کہ الہامات کو دیوتاؤں سے منسوب کیا جائے۔

لیکن ان الہامات میں بھی کبھی کبھی نیک دل مصنفوں کے اثر سے اچھے اصول اخلاق اور عادلانہ قوانین بھی داخل ہو جاتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے "قول کاہن" کے مقابلے میں موعظتِ قرآنی کو پیش کیا۔

(۲) ادبی الہامات کے سلسلے میں شاعر و کاہن کا بڑا درجہ تھا۔ لیکن وہ بھی اکثر انہیں مضمونوں کے متعلق گیت گاتے یا پیشنگوئیاں کرتے تھے جن کو ان کی قوم نے اپنے اپنے معیار اخلاق کے مطابق صحیح تصور کر لیا تھا۔ لہٰذا شاعر اور ادیب کو اپنی صنعت (آرٹ) یا قوتِ تخلیق دکھانے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ وہ ہر پھر کے انہی بندشوں میں جکڑا ہوا تھا جو ان کے پیشروؤں نے مقرر کر دی تھیں۔ وہی گل، وہی بلبل، وہی جذبات و امیال اور وہی طرز ادا۔ جہاں کہیں اس قدامت پرستی کے خلاف بغاوت کی گئی۔ فوراً ادبی اجارہ دار، جو عموماً مذہبی اجارہ دار ہوتے تھے۔ سامنے آئے اور انسانی فطرت کی تخلیقی قوت کے بہاؤ کو غیر فطری قرار دے کر جدت پسندی کا منہ بند کر دیا۔

قرآن نے شاعری اور ادب کو آزادی دلوائی۔ اور معیارِ اخلاق کو انسانی فطرت کی کسوٹی پر جانچنا سکھایا۔ پھر تو تاریخ۔ شعر اور ادب کا مقصد ہی بدل گیا۔ خونریزی کی جگہ امن۔ نفاق اور طبقاتی کشمکش کی جگہ مساوات، اور قدامت پرستی کی جگہ آزادیِ فکر نے لے لی۔ اب تاریخ محض افسانہ گوئی نہ رہی۔ نہ شعر مجموعہ الفاظ۔ بلکہ ان سب کی غایت انسانی انانیت کو بیدار کرنا ہو گیا۔

۳۔ سائنسی الہامات کے سلسلے میں بھی قدامت پسند جماعت ہمیشہ رکاوٹیں ڈالتی رہی۔ لیکن قدرت کے قوانین کو نمایاں ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ جب آگ نے جلانا شروع کیا۔ تو ہر شخص اسے دیوتا ماننے لگا۔ اور آگ کا استعمال بتانے والا (اگنی ہوتری)

بڑا سائینسدان، یا دیوتاؤں کا رازدان مشہور ہو گیا۔

غالباً قدیم زمانے میں سائینسدانوں کو ساحر کا لقب دیا گیا تھا۔ وہ اپنی پوشیدہ ترکیبوں سے لوگوں کو نفع نقصان پہنچانے کے دعویدار تھے۔ اس کے مقابلے میں قرآن نے تفکر و تدبر فی الخلق (یعنی سائنس و فلسفہ یا حکمت) کو پیش کیا۔ اور بار بار کہا۔ کہ قرآن کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ کہانت و سحر کی۔

قرآنی وحی کی نوعیّت

قرآن میں بار بار کہا گیا ہے۔ کہ یہ وحی ویسی ہی ہے۔ جیسی کہ گذشتہ نبیوں پر نازل ہوتی رہی ہے (انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانے نبیوں کی کتابیں وحی کی نوعیت کو بتا سکتی تھیں۔

توراۃ تخلیق عالم سے شروع ہوتی ہے۔ میک لیر مصنف تاریخ توراۃ اور دیگر محققین کی رائے ہے کہ آدم و حوا کا جنت سے اخراج ۴۰۰۴ سنہ ق م میں ہوا۔ "شیطان دھوکہ باز اگرچہ فرشتہ تھا۔ لیکن نافرمان ہو کر راندہ درگاہ الٰہی ہوا۔ (یوحنا ۸-۴۴) اور خدا کا دشمن بن بیٹھا" (جوڈ ۶)

یہ سانپ بھی کہا جاتا تھا اور عرب میں بھی اسے جَانّ (یعنی سانپ) کہتے ہیں۔

اس کے بعد ۲۳۴۸ سنہ ق م میں طوفان نوح آیا اور اس کے بعد "بطریق نوح" اور خدا میں پہلا معاہدہ بمقام آرمینیہ ہوا کہ زمین کو اب آبی طوفان سے تباہ نہ کیا جائے گا۔ بطریق اب رام (جو بعد میں ابراہام) کہلائے مقام اُر (کلدیہ یا عراق) کے رہنے والے تھے جو ۱۹۲۱ سنہ ق م میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۶ سنہ ق م میں وفات پائی۔ یہ سام بن نوح کی آٹھویں پشت میں بتائے

جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ سب نبی یا خبر غیب دینے والے تھے لیکن یہودیوں کے نزدیک حضرت موسےؑ کے بعد نبوت کا آغاز ہوا۔ اور بعد کے زمانے میں نبیوں کا مدرسہ بھی قائم ہو گیا۔ جس میں نبوت یا پیشنگوئی کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔

بطریق ابراہام کی نسل کے لوگوں نے مسیح سے تقریباً سولہ یا تیرہ صدی پیشتر کنعان پر حملہ کیا تھا۔ اور ساحلی حکمران فلسطینی تھے۔ قاضیوں کی کتاب میں تفصیل سے ان لڑائیوں کا ذکر ہے۔

یہودیوں نے مسیح سے تقریباً ہزار سال پہلے ساؤل (طالوت) کو اپنا بادشاہ بنا لیا تھا اس کے بعد داؤدؑ نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے جانشین سلیمانؑ ہوئے۔ اس سلطنت سے پہلے یہودیوں کے شیوخ اپنی حکومت کے لئے قاضیوں کا انتخاب کر لیا کرتے تھے شاہ سلیمانؑ کے بعد اس سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ بنو اسرائیل شمال میں۔ بنو یہوداہ یروشلم پہ حکمران تھے۔ آخر ۷۲۱ھ ق م میں بنو اسرائیل غلام بنا کر اسیریا بھیج دیئے گئے اور فنا ہو گئے۔ ۶۰۴ھ ق م میں بنو یہوداہ کا بھی وہی حشر ہوا اور بابل پہنچ کر یہودیوں نے اپنی کتاب توریت اور تاریخ مرتب کی اور بابلی تہذیب سیکھ کر اپنی تاریخ اور کتاب کو لئے ہوئے سیروس (شاہ ایران) کی اجازت سے یروشلم میں آ کر آباد ہوئے اور پھر دنیا میں منتشر ہو گئے، یہودیوں میں اس قید کے زمانے میں آیندہ کے متعلق پیشنگوئی کا چرچا شروع ہوا اور یسیعاہ کی نبوت معراج کمال کو پہنچی۔ اور ہر ایک نبی نے اپنے کلام کی ابتدا یوں کرنا شروع کی۔ کہ "اب خدا کا کلام میرے پاس آیا ہے۔"

کتاب عہد عتیق (یعنی کتب موسوی وغیرہ) کے جمع کرنے والوں نے قول اللہ کو جس طرح انسانوں کی زبان سے ادا کرایا ہے اس سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) کہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا اور انسان آمنے سامنے ہیں اور خدا اسی طرح بول رہا ہے۔ جیسے ایک آدمی دوسرے سے بولتا ہے۔

مثلاً خدا آدمؑ سے کہتا ہے "کپڑے پہنو اور باغ کی نگہبانی کرو" (تکوین ۱-۲-۳) یا نوحؑ سے کہتا ہے۔ کہ "میں طوفان لا کر سب کو مار ڈالوں گا۔ لہذا اتنی بڑی کشتی بنا اور اس میں جانوروں کو رکھ وغیرہ وغیرہ۔" یا مثلاً خدا بلعام سے ملا۔ اور وہ (بلعام) اس سے کہتا ہے۔ کہ "میں نے سات مذبح تیار کئے ہیں اور ان پر ایک ایک بیل اور ایک ایک مینڈھا چڑھایا ہے" (گنتی ۲۳-۲-۴) تاکہ بالک شاہ کے حکم کے مطابق اس کے حق میں دعا کروں اور اسرائیل کو بددعا دوں۔" لیکن خدا نے بلعام کے منہ میں یہ بات ڈالی۔ کہ وہ جا کر کہنے لگا۔ کہ میں کس طرح ایسے شخص کو بددعا دے سکتا ہوں۔ جس کو خدا نے ملعون نہیں کیا۔" (گنتی ۲۳-۴-۸)

(۲) کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا دکھائی نہیں دیتا۔ صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ اور اس قول اللہ کو نبی اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ مثلاً ارمیاہ کے پہلے ہی باب میں ہے کہ: "یہ الفاظ ارمیاہ بن حلقیاہ کے ہیں جس پر خدا کا کلام نازل ہوا اور کہا۔ میں تیرا خالق ہوں اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا منہ چھوا۔ اور کہا۔ کہ میں نے اپنا کلام تیرے منہ میں ڈال دیا۔"

(۳) کہیں خدا خواب میں نظر آتا ہے اور باتیں کرتا ہے۔ مثلاً

(الف) یسعیاہ (۶) میں ہے "میں نے خدا کو ایک تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ بلند اور اٹھا ہوا تھا اور اس کے لباس سے معبد بھرا ہوا تھا۔

(ب) اس کے اوپر فرشتے کھڑے تھے۔ ہر ایک کے چھ پر تھے۔ دو پروں سے وہ اپنا منہ ڈھانکے تھے۔ دو سے پاؤں، اور دو سے اُڑتے تھے۔

(ج) اور ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا سبحان۔ سبحان۔ پاک ہے۔ رب الافواج (کل زمین

اس کی شوکت سے بھری ہوئی ہے۔

ح اور میں نے رب کی آواز سنی، اس نے کہا۔ میں کسے رسول بناؤں اور کون ہے جو میری طرف سے جائے گا؟ تو میں نے کہا لبیك۔ مجھے بھیج دے۔

ط اور اس نے کہا، جا۔ اور اس قوم سے کہہ دے کہ تم سنتے ضرور ہو لیکن سمجھتے نہیں۔ اور دیکھتے ضرور ہو۔ مگر شناخت نہیں کرتے۔"

(۴) کہیں خدا کی روح یعنی خود خدا نبی میں حلول کر کے باتیں کرنے لگتا ہے۔ بائبل میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔

بائبل سراسر ایک سامی قوم کی الہامی، تاریخی اور ادبی کوشش کہی جاسکتی ہے۔ لیکن حلول کا تصور آریہ قوموں میں بھی موجود ہے۔ رگ وید ہندوستانی آریوں کی الہامی تصنیف ہے۔ یہ سروتی یعنی سماعت کی ہوئی چیز مانی جاتی ہے یعنی انسانی تصنیف نہیں۔ بلکہ خدائی آواز نے اسے رشیوں کو سنایا۔ جو خود دیوتاؤں کا درجہ رکھتے تھے اور غلطی، سہو اور نسیان سے بالاتر تھے۔ برہمن اس بات کو اتنا بدیہی سمجھتے ہیں کہ اس کے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے۔ یہ قدیم مانے جاتے ہیں اور زمانہ شروع ہونے سے پہلے خدا کے من میں موجود تھے۔ برہم انہیں برھما کو بتاتا ہے اور وہ رشیوں کو سکھاتے ہیں۔ "یہ خدا کا سانس ہیں" ھدینچہ برہمنا ۱۴-۵ میں لکھا ہے کہ "جس طرح گیلی لکڑی سے مختلف قسم کے دھوئیں نکلتے ہیں۔ اسی طرح ویدیں۔ پرانیں وغیرہ اس کے سانس ہیں۔" اور اسی میں لکھا ہے کہ "نفس سمندر ہے۔ زبان کدال ہے اور ویدک علم دیوتاؤں نے کھود کر نکالا ہے۔" اور تیت تریا برہمنا (۵-۸) میں اس کی تائید ہے۔ "بات (کلمہ) قدیم اور لافانی ہے۔ یہ شرع کی پہلی اولاد ہے ویدوں کی ماں ہے اور بقا کا مرکز ہے۔"

لیکن اسی کے ساتھ رشیوں نے یہ بھی دعوےٰ کیا ہے کہ یہ بھجن ان ہی کی تصنیفیں ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر میور نے ۵۲ سندیں بیان کی ہیں اور داخلی شہادت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ میں فتح کے لئے بعض بھجن تصنیف کئے جاتے تھے اور اسی قسم کی دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا نہیں بلکہ انسان ان کا مصنف ہے۔ البتہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ الہامی ہیں اور بعض بھجن مریض یا راجا کو تندرستی اور فتح دلا سکتے تھے اور ان منتروں کو جادو اثر یا خود جادو سمجھا جاتا تھا۔ ویدوں کی تصنیف کا زمانہ بھی توراۃ کے زمانے کے قریب کا زمانہ ہے یعنی میکس ملر کے قول کے مطابق مسیح سے ۱۵۰۰ سال پہلے شروع ہو کر ہزار سال قبل مسیح تک میں یہ وید تصنیف ہوئے ہیں۔ ان کی شرحیں (برہمنا) ۸۰۰ قم سے ۶۰۰ قم تک اور خلاصے (سوتر) ۶۰۰ قم سے ۲۰۰ قم تک بنائے گئے۔

قرآن اور وحی

شاعروں کے الہامات تو اب تک جاری ہیں۔ لیکن اخلاقی اور قانونی الہامات کا دروازہ اب بند سا معلوم ہوتا ہے اور لوگ آپس کے مشورے سے قانون اور نفسیاتی تجربہ کے بعد اخلاقیات کے علم کو مدون کرتے ہیں۔ اور جوں جوں زمانہ یا ماحول بدلتا ہے، اخلاقی و قانونی نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی اقتدار کی نوعیت معاشی مسائل کی پیچیدگیاں اور تنقیح، فلسفۂ نفسیات، اور سائنس کی ترقی نے اخلاق اور قانون کے لئے نئے نئے نظریات پیدا کر دئے ہیں۔

قرآن کی بھی یہی تعلیم ہے۔ کہ سیاسی اور قانونی زندگی کے لئے قدیم تاریخ اور نفس انسانی کا مطالعہ سبق آموز ہے۔ بار بار تاریخی واقعات کے سبق دہرائے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے۔ سیاسیات و اخلاقیات کے قوانین ترقی پذیر ہیں اور اس کا معیار قایم و جامد نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے شوریٰ پر بہت زور دیا ہے؛

جب یہ بات واضح ہو گئی تو قرآن کی وحی متعین ہو جاتی ہے۔ رسولِ عربی کے زمانے میں خصوصیت سے عرب میں وحی و الہام شیطان اور جن کی طرف سے ہوتا تھا۔ قرآن نے بتایا کہ وحی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور ان شکلوں میں سے کسی شکل میں بھی ہو سکتی ہے۔ جو قدیم دنیا کے نبیوں میں رائج تھی۔ یعنی

(۱) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کے دل میں فطری طور پر ایک اشارہ خفی (وحی یا انسٹنکٹ) کسی اچھی یعنی فطری بات کی طرف ابھارے۔ جس طرح شہد کی مکھی اپنے طبعی رجحان سے بے نظیر چھتہ پہاڑوں پر بناتی ہے" (قرآن)

(۲) یا ایک کامل انسان فلاحِ انسانیت کے لئے اپنے فکر و تدبر سے ایک پروگرام بنائے اور اس زمانے میں خدائی مدد اس کا ساتھ دے یعنی وہ الہام یا وحی من جانب اللہ ہو لیکن اس شخص کی تصنیف و غور و فکر کا نتیجہ یعنی اس کی تخلیق ہو۔

ہمارے خیال میں قرآن نے وحی الٰہی کے یہی معنی لئے ہیں اور شاہ ولی اللہ۔ متمم حکمائے اسلام نے بھی 'حجۃ اللہ البالغہ' میں اس کی تائید کی ہے۔

علم دینے والی ان دیکھی قوتیں

(یعنی وہ قوتیں جو مشاہدہ میں نہیں آ سکتیں)

ظاہر ہے۔ کہ انسانی دماغ کا ابھی بچپن تھا۔ اسے ہر طرف روحیں ہی روحیں نظر آتی تھیں۔ درخت۔ دریا۔ جانور۔ سورج۔ چاند۔ تارے۔ آسمان۔ زمین سب ایک نہ ایک روح کے ماتحت کام کرتے تھے اور یہی روحیں انسان کو بھی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتی تھیں۔ شروع زمانے میں سب روحیں ایک ہی طرح کی مانی جاتی تھیں۔ اگر وہ فائدہ پہنچاتی تھیں تو اچھی تھیں۔ نقصان پہنچاتی تھیں تو بُری تھیں۔ ملکوں کے اعتبار سے ان کی تقسیم اس طرح سے ہو گئی ہے:

روحانی ایلچی یا رسول

فرشتے اور دیو

قدیم دنیا میں دو قسم کی روحیں غیب کی باتیں بتاتی تھیں اور تدریجاً ان کی تقسیم ایسی ہوگئی تھی۔ کہ ہرمز (یعنی خدائے خیر۔ اہورامزدا) کے ایلچی اچھی روحوں والے پراسفایا امیش سپند کہلاتے تھے۔ یہ وہ پاک اور غیر فانی وجود ہیں جو مذہب زرادشت کے دیوتاؤں (ایزدوں) کے سردار مانے جاتے ہیں۔ ان ایزدوں میں سے ایک فتح کا دیوتا مترلب ہے جو ہرمز کی آنکھ ہے اور دوسرا آتش ہے۔ جو اس دنیا میں ہرمز کی نمائندگی کرتا ہے۔

ان کے مقابل اہرمن (انگرامینو یا دروغ یعنی خدائے شر) کے ایلچی، بری روحوں والے دیو ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کے اچھے کاموں کو برباد کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اہرمن دھوکے اور مکاری کی روح ہے۔ وہ زندہ جانوروں کی قربانی اور ہوم شراب سے خوش ہوتی ہے۔ اور وہ دیووں اور پریکاؤں (یعنی پریوں) کے ذریعے سے کام کرتا ہے۔ اس کے پجاری 'کاوی' اور جادوگر 'یتو' کہلاتے ہیں۔

یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایرانیوں نے یہ خیالات سامیوں (یعنی اہل عرب اور اہل بابل) سے سیکھے تھے۔ لیکن خود سامیوں اور دوسری غیر متمدن قوموں میں دنیا کا روحانی تصور جسے روحیت (Animism) کہتے ہیں موجود تھا اور غالباً ہر قوم میں خودبخود یہ خیال پیدا ہوا ہوگا۔ اور بعد میں ایک دوسرے کے اثر سے روحوں کے طبقات مقرر ہوئے ہونگے

پیشینگوئی اور نبوّت قدیم زمانے میں نبوت کا تعلق چھپی ہوئی باتوں کا حال بتانے سے تھا۔ اور آئندہ جو ہونے والا ہے اسے ظاہر کرنا بھی نبوت تھا۔ اب اسی کو غیب گوئی اور پیشنگوئی بھی کہتے ہیں۔

بابل کے خداؤں میں نبو ایک بلند مرتبہ دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ وہ بعل مرود اخ کا بیٹا تھا۔ اور اپنے باپ کے احکام کی ترجمانی انسانوں سے کرتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہایت ہی قدیم زمانے سے سامی زبانوں میں نبو یا نبی کا لفظ غیب کی باتوں کو ظاہر کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ پیشنگوئی یا نبوت سے پہلے انسان نے جو مذہب بنایا تھا۔ اس میں قدرت کی مہیب قوتوں سے بچنے یا ان کو خوش کرنے کے لئے سحر یا جادو سے کام لیا جاتا تھا۔ ابتدا میں ہر چیز میں روح مانی جاتی تھی۔ اور بعض لوگ یہ دعوے کرنے لگے تھے۔ کہ وہ روحوں سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے بیماری، قحط اور دکھوں کو دور کر سکتے ہیں۔

لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ جادوگر بہت بدنام ہو گئے۔ پہلے اچھی اور بری روحوں میں کوئی تفریق نہ تھی۔ لیکن جب یہ بات عام طور پر مانی جانے لگی کہ روحیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی۔ تو عموماً جادوگروں کو بری روحوں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ یہ بری روحیں ایران میں دیو کہلاتی تھیں۔ ہندوستان میں آسور، اور سامی زبانوں میں جن، عفریت اور غول۔ یہ سب شیطان کی ذریات سمجھے جاتے تھے۔

شیطان کی پیدائش جب ہر قوم میں اچھی اور بری روحوں میں امتیاز شروع ہوا۔ تو انہوں نے دنیاوی حکومتوں کے نمونے پر یہ نتیجہ نکالا کہ ان روحوں کے بھی

بادشاہ یا سردار ہوں گے۔ اس لئے بری روحوں کے سردار یا ملک کو شیطان مانا گیا۔

یہ عقیدہ مصری۔ ایرانی اور سامی قوموں میں یکساں طور پہ پایا جاتا ہے۔

مصری شیطان

مصر میں زمین (SEB) کو کائنات کی ماں اور آسمان (NUT) کو باپ مانا جاتا تھا۔ ان دونوں سے مصر کا نہایت مقبول خدا اوسی رس (OSIRIS) پیدا ہوا تھا۔ اسی کو سورج دیوتا (RA) مان لیا گیا تھا۔ سورج کے مقابلے میں چاند دیوتا (THOTH) تھا جو وقت اور فاصلہ بتاتا تھا۔

ایک دفعہ زمین دیوی کو سورج دیوتا نے یہ بددعا دی کہ اس کے کسی دن اولاد نہ ہو گی۔ لیکن چاند دیوتا بیچ میں پڑا اور پانچ نئے دن بنائے۔ جس میں اوسی رس، شیط، اِی زیز، اور انقتایس پیدا ہوئے ؛

شیط کی فطرت شر محض تھی۔ اس نے اپنے بھائی اوسی رس سے اسلئے حسد کیا۔ کہ اس نے مصریوں کو مبادیات تمدن سکھائے تھے لہٰذا اسے دریائے نیل میں غرق کر دیا۔

جب ای زیز کو (جو اوسی رس کی بہن اور ماں دونوں تھی) خبر ہوئی۔ تو وہ اس کی لاش دریا سے نکال لائی۔ پھر بھی شیط اپنی شیطنت سے باز نہ آیا اور اس لاش کے چودہ ٹکڑے کر دئے۔ ہورس، ای زیز کا بیٹا تھا۔ ماں کے حکم سے شیط سے لڑا اور اسے گرفتار کر لایا لیکن معلوم نہیں کیوں اس نے شیط کو رہا کر دیا۔

یہ شیط (یا شیطان) نہایت ہی پاجی روح سمجھی جاتی تھی۔ اس کی شیطنت کے خوف سے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔ آخر میں جب اس کی بدی کافی طور پر نمایاں ہو گئی تو مصریوں نے اس کی عبادت ترک کر دی اور اسے خداؤں کا دشمن اور شر محض سمجھنے لگے اسکے بعد مصریوں نے یہ فرض کر لیا کہ وہ اجنبیوں اور پردیسیوں کا دیوتا ہے۔ اسلئے بابل کے بعل کو

وہ خصوصیت سے شیطان ماننے لگے۔

یہاں یہ نوٹ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اب تک عراق اور شام میں ایک جماعت ایسی پائی جاتی ہے جو شیطان کی پرستش کرتی ہے اور یزیدی کہلاتی ہے۔ اس جماعت کا قول ہے کہ خدا تو خیر محض ہے اسے خوش رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت تو یہ ہے۔ کہ یہ پاجی رُوح جسے شیطان کہتے ہیں۔ کسی طرح ایذا پہنچانے سے باز رہے اور خوش رہے۔

ایک تعجب انگیز بات یہ ہے۔ کہ ایرانی آریوں میں جن روحوں کو آہور کہتے ہیں انہی کو ہندی آریہ آسود کہتے تھے اور جس روح کو ایرانی دیو سمجھتے تھے۔ اس کو ہندی آریہ دیوتا قرار دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبل تاریخی زمانے میں آریوں میں دو گروہ ہو گئے تھے کوئی یزداں پرست تھا اور کوئی دیو کی پرستش کرتا تھا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور وہ لوگ ایک دوسرے کے خداؤں کو بُرا کہنے لگے۔ ایران میں اہورا یعنی یزدان باقی رہا لیکن جو آریہ شکست کھا کے باہر نکل گئے۔ انہوں نے اہورا کو اسورا یعنی شیطان بنا دیا اور دیو، دیوتا (یا یونانی نام دیو DIU) (انگریزی DIETY) ان اقوام کا یزدان باقی رہا۔ لیکن ایرانیوں کے نزدیک دیوتا پرستوں کو دیو پرست یعنی شیطان پرست پکارا گیا۔

ایرانی شیطان یا اہرمن زردشت (۵۸۳ - ۶۶۰ ق م) قدیم میدیہ میں بحر خزر کے جنوب میں مرو (MERW) اور رے (Ragha) میں تعلیم دیتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ بلخ وسیستان میں تعلیم دیتے اور مسیح سے ہزار سال پہلے موجود تھے۔ (دیکھئے Moulton کی The Treasure of Magi, Milford 1917)

غالباً زردشت سے دو تین ہزار سال پہلے ویدک اور اوستانی قومیں وسط ایشیا میں ساتھ ساتھ

رہتی تھیں، آریہ یا ایرانی کہلاتی تھیں - اور ایک ہی زبان بولتی تھیں۔

رگ وید میں جو فطرت پرستی پائی جاتی ہے۔ اس کی زردشت نے اصلاح کی اور ایک روحانی توحید کی بنیاد رکھی اور ایک عقلمند رب (ہرمزد) کی عبادت کا حکم دیا اور دروغ (دیوؤں یا برے دیوتاؤں) کو اسلئے ناپسند کیا کہ اس نے ظلم و درشتی کو پسند کیا تھا۔ مجوس نے (جو برہمنوں کی طرح پروہتوں کی ایک جماعت تھی) انگرامینیو یا اہرمن (دشمن روح) کو ہرمزد کا مقابل سمجھا۔

دونوں کی کشمکش میں ہرمزد (یزدان) کا ساتھ دینے کا طریقہ بتایا۔ اسلئے کہ آخر کار اہرمن تباہ ہوگا اور دونوں جہان میں ہرمزد کی خدائی ہوگی۔

اہرمن کے ساتھ چھ خاص دیو ہیں۔ جب ہرمزد نے دنیا پیدا کی تو پہلے تین ہزار سال تک صرف روحانی دنیا تھی۔ اتنے میں اہرمن جاگ اٹھا اور نو ہزار سال تک جنگ کی۔ آخر ہرمزد نے ایک دعا سے اسے بے ہوش کر دیا۔ اور تین ہزار سال تک وہ مادی چیزیں پیدا کیں جن کی روحانی شکلیں پہلے سے موجود تھیں۔

اب پھر ہرمزد اور اہرمن کی جنگ شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ زردشت پیدا ہوئے۔ ان کے بعد تین ہزار سال تک نبیوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور آخر میں ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا۔ اور کل دنیا پھر زندہ ہوگی اور ہرمزد کی فتح ہوگی اور ایک غیر محدود زمانے کا نیا دور شروع ہوگا۔

(See Dictionary of Religion and Ethics)

سامی شیطان اور جن

عربی زبان میں شیطان (بروزن فعلان از شاط یشیط) کے معنی ہیں ہر ایک متکبر اور سرکش جو حد سے تجاوز کر جائے، خواہ وہ جن ہو۔ انس ہو یا جانور ہو۔ ابلیس بھی

شیطان تھا۔ یعنی بدمعاش، دھوکا دینے والا اور تکلیف پہنچانے والا۔ لیکن ابلیس سرکش فرشتہ نہ تھا۔ بلکہ جن تھا۔ قرآن میں ہے۔ کہ کان من الجن۔ ابلیس جس شیطان کا اسم علم ہے اَبْلَسَ کے معنی متحیر ہونے کے بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن صاحب اقرب الموارد کا قول ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ عجمی ہے۔

لسان العرب میں (ابلس) کے تحت میں اس کی تائید ہے۔ کہ یہ لفظ عجمی ہے عربی میں رحمت الٰہی سے مایوس ہونے کو ابلاس کہتے ہیں۔ ایک حدیث بھی ہے۔ جس میں ابلاس کے معنی حیرت کے بھی ہوتے ہیں۔ (الم تر الجن وابلاسها)

ابوبکر نحوی کا قول ہے کہ اس کے معنی تنوط اور رحمت اللہ سے نا امیدی کے ہیں، ابلاس کثرت حزن سے ساکت ہونے یا لاجواب ہو کر چپ ہو جانے کو بھی کہتے ہیں۔ غرضیکہ قرآن نے ابلیس کو جن بتایا ہے۔

لیکن لفظ "جن" بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے:۔

(۱) جنّ بمعنی پوشیدہ کیا۔ ڈھانپا (ستر) لہٰذا جن وہ ہستی ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ اور دکھائی نہ دے۔ جمع جنان و جنّہ۔

(۲) جنّ بیٹا ہے جان کا۔ یہ آگ سے پیدا ہوا ہے۔

(۳) جنّ کی جمع جنّہ ہے۔ یہ ملائکہ کے معنی میں بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ (لقد علمت الجنّة انّهم لمحضرون) الفراء کا بھی قول ہے کہ جن بمعنی ملائکہ اس آیت میں استعمال ہوا ہے (جعلوا بینه وبین الجنة نسبا) یعنی خدا اور فرشتوں میں رشتہ جوڑ دیا اور انہیں خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

(۴) جنّة بھی جن کو کہتے ہیں۔ یعنی جو النّاس کے خلاف ہو۔ جوہری کا قول ہے کہ

جنّہ کی واحد جنی ہے۔

(۵) جان۔ سانپ کی ایک قسم کو کہتے ہیں۔ جو گھروں میں رہتا ہے اور ایذا نہیں دیتا۔ اور حدیث میں ہے۔ جنّان کو مارنا نہ چاہیئے (لسان العرب۔ صفحہ ۲۵۰۔ ج ۱۶)

(۶) جان۔ شیطان کو بھی کہتے ہیں اور ابلیس بھی جان تھا۔ یعنی فرشتہ تھا۔ بعض حدیثوں میں اسے انسان کے خلاف جن کی جماعت سے بتایا گیا ہے۔

بہرحال جن اور انسان دونوں مخلوقوں میں شیطان ہوتے تھے۔ لیکن جنوّں کے شیطانوں کا سردار ابلیس تھا۔ یعنی وہ ایسا آنکھ سے چھپا ہوا (جن) فرشتہ تھا۔ جس نے خدا کی نافرمانی کی تھی اور فرشتوں کی جماعت سے نکال دیا گیا تھا۔ قرآن میں ابلیس کے لئے بھی شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فازلھما الشیطان (سورہ بقر) اور انسانی شیطانوں کیلئے بھی مثلاً فاذا خلوا الیٰ شیٰطینھم (سورہ بقر) لیکن موخر الذکر آیت میں شیطان کے معنی شریر النفس آدمیوں کے ہیں۔ اور پہلی آیت میں شیطان سے مراد ابلیس ہے۔ جو سرکشی کا مترادف ہے۔ اور طغیان مجسم کا نام ہے۔

جن جنوں کی زندگی بھی انسانی زندگی کی طرح آبادیوں پر مشتمل تھی۔ مگر یہ آبادیاں انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی تھیں۔ ان کا مشہور شہر عبقر تھا۔ جو نہایت خوبصورت سمجھا جاتا تھا اور انسانوں سے بہتر صناع اور کاریگر وہاں آباد تھے۔ حکومت البتہ انسانی نمونے پر تھی یعنی بادشاہ وزیر اور امیر ہوا کرتے تھے۔ پھر ان کی انسانوں سے دوستی بھی تھی۔

ابو جعفر سے ایک حدیث منقول ہے۔ کہ رسول اللہؐ نے کہا۔ کہ بعثت الی الاحمر والاسود (یعنی میں سرخ وسیاہ سب کی طرف بھیجا گیا ہوں)، عبدالملک نے اسکی شرح یوں کی ہے کہ الاحمر انسانوں کو کہتے ہیں اور الاسود جنوں کو (طبقات ابن سعد ص ۲۷)

معلوم نہیں کہ زرتشتی مذہب کا اثر تھا۔ کہ عرب بھی اہرمن کو خدا کے برابر سمجھتے تھے ۔ یا نصرانی شکل میں یہودیت کا اثر تھا۔ کہ اس دنیا پر شیطان کی بادشاہت تسلیم کی جاتی تھی۔ (ملاحظہ ہو نصرانی دعا۔ کہ" اس زمین پر بھی اے خدا تیری بادشاہت ویسی ہی ہو جیو، جیسی کہ وہ آسمان پر ہے") بہر حال عربوں میں خدا کے مقابلے میں شیطان تھا اور اُن کے دلوں میں شیطان اور شیطان کے رسولوں یا جنوں کی بڑی عظمت تھی۔

جنوں کی عظمت کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے ۔ کہ نہ صرف تورانی (سی دی ان عکادی دراوڑ) قوموں میں شمس اور آگ کو دیوتا مانا جاتا تھا۔ بلکہ ایرین (ایرانی ۔ ہندستانی ۔ ٹیوٹن وغیرہ) میں مہر اور آتش، ردی اور اگنی کی پرستش جاری تھی۔ اور قدیم تقسیم حیات کے ماتحت جنوں کو آتشی مخلوق مانا جاتا تھا۔ شیطان کو بھی اسی لئے سانپ (عربی جانّ) سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ وہ تیزی و چالاکی، نقصان رسانی اور اوپر چڑھنے میں آگ کے شعلے کی طرح ہوتا ہے اور قرآن میں بھی خلقتنی من نار (تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے) شیطان کا قول ہے۔

آگ کو قربانگاہ میں بڑا درجہ حاصل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق عہدِ عتیق میں لکھا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی سوختنی قربانی کرنا چاہتے تھے ۔ وہ کلدیہ کے باشندے تھے اور اس ملک میں اس قسم کی قربانیاں رائج تھیں ۔ بابل کے اس قصے میں جو طوفان نوح کی مانند ہے ۔ یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ طوفان تھمنے کے بعد جب زمین پر آکر سوختنی قربانی کی گئی۔ تو آگ کے شعلوں اور دھوئیں پر ہزاروں دیوتا پروانوں کی طرح نازل ہو گئے اور اس کی خوشبو سے خوش ہو کر دعائیں دینے لگے ۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ دیوتاؤں تک کسی چیز کو پہنچانے کا ذریعہ آگ ہی تھی غالباً آگ کے دھوئیں سے جنّ (سانپ) کا خیال پیدا ہؤا ۔ اور دیوتاؤں کے ایلچی شیطان اور جن قرار پائے۔

ملک یا فرشتہ

قدیم طبیعیات میں چار عنصر مانے جاتے تھے۔ آتش و آب، باد و خاک۔ انسان خاکی۔ جن آتشی مانے جاتے تھے۔ گویا یہ مادی دنیا سے متعلق تھے۔ ان سے ماوراء نوری خلقت کو ملک یا (ایران میں) فرشتہ کہتے تھے۔ جن و ملک دونوں نظروں سے پوشیدہ رہنے کی وجہ سے ایک ہی جنس کے سمجھے جاتے تھے۔

فرشتے اور جن دونوں ایلچی یا قاصد کا کام کرتے ہیں۔ فرشتے یا ملک کے لغوی معنی بھی پیغام لے جانے والے کے ہیں۔ یہ خدائی پیغام پہنچانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ انکی ضد وہ پوشیدہ قاصدوں کی جماعت ہے۔ جو شیطان کے ماتحت کام کرتی ہے اور جنوں کی اولاد ہے اسلام نے بتایا۔ کہ یہ برائی کے وسوسے لوگوں کے دلوں میں ڈالتی ہے اور کہانت، سحر و شاعری کے ذریعے سے انسانوں کو گمراہ کرتی ہے۔ ان میں ہر قسم کے افراد مانے جاتے تھے۔ یعنی بعض اچھے ہوتے تھے اور بعض برُے۔ اسلام نے فرشتوں کو تو خدا کا پیغامبر قرار دیا اور جنوں کو شیطان یا شر محض کا ایلچی بتایا۔

الف۔ شیطانی الہامات

سحر و جادو

مصر، بابل، چین، ہندوستان میں سحر و جادو عام تھا۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ہر ملک و قوم میں اس قسم کے اعتقادات پھیلے ہوئے تھے۔ اور علم کی ترقی نے موجودہ زمانے میں انہیں کم کر دیا ہے۔ فنا نہیں کیا۔

مصر: مصری زبان میں مذہب کے لئے کوئی لفظ نہ تھا۔ لیکن چونکہ جادو کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے تھا۔ اسلئے اسے حائک (HIKE) کہتے تھے۔ دوا کے ساتھ دعا ضروری

سمجھی جاتی تھی۔ اور اب بھی جاہل قوموں میں پھونک جھاڑ جاری ہے۔ مصر میں مصیبت اور بیماری لانے والی قوتوں کو خوش کرنے کے لئے ان سے دعا کی جاتی تھی۔ اور جادو سے بہت کچھ کام نکلتا تھا۔ مثلاً بچوں اور ماؤں کی حفاظت، دشمن کو نقصان پہنچانا۔ درد دندہ کو کم کرنا۔ درد سر، زہریلے جانوروں کے کاٹے کا علاج۔ عام بیماریوں کا علاج۔ دریائے نیل کے خطروں سے بچاؤ۔ سحر کے ذریعے سے ہوتا تھا۔

مصر کے پجاریوں کے لئے جادو سیکھنا ضروری تھا۔ عوام بھی جادو جانے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ بقائے روح کے قائل تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ مردوں کی روحیں جادو کے زور سے رات کے بارہ برجوں میں سورج کے ساتھ ساتھ گزرتی ہیں، اور پھر سورج میں چلی جاتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ دن رات رہتی ہیں۔ البتہ جو روح جادو نہیں جانتی وہ کسی ایک برج میں تاریکی میں پڑی رہ جاتی ہے۔ اس سے نکل نہیں سکتی۔

ہندوستان: قدیم ہندوستان میں جادوگروں کی کثرت تھی۔ توہم پرست اب بھی بیماری۔ دشمن، قحط، بھوت، جن اور مفلسی وغیرہ کو جادو منتر سے دور کرنے والوں کے گرویدہ ہیں۔ حتےٰ کہ پڑھے لکھے لوگ بھی تعویذوں، منتروں یا دعاؤں کے زور سے امتحان میں کامیاب ہونا۔ خزانہ دریافت کرنا۔ راستہ جلد طے کرنا وغیرہ چاہتے ہیں۔

سحر بابل

"موجودہ عراق کا قدیم نام کلدیہ ہے۔ اسے بابل بھی کہتے تھے۔ اس کا شمالی حصہ عکاد (بلند زمین) اور جنوبی شمیر کہلاتا تھا۔ مسیح سے چھ سات ہزار سال پہلے یہاں بڑے بڑے شہر تھے۔ میخی خط میں ٹھیروں پر کندہ کئے ہوئے کتب خانے تھے۔ نجوم۔ ریاضی اور متعلقہ علوم کے جاننے والے موجود تھے۔ صناع اور مصور بھی تھے۔ یہ عکادی و شمیری دونوں تورانی (مغل) النسل کے مانے جاتے ہیں (دیکھئے Sayce by Assyriology of Elements p. 12)۔

مسیح سے تین ہزار سال پہلے عکادی قوم کا مذہب ہر شے میں روح یا جان تسلیم کرتا تھا روح (جن بھوت) کی پرستش عام تھی۔ جو مذہب اور جادو یہاں رائج تھا۔ اس میں بھوتوں اور جنوں کے خوش کرنے کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ بابل کی تباہی کے بعد جب اس کے جوتشی، جو قسمت کا حال بتانے میں شہرت پا چکے تھے۔ یورپ میں پھیلے، تو بابلی یا کلدی کے معنی ہی پیشینگو، یا کاہن کے ہو گئے۔" (سائنس ص ۱۴)

مسیح سے دو ہزار سات سو پچاس سال پہلے، سامی قوم کے چرواہے سرغون نے شمیریہ کو فتح کر لیا تھا۔ اور عراق سے بحر روم تک کا شہنشاہ بن بیٹھا تھا۔ اس کے بعد ایلامی اور آموری حکمران ہوئے۔ یہ بھی سامی نسل کے تھے۔ انہوں نے بابل کو جو ایک گاؤں تھا شہر بنا دیا۔ یہ بابل کے بادشاہوں کا پہلا خاندان تھا اور ۲۲۲۵ سے ۱۹۲۵ ق م تک حکومت کرتا رہا۔ شہنشاہ حمورابی (۲۱۲۳ - ۲۰۸۰ ق م) اسی خاندان سے تھا۔ یہ دنیا کا پہلا قانون ساز مانا جاتا ہے اور دنیا کی مشہور (قانون حمورابی) کا جامع ہے (تاریخ بابل۔ کنگ ص ۱۶۰) یہ مجموعۂ قوانین وٹس کمپنی لندن نے The World's Earliest Laws کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع کر دیا ہے۔

قانون حمورابی اور تورات موسوی

سب سے پہلے ۱۹۰۲ء میں پروفیسر شیل (Scheil) نے شائع کیا تھا۔ یہ قانون، موسوی قانون سے اتنا مشابہ تھا کہ فوراً ہی تین نظریات قائم ہو گئے۔

(۱) موسوی قانون، حمورابی قوانین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

(۲) یہ دونوں قوانین، سامی قوم کے کسی قدیم رسم و رواج سے آزادانہ طور پر پیدا ہوئے ہیں۔

(۳) موسوی قانون براہِ راست حمورابی قانون سے لیا گیا ہے۔

آخری نظریے کو آج کل کثرت سے مانا جاتا ہے۔ اسلئے کہ اب شمیری مجموعۂ قوانین بھی مل گیا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حمورابی کا قانون اسی سے پیدا ہوا ہے، اور کسی قدیم رسم و رواج سے نہیں بنا۔ اور شمیری قوم سے اگر یہودیوں کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے تو صرف قانونِ حمورابی کے ذریعے سے ممکن ہے اور دونوں قوانین کا مطالعہ بھی اس کو ثابت کر دیتا ہے۔

بابلی مذہب میں بادشاہ کو سب پجاریوں یا پروہتوں کا سردار مانا جاتا تھا اور ہر مندر میں ایک ایک سردار پجاری ہوتا تھا۔ انسان ہر جگہ بھوتوں اور روحوں سے گھرا ہوا تھا۔ دیوتاؤں کا درجہ ان روحوں سے بلند سمجھا جاتا تھا۔ پجاریوں کا کام وہی تھا جو قدیم زمانے میں ساحر، طبیب یا عقلمند آدمی انجام دیا کرتے تھے۔ ہر گاؤں میں ایک طبیب ساحر ہوا کرتا تھا۔

بابل والے جادو کی دو قسمیں مانتے تھے:

نیرتو (بددعا)، اور کسپو (منتر)۔ اگر کوئی یہ سمجھتا تھا کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے تو وہ گاؤں کے ڈاکٹر (اسو) کے پاس جاتا تھا وہ دوا علاج، پھونک جھاڑ، جرّاحی وغیرہ سب جانتا تھا۔ وہ عموماً جادو کرنے والے پر جادو واپس کر دیتا تھا۔ اس طرح اس جادو کی کاٹ ہو جاتی تھی۔ اگر کسی بے گناہ پر شبہ ہو جائے کہ اس نے جادو کیا ہے۔ تو قانونِ حمورابی کے مطابق وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا تھا۔ اور مقدس پانی میں نہ ڈوبتا تھا۔

یہاں ضمناً اہلِ روما کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ وہ بھی جادو کو برحق مانتے تھے۔

روما:- گو رومی عملی اور ضدی لوگ تھے لیکن ان کی دوازدہ الواح (Twelve Tables) میں

آٹھویں لوح کا آٹھواں قانون یہ ہے: "کوئی شخص اپنے پڑوسی کے کھیت کا غلہ یا پیداوار جادو کے زور سے ایک کھیت سے دوسرے میں منتقل نہ کرے (دیکھئے Woolds Earliest Laws. pp. 68-9)

قانون حمورابی کی پہلی اور دوسری دفعات جادو منتر سے متعلق ہیں۔ اس سے اس قوم میں جادو کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہی حال عرب کی پوری آبادی کا سمجھا جاسکتا ہے دفعات یہ ہیں:۔

(۱) اگر کوئی شخص کسی پر جادو (بددعا) کرے اور اسے اس کا حق نہ ہو۔ تو جادوگر قتل کر دیا جائے گا۔

(۲) اگر کسی نے کسی پر منتر کیا اور اسے اس کا حق نہیں تھا۔ تو جس شخص پر منتر کیا گیا ہے وہ مقدس دریا پر جائے گا۔ اور دریا میں غوطہ لگائے گا۔ اگر وہ مقدس دریا اسے پکڑ لے تو جادوگر کو فریادی (مدعی) کا گھر بار دے دیا جائے گا۔ لیکن اگر مقدس دریا اُسے سچا ثابت کرے اور اُسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ تو جادوگر قتل کر دیا جائے گا۔ اور مدعی کو جادوگر کا گھر بار مل جائے گا۔" (قوانین حمورابی۔ ص ۱۶)

تورات موسوی میں کتاب معاہدہ (The Book of Covenant) بالکل قانون حمورابی سے مشابہ ہے۔ اس میں جادوگر کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن جادوگرنی کا ذکر اس طرح ہے:

"تو جادوگرنی کو جینے مت دے۔" (کتاب خروج۔ ۲۲: ۸)

صرف اس جملے نے یہودی اور عیسائی دنیا میں وہ تہلکہ مچایا کہ دنیا میں کوئی نادر شی "بزن" بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہزارہا بوڑھی عورتوں کو جادوگر مان کر ایذاؤں کے ساتھ

قتل کیا گیا۔ حتےٰ کہ قانوناً یہ بات رد کی گئی۔

کتاب استثنا میں جادوگر کا ذکر ہے۔ لیکن اس میں صرف جادو کی ممانعت ہے قتل کا حکم نہیں ہے۔ اس کتاب کی اٹھارہویں فصل کے فقرے یہ ہیں:

(۱۰) تم میں کوئی نہ پایا جائے۔ جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں گزر کروائے۔ یا فال کھولے یا وقت کی حالت کو (نجوم) سے دیکھے۔ یا جادوگر یا جادوگرنی (ڈائن) بنے (۱۱) نہ منتر پڑھنے والا، نہ دیووں سے سوال کرنے والا۔ نہ جادوگر نہ رمال بنے (۱۲) کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں۔ خداوند کی نفرت کے باعث ہیں۔ اور ایسی کراہتوں کے سبب سے خداوند، تیرا خدا، ان کو تیرے آگے سے دور کرتا ہے۔"

باوجود اس ممانعت کے جادوگروں کا پیشہ علانیہ جاری رہا۔ یرمیاہ کی کتاب میں اسکا ذکر یوں ہے

"لہذا نہ تو اپنے پیشنگویوں (نبیوں) کی باتیں سن۔ نہ اپنے فال دیکھنے والوں کی۔ نہ خواب کی تعبیر دینے والوں کی۔ نہ اپنے ساحروں کی۔ نہ جادوگروں کی۔ وہ تم سے کہتے ہیں کہ بابل کے بادشاہ (بخت نصر) کی اطاعت نہ کرو۔" (یرمیاہ -۲۷: ۹)

غالباً یسعیاہ نبی کی کتاب "کتاب الاستثنار" سے پہلے کی ہے۔ اس میں ساحروں کو معزز پیشہ ور مانا ہے۔ اور کہا ہے کہ گناہ گاروں کو یہ سخت سزا دی جائے گی۔ کہ انہیں ان ساحروں وغیرہ کی خدمات سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس کتاب کی تیسری فصل کا تیسرا جملہ یہ ہے

"پچاس پچاس کے جمعداروں، اور عزت داروں کو، اور صلاح کاروں کو۔ اور انہیں جو سحر میں ماہر اور جادو میں مشاق ہیں (یروشلم اور یہوداہ سے خدا چھین لے گا۔"

کاہن، ساحر، شاعر وغیرہ

ساحر طبیبوں کے علاوہ زمانۂ قدیم میں ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جو آیندہ حالات بتانے کی دعوے دار تھی۔ مختلف ملکوں میں ان کے مختلف نام تھے۔ جو لوگ بابل میں ساحر و نجومی کہلاتے تھے۔ وہی عرب میں کاہن اور یہودیوں میں نبیوں کے نام سے مشہور تھے۔ یونان میں مقام دلفی پر ایک مشہور کہانت گاہ تھی اور ہندوستان میں جوتشی اور رسائیبرپا میں پیشینگو ساحروں کی کثرت تھی۔

یہ لوگ غیب کا حال بتایا کرتے تھے اور اکثر ایسے ذومعنی الفاظ استعمال کرتے تھے۔ کہ ان کا مطلب نکالنا مشکل ہوتا تھا۔ مثلاً کسی جوتشی سے ایک شخص نے پوچھا کہ میرے لڑکا ہوگا کہ لڑکی؟ اس نے جواب دیا۔ "لڑکا نہ لڑکی"۔ اگر لڑکا پیدا ہوا تو جوتشی نے کہا کہ میں نے تو کہہ ہی دیا تھا۔ "لڑکا۔ نہ لڑکی"۔ اگر لڑکی ہو تو وہ کہتا ہے۔ کہ میں نے کہا تھا کہ لڑکا نہ۔ لڑکی"۔ اور اگر کچھ نہ ہوا تو بھی مطلب صاف ہے۔ "لڑکا نہ لڑکی"۔

اسی طرح یہ غیب کا حال بتانے والے۔ لوگوں کو دھوکے میں ڈالے ہوئے تھے اور عملی زندگی سے دُور رہنے اور دُور رکھنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں کیا کرتے تھے۔ کہ سادہ لوح انسان دھوکے میں پڑ جائیں۔ سائینس کی ترقی نے ان کاہنوں کا خاتمہ کر دیا۔

علمِ غیب کی تلاش کیوں ہوتی ہے؟

دورِ جاہلیہ میں غریب انسان کے لئے منظم پروہتوں۔ برہمنوں، ساحروں اور کاہنوں سے بچنا مشکل تھا۔ ان لوگوں نے اپنے فریب اور جھوٹ کو اتنی دفعہ دہرایا تھا۔ کہ عوام نہیں

سچ سمجھنے لگی تھیں۔ ان کا ذاتی تجربہ ہو گیا تھا۔ کہ اکثر بچے پھونک جھاڑ سے اچھے ہو جاتے ہیں لیکن یہ عورتیں کاہنوں اور ساحروں کی بیبیاں ہوتیں تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ خود اپنے بچوں کی پھونک جھاڑ نہیں کرتا۔ نہ کسی غیبی آواز سے مدد لے کر خزانہ معلوم کر سکتا ہے اور نہ دشمن کو شکست دے سکتا ہے۔

پھر بادشاہ اور راجا ان کے دھوکے میں پڑے ہوئے تھے۔ یہی لوگ علم و ہنر کے اجارہ دار ہو گئے تھے اور راجاؤں کے بھی معلم ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہر قانون میں سحر و کہانت و پیشینگو کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ان میں اچھے بُرے سب قسم کے ساحر و کاہن ہیں جو دوسروں کو ایذا بھی پہنچا سکتے ہیں اور ان کی کھیتوں کے لئے پانی اور بیماریوں کے لئے تعویذ بھی مہیا کر سکتے ہیں۔ گویا اب وہ کام جو کاہن کرتے تھے یعنی تبلیغ و اشاعت۔ اسے قانون ساز اور بادشاہ نے کرنا شروع کر دیا۔ اور ہر عورت کا بچہ جوان ہو کر مختلف قسم کے دیوی دیوتاؤں کا غلام بن گیا۔ سیتلا پرشاد، کالی چرن، عبدالعزیٰ، زیدمنات، غلام امام اور بندہ علی اس جذبۂ پرستش کی یادگاریں ہیں۔

لوگ چاہتے ہیں۔ کہ اَن دیکھی قوتوں کی مدد سے اپنے مقاصد حاصل کر لیں۔ اور ایسی بے عملی کی زندگی بسر کریں جس میں انہیں خود کچھ نہ کرنا پڑے۔ سب کام تعویذ، منتر یا نذر بھینٹ سے چل جائے۔ انسانی کمزوری اور کاہلی کی اعانت کے لئے فوراً ایک چالاک جماعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ان قوتوں کی عادتوں اور ان کے خوش کرنے کے طریقوں کو جاننے کا اعلان کرتی ہے۔ عورتیں، راجا، قانون اور جہالت کے ذریعے سے ان کا پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ اور کاہن یا جوتشی کا گھر مٹھائی کی دوکان۔ اور شاہی بنک کا نمونہ بن جاتا ہے ؂

شاعر

قدیم دنیا کے ادب کا اکثر حصہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا۔ صرف کاہن اور ساحر کبھی کبھی نثر کا استعمال کرتے تھے اور بعض کہانیاں بھی نثر میں تھیں۔ لیکن کاغذ کے نہ ہونے کی وجہ سے نثر کا درجہ نہایت پست تھا۔ حافظے کو مدد دینے کے لئے اگر کسی چیز کو زندہ رکھنا منظور ہوتا تھا۔ تو مقفی اور مسجع عبارت میں اور زیادہ تر نظم میں کہا جاتا تھا۔

لیکن جس دنیا میں ہر طرف بھوتوں اور روحوں نے انسان ہی کو نہیں ہر شجر و حجر کو گھیر رکھا ہو۔ وہاں مشکل تھا کہ شاعر کی شاعری یا ساحر کی ساحری میں بغیر جن بھوت کی مدد کے زور پیدا ہو۔ اسلئے تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اگر پرانی دنیا کا ادیب و شاعر یہ کہتا تھا۔ کہ میری شاعری ایک بڑے بھوت کے دماغ کی احسانمند ہے۔ یہ خیال آریوں اور سامیوں دونوں میں تھا۔

آریہ قوموں کے شاعر

یونان: مسیح سے چھ سو سال پہلے یونان میں فلسفے کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں اور اس سے پہلے بھوتوں نے یونانی شاعروں کے دماغوں پر تسلط کر لیا تھا۔ اور ہومر اور ہیسی اڈ کی نظموں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ کہ یونان قدیم میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ راگنی کی دیویاں، یعنی میوزیں (Muses) جس سے عربی لفظ موسیقی بنا ہے۔ شاعروں کو اپنے الہامات سے شاعر بنا دیتی تھیں۔ میوزوں کی تعداد نو تھی۔ اور وہ زی اُس (Zeus) اور دیوی موزین (قوت حافظہ) کی بیٹیاں تھیں۔ کوہ اپالو پر خدائی سبھا جمتی تھی۔ اپالو بربط بجاتا تھا اور میوزوں کا گانا دیوتاؤں کو مسحور و مبہوت رکھتا تھا۔ ان میوزوں کی خدائی عقل میں ماضی، حال و مستقبل کی سب باتیں محفوظ تھیں۔ پھر شاعر کیوں نہ ایسی باتیں کہتا۔ جو انسانی عقل کے سرچشمے سے نکل کر دنیا کو

مسحور کر لیں۔ شاعر ہی نہیں۔ بادشاہ بھی اپنے قوانین ان ہی دیویوں سے حاصل کرتا تھا"۔

(دیکھیے ہیسٹنگز ج ۱۱۔ ص ۴)

"یونانی شاعر اپنے آپ کو، اور دوسرے گرویوں اور شاعروں کو ہمیشہ الہامی مانتے تھے (ہومر۔ اوڈیسی ۴) یہ وہ زمانہ تھا جب شاعر اور نبی میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کا طبیب، جیسا کہ خود اپالو تھا۔ بیک وقت نبی، شاعر، طبیب، کاہن و ساحر مانا جاتا تھا۔ لیکن مختلف علوم و فنون کی تدریجی علیحدگی نے طبیب کی ان صفات کو اس سے چھین لیا"۔ (ہیلی ڈے۔ ص ۵۷ تا ۵۸)

اسی طرح افلاطون نے سقراط کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ شاعر اپنی نظمیں کسی مہارت یا عقل کی وجہ سے نہیں کہتے۔ بلکہ انہیں قدرتی الہام ہوتا ہے۔ جو اسی طرح کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کاہنوں یا نبیوں کو ہوتا ہے (Apol. 22c, Men. 99, Ion 533e) اس طرح الہام سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ انسان بہت سی باتیں ایسی کرتا ہے۔ جس کا سرچشمہ کوئی دوسری دنیا ہے۔ اسی لئے پنڈارو کا یہ قول ہے۔ کہ انسان روحانی خصوصیات کو ہمیشہ تجربہ سے حاصل کی ہوئی خصوصیتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اور وہ ہر عقل کی بات کو الہامی مانتا ہے۔ جتنے کاہن یا نبی ہوتے ہیں ان کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ وہ خدا یا دیوتا کا قول نقل کر دیتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کہتے ہیں۔ جو خود نہیں سمجھتے۔ اس لئے افلاطون نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ مدبرین ملک یا ماہرین سیاست اگرچہ اکثر اپنی حکمت عملی اور تقریروں میں ناکام رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنے اقوال کے حقیقی معنوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اسلئے ضرور ان کی ہدایت خدائی الہام سے ہوتی ہے (مینو ۹۹۔ سی ڈی) اسی طرح فلسفی بھی ہیں۔ جن کی عقل کی باتوں کو عوام خرافات سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ پورے جوش و خروش سے کہی جاتی ہیں۔ اور انکا سرچشمہ بھی خدا ہی ہے" (فونڈرس ڈی ایل ج۔ ای۔ ۲۴۹ ۱۰-۱۲۹)

ایرانی شاعر ایران کہن کے شعرا بھی ایک فرشتے کی مدد سے کلام کہتے تھے۔ جس کا نام سروش تھا۔ اس پیغام لانے والے فرشتے کا نام عربی میں جبرئیلؑ ہے۔ حکمائے تازی اسے عقلِ فعال کہتے ہیں۔ اور دانایانِ فارس نے اس کا نام خردِ کارگر رکھا ہے۔

سروش کے لغوی معنی اچھی روح کے ہیں۔ اس کا ایک اخلاقی مشیر راتو ہے۔ یہ دونوں مل کر نیک لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور انہیں ہر شے کے قانون (یعنی اشا) پر عمل کرنا بتاتے ہیں۔ جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انہیں چشترویر ما (رحمتوں کا ملک) یا بہترین قیام گاہ (بہ آشت) اور جزائے خیر اور کامل مسرت حاصل ہوتی ہے۔

نظامی کہتا ہے:-

نہاں پیکر آن ہاتفِ سبز پوش
کہ خواند سرائندہ آزا سروش

حافظ نے کہا ہے ؎

عفوِ الٰہی بکند کارِ خویش
مژدۂ رحمت برساند سروش

دانشمندانِ ایران کا قول ہے۔ کہ ایزد نے بہت سے سروش پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے تیس سروش ایسے ہیں۔ جن میں مہینوں کے ہر روز کا ایک موکل ہوتا ہے۔ فردوسی کہتا ہے،

ہمیشہ سروشت بروز سروش
نگہبان وافزوں ترت رائے وہوش

سروش کے معنی آوازِ خوش اور نغمے کے بھی مانے جاتے ہیں۔ مثلاً ناصر خسرو نے کہا ہے:

خوش بخندی بر سروش مطرب و آوائے رود
ور توانی دامنش پر لولوے مکنوں کنی

جس طرح لاطینی زبان میں میوز (muse) سے میوزک' اور اس سے عربی میں موسیقی بن گیا ہے۔ غالباً اُسی طرح شاعروں اور مغنیوں نے سروش سے سرودن و سرائیش بنالیا ہے۔

عربی میں سروش ہی کے مانند ندائے غیبی کو ہاتف غیب کہتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ۔

وحی و جبرئیل از برائے انبیاست
ہاتف و الہام بھر اولیاست

سروشوں کے سردار کو فارسی میں سروش بُد کہتے ہیں۔ عربی میں اسی کا نام عقلِ اوّل ہے۔

شاعروں ہی کو نہیں۔ بلکہ خود پیغمبر ایران زرادشت (زرتشت) (۶۶۰ - ۵۸۳ ق م) کو ہرمز اور اہرمن کی روحیں عالم خواب میں نظر آئی تھیں۔ ان دونوں میں سے عقلمند اچھی روح کو پسند کرتا ہے اور بے وقوف ایسا نہیں کرتا۔

انسان بہمن کے پراسفاؤں (فرشتوں) کی مدد سے اہرمن کے دیوؤں کی مخالفت کر سکتا ہے۔ اور زندہ جانوروں کی قربانی اور شراب سے دُور ہو کر قانون قدرت (اشا) کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے (ایضاً ۳۰)

عربی شاعر

زمانۂ جاہلیہ کے عرب قبائل میں سے کسی میں شاعر کا پیدا ہونا بڑے فخر و مباہات کی بات تھی۔ شاعر اپنے قبیلے کی بڑائی کے گیت گاتا تھا۔ وہ قصاص پر ابھارتا تھا وہ مفاخرت کے مقابلوں میں سخاوت و شجاعت، مروّت و محبت کی مثالیں پیش کرتا تھا۔ اور گویا

اپنی قوم کا حقیقی نمائندہ ہوتا تھا۔ لیکن شاعری قدرت کی ودیعت ہوتی ہے، کوئی شخص اپنی محنت و کوشش سے شاعر نہیں بن سکتا۔ اسی لئے یہ خیال عام تھا۔ کہ شاعر کی مدد پر جنوں، شیطانوں، عفریتوں اور بھوتوں کا ایک غول ہے۔ اور جتنا بہتر شاعر ہوتا تھا۔ اتنا ہی اس کا مددگار جن بھی قوی اور قابل سمجھا جاتا تھا۔ اسے رئی یا تابع من الجن کہتے تھے اور یہی رئی انہیں لمبے لمبے قصیدے تصنیف کر کے یاد کرا دیتے تھے۔ یا پڑھتے وقت کان میں کہتے جاتے تھے۔

شعر کے لغوی معنی دریافتن و دانستن ہے۔ اصطلاحاً اس لفظ کے معنی کلام موزون و مقفے یا صرف کلام موزون ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ باریک چیزوں کی معرفت کو شعر کہتے ہیں۔ بہرحال مشہور یہ ہے کہ عرب کا پہلا شاعر یعرب بن قحطان تھا۔ بعد میں جو شعراء ہوئے ان میں یہ خیال عام تھا۔ کہ کوئی رئیؔ (بروزن غنی) یعنی پری یا جن شاعر کا تابع ہو جاتا ہے اور وہ سروش یا میوز کی طرح شاعر کو فصیح و بلیغ قصیدے تصنیف کر کے دیتا رہتا ہے۔

لسان العرب کی انیسویں جلد کے دسویں صفحے پر رئی کے متعلق یہ لکھا ہے:

رَئی یا رِئی جن ہوتا ہے۔ جسے انسان دیکھتا ہے۔ لحیانی کا قول ہے کہ اس کا رِئی جنوں کی قوم سے ہے۔ اور رئی وہ ہوتا ہے جو کسی شخص سے محبت یا الفت رکھتا ہے۔ اللیث کا قول ہے۔ کہ رئی جن ہوتا ہے اور کسی شخص سے تعلق رکھتا ہے اور اسے کہانت و طب سکھاتا ہے۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے۔ کہ انہوں نے سواد بن قارب سے کہا۔ کہ تو ہی وہ شخص ہے جس کے پاس ظہور نبویؐ کے وقت تیرا رئی آیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ 'ہاں' (تفصیل کے لئے دیکھئے ابن ہشام ج ۱۔ ص ۱۳۴)

اسی طرح صاحب رائے آدمی کو بھی رئی کہتے ہیں ۔ خدری کا قول ہے ۔ رئی بڑے سانپ یا اژدہے کو کہتے ہیں ۔ اس لئے کہ ان کا گمان ہے ۔ کہ جن سے سانپ ہو جاتا ہے اسی لئے اسے شیطان، حباب اور جان بھی کہتے ہیں ۔"

جمهرة العرب (ج ا ۔ ص ۱۷۶ ۔ حیدر آباد) باب رأوی میں لکھا ہے ۔ الرّؤیہ کے معنی ہیں اجلته فی صدرك من الرائی (یعنی

اور الرّویّ بیت کے آخری حرف میں عقد قوانی کو کہتے ہیں ۔ اسی سلسلے میں ابوعبیدہ اور اصمعی کا وہ بیان ہے جو حسانؓ بن ثابت کے رئی کے متعلق ہے ۔ وہ یہ ہے ۔

" میں حسانؓ بن ثابت کے سعلاة (یعنی جن) سے مدینے کی ایک گلی میں ملا ۔ حسانؓ اس وقت بچے ہی تھے اور شعر نہیں کہتے تھے ۔ وہ سعلات، حسانؓ کے سینے پر چڑھ بیٹھی اور بولی : " کیا تو ہی ہے جسے تیری قوم چاہتی ہے کہ تو اُن کا شاعر ہو جائے ؟ " حسانؓ نے کہا " ہاں " ۔ تو وہ بولی ۔ کہ " مجھے ایک ہی روی (قافیے) کے تین شعر سنا ۔ ورنہ تجھے مار ڈالوں گی ۔" تو اسنے یہ شعر پڑھے :۔

اذا ما ترعرع فینا الغلام	فما ان یقال لہ من ھو ہ
اذا لم یسُد قبل شد الازار	فذلك فینا الذی لا ھو ہ
ولی صاحب من بنی الشیصبان	فحیناً اقول وحیناً ھو ہ

تو اس نے اسے چھوڑ دیا ۔ اور کہا 'بہت خوب' ۔

(اولی لك) بنو الشیصبان جنوں کی ایک قوم کا نام ہے ۔"

بڑے شاعروں کا خیال تھا ۔ کہ ان کا جن یا رئی بھی بڑا عالی دماغ ہوتا ہے ۔ شاعر موسیٰ بن جابر تعلّی کے طور پر کہتا ہے وما نفرت جنّی، وما فلّ مبْردی (نہ میرا جن بھڑکا ۔

اور میرا سوہان کند ہوا)۔

لبیدؓ عرب جاہلیہ کا مشہور شاعر تھا۔ اور شعر کی آمد و ذریعۂ حصول سے خوب واقف تھا غالباً وہ جن کی حقیقت کو اس وقت سمجھا۔ جب کہ اس نے قرآن کا یہ دعوےٰ سنا کہ "لئن اجتمعت الجن والانس ان یاتوا بمثل ھذا القرآن۔ یعنی اے قریش کے شاعرو اور ساحرو! حالانکہ تمہارا دعوےٰ ہے کہ جن تمہاری مدد کرتے ہیں۔ اور شعر اور سحر کہہ دیتے ہیں لیکن وہ اور تم متفق ہو کر بھی قرآن کا سا کلام کہنا چاہو تو نہ کہہ سکو گے۔" لبیدؓ نے قرآن سنا اور ان لوگوں کی فوراً تردید کی۔ جو یہ کہتے تھے۔ کہ قرآن سحر یا قول بشر ہے۔ (جو جنوں کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے) ان ھذا الا سحرٌ یوثر ان ھذا الا قول البشر۔

اس نے کہا کہ شاعروں اور ان کے جنوں میں یہ قدرت ہی نہیں کہ ایسا کلام کہہ سکیں۔ جس میں نہ قافیہ ہے نہ وزن۔ جو نہ سحر ہے نہ کہانت۔ بلکہ ایسا کلام ہے جو جنوں اور انسانوں سے بلند تر ہستی ہی کی طرف سے ہو سکتا ہے۔" اور فوراً مسلمان ہو گیا۔

اسی بنا پر عتبہ بن ربیعہ، سردار قریش اور ماہر ادبیات عرب نے کلامِ رسول اللہ کو کلامِ شعراء سے ممیز کیا تھا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ اس نوعیت کا کلام عربی شاعری یا سحر و کہانت میں موجود نہ تھا۔ اسی لئے قرآن کا یہ دعوےٰ تھا۔ کہ کلام عرب میں (جسے اہل عرب جنوں کا کلام سمجھتے تھے) قرآن کی مانند کلام موجود نہیں ہے۔ جو بخلاف ان کی شاعری اور کہانت کے درستیٔ اخلاق اور تعمیر ملت و انسانیت کا سبق دیتا تھا۔ اور اسی لئے وہ جنوں کا لایا ہوا کلام نہ تھا۔ بلکہ ملکوتی رسالت کے ذریعے سے اللہ کے پاس سے آیا تھا۔

عرب شاعروں کے جنوں کے متعلق ایک دلچسپ قصہ: کتاب الاغانی میں ابوالفرج الاصفہانی نے

لکھا ہے۔ کہ جریر بن عبداللہ البجلی، رسولؐ اللہ کے صحابی تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ میں جاہلیہ میں حالتِ سفر میں تھا۔ ایک روز اپنے اونٹ کو پانی پلانے گیا۔ جب پانی کے قریب پہنچا۔ تو میں نے دیکھا کہ کچھ بدصورت افراد وہاں جمع ہیں۔ اتنے میں ایک بگروہ شخص وہاں آیا۔ پھر انہوں نے اس کا نام لے کے پکارا۔ اور کہا کہ کچھ اپنے شعر مجھے سنائیے۔ اس لئے۔ کہ میں ان کا مہمان تھا۔ اس نے پورا قصیدہ سے ودع هريرة ان الركب مرتحل سنایا۔ میں نے پوچھا۔ "اس کا مصنّف کون ہے؟"۔ اس نے کہا۔ "میں خود ہوں"۔ میں نے کہا "اگر تم نے یہ نہ کہا ہوتا کہ میں اس کا مصنف ہوں تو میں تم کو خبر دیتا کہ اعشیٰ قیس بن ثعلبہ نے گزشتہ سال اسے مجھے نجران میں سنایا تھا۔ اس نے کہا تم سچ کہتے ہو۔ اسلئے کہ میں نے ہی اس کی زبان پر یہ اشعار جاری کئے تھے۔ میرا نام مسحل (جن) ہے۔

(الوسی۔ بلوغ الارب ج ۲۔ ص ۳۶۷)

عربی کاہن غیب کی باتیں بتانے میں کاہنوں کو خاص ملکہ تھا۔ یہ گویا عرب کے جوتشی یا بنی تھے۔ ان میں سے سوادؓ بن قاربؓ زمانہ جاہلیہ میں کاہن تھے، اوپر اجمالاً ان کا ذکر آیا ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے مزاحاً ان سے ان کی کہانت کا ذکر کیا تو وہ ذرا خفا ہو کر بولے کہ "میں اور تم دونوں ان بلاؤں میں گرفتار تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مُردے کھاتے تھے۔ کیا تم اب ایسی چیز کا طعنہ دیتے ہو۔ جس سے میں نے توبہ کر لی ہے؟"

حضرت عمرؓ نے کہا اللہ معاف کرے۔ پھر کہا کہ سواد کا رئی تین رات تک متواتر ان کے پاس آیا اور وہ سونے اور جاگنے کے بین بین تھے۔ (یعنی اُونگھ رہے تھے۔ اور اسنے کہا:۔

یا سواد ! اسمع مقالتی واعقل ان کنت تعقل۔	اے سواد میری بات سُن اور سمجھ، اگر تو سمجھ سکتا ہے۔
قد بعث رسول اللہ من لوئی بن غالب، یدعو الی اللہ و عبادتہ۔	ایک اللہ کا رسول پیدا ہُوا ہے۔ لوئی بن غالب کی اولاد میں سے۔ اور وہ اللہ اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔

اور تین رات تک تین تین شعر پڑھے۔ جن کے معنی ایک ہی ہیں۔ لیکن قوافی جداگانہ ہیں۔

(۱) عجبت للجن وتطلابہا　　وشدھا العیس باقتابہا
تھوی الی مکۃ تبغی الھدی　　ما صادق الجن ککذابہا
فارحل الی الصفوۃ من ھاشم　　لیس قدا ماھا کاذنابہا
(۲) عجبت للجن وابلاسہا　　وشدھا العیس باحلاسہا
تھوی الی مکۃ تبغی الھدی　　ما طاھر الجن کارجاسہا
فارحل الی الصفوۃ من ھاشم　　لیس ذنابی الطیر من راسہا
(۳) عجبت للجن وتنفارھا　　وشدۃ العیس باکوارھا
تھوی الی مکۃ تبغی الھدی　　ما مومن الجن ککفارھا
فارحل الی الصفوۃ من ھاشم　　لیس قداماھا کادبارھا

اور یہ اپنے قبیلۂ دوس سے مکے آئے اور قصیدہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔

ابو جعفر عقیلی کا قول ہے۔ کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہؐ کے سامنے کہانت کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ میری قوم سب سے پہلی قوم تھی۔ جنہوں نے حراست السماء اور زجر شیاطین، اور ستارہ ٹوٹتے وقت ان کی آسمان سے خبروں کی چوری نہ کر سکنے کا حال جانا۔ واقعہ یہ ہُوا۔ کہ ہم

اپنے کاہن کے پاس جس کا نام (خطر بن مالک) تھا موجود تھے۔ ہم نے اس سے کہا اے خطر یہ ستارے آج کل کیوں زیادہ تعداد میں ٹوٹ رہے ہیں۔ ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے تو اسنے کہا۔

عودوا الی السحر، اخبرکم الخبر	سحر کو آؤ۔ خبر بتاؤں گا۔ اچھی ہو
الخیر أم ضرر، ولأمن أم حذر	یا ضرر ہو۔ امن ہے یا حذر ہے۔

دوسرے دن صبح کو گئے۔ تو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا آسمان کو گھور رہا ہے۔ اس نے اشارے سے ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا۔ تاآنکہ ایک بڑا ستارہ ٹوٹا اور کاہن چلا اٹھا:۔

اصابه اصابه	خامره عقابه
عاجله عذابه	احرقه شهابه
زائله جوابه	یاویله ماحاله
بلبله بلباله	عاوده حباله
تقطعت حباله	وغیرت احواله

پھر دیر تک خاموش رہا۔ اور یہ شعر پڑھے:۔

یامعشر العرب بنی قحطان	اخبرکم بالحق والبیان
قد منع السمع عتاة الجان	بثاقب یکف ذی سلطان
من أجل مبعوث عظیم الشان	یبعث بالتنزیل والقرآن (وغیرہ)

پھر ایک مقفّٰے عبارت میں بنو ہاشم کا پتہ بتایا اور کہا کہ:۔

هذا هو البیان

اخبرنی به رئیس الجان

ان ہی کاہنوں میں سے ایک سطیح تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں نہ تھے۔ اور اس کا منہ سینے میں دھنسا ہوا تھا۔ نہ سر تھا نہ گردن تھی۔ وہ بیٹھنے پر قادر نہ تھا۔ البتہ جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ پھول جاتا تھا اور بیٹھ جاتا تھا۔

اسی طرح ایک کاہن شق تھا۔ جس کا ایک ہاتھ پاؤں اور ایک آنکھ ندارد تھے۔ وہب رضی بن منبہ سے روایت ہے۔ کہ سطیح سے پوچھا گیا۔ کہ تجھے یہ علم کہاں سے حاصل ہوتا ہے۔ تو اس نے کہا۔ میرا ایک دوست جن ہے۔ جو آسمانی خبریں طور سینا سے لاتا ہے جہاں سے موسےؑ نے اللہ سے کلام کیا تھا۔

شق اور سطیح اس دن کاہن ہوئے تھے جس دن کاہنہ ظریفہ مری ہے۔ یہ عمرو بن عامر حمیری کی جورو تھی اور سطیح کو اپنا خلیفہ بنا گئی تھی۔ شق سے بھی ملی تھی اور اس کے منہ میں بھی پھونک مار کر سطیح کی طرح بنا گئی تھی۔

طبری نے لکھا ہے کہ سطیح، عبدالمسیح غسانی کا ماموں تھا۔ اسی لئے کسریٰ نوشیروان نے اسے سطیح کے پاس بھیجا تھا۔ کہ موبد موبدان نے آتشکدے کے گل ہو جانے پر خواب دیکھا ہے کہ اونٹ اور عربی گھوڑوں نے دجلہ کو پار کر کے ملک کو خراب کر دیا ہے۔ سطیح سکرات کی حالت میں تھا لیکن عبدالمسیح نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں اسے غطریف یمن بنایا۔ یہ سن کر اس نے آنکھ کھول دی اور کہا۔

عبدالمسیح، علی جمل مشیح جاء الی سطیح، حین اوفی علی الضریح بعثک ملک بنی ساسان لارتجاس الایوان وخمود النیران۔ ورؤیا الموبذان رأی ابلاً صعابًا۔ تقود خیلاً عرابًا۔ قد قطعت دجلة۔ وانتشرت فی بلادها۔

یا عبد المسیح اذا کثرت التلاوۃ — وظہر صاحب الہراوۃ
وخمدت نار فارس — وغارت بحیرۃ ساوہ
وفاض وادی سماوہ — فلیست الشام لسطیح شامًا
ولا بابل للفرس مقامًا — یملک منہم ملوک وملکات
علی عدد الشرفات — وکلّ ما ھو آت آت

(ملخصًا از الف با (ص ۳۳-۳۶) مصنفہ یوسف بن محمد البلوی)

تابع من الجن علی بن حسین سے روایت ہے۔ کہ بنی النجار میں ایک عورت فاطمہ بنت النعمان رہتی تھی۔ اس کا ایک جن تابع تھا اور اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ جب رسول اللہ نے ہجرت کی تو آیا اور دیوار پر بیٹھ گیا۔ عورت نے پوچھا۔ اب پہلے کی طرح تو کیوں اکثر نہیں آیا کرتا۔ اس نے جواب دیا کہ ایک نبی مبعوث ہوا ہے جس نے زنا اور شراب کو حرام کر دیا ہے۔

الزہری سے روایت ہے کہ بنی اسد میں ایک عورت تھی۔ اس کا ایک جن تابع تھا۔ ایک روز اس کے پاس چلاتا ہوا آیا۔ اور کہا جاءَ امرٌ لا یطلق۔ احمد حرّم الزّنا۔

اور پھر لکھا ہے۔ کہ اسلام سے پہلے وحی کو جن سُن لیتے تھے۔ اسلام کے بعد استماع منع ہو گیا (طبقات ابن سعد ج ا۔ ص ۱۱۰)

سواع کا بولنا بنی ھذیل کا ایک بُت سواع نامی تھا۔ وہ لوگ اس پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہاں ایک موٹی گائے بت پر ذبح کی گئی۔ تو سواع کے اندر سے عجیب آواز آئی:۔

العجب العجب کل العجب — خروج نبیّ بین الاخاشب

یحرّم الزنا و یحرّم الذبح للاصنام ٭ وحُرست السماء و رمنا بالشہب

جب لوگوں نے یہ سنا۔ تو مکہ آکر ابوبکر صدیقؓ سے یہ معلوم ہُوا۔ کہ احمدؐ اللہ کی طرف بلاتے ہیں"۔

(طبقات ابن سعد)

خواب کی تعبیر بتانے والے اور ملکوں کی طرح عرب میں بھی خواب کی تعبیر کرنے والے لوگ ہوتے تھے۔ خواب کو ایک پیغامِ الٰہی سمجھا جاتا تھا (دیکھئے ہومر۔ اوڈیسی ۴ ۔ ۷۹۶) وحشیوں کے علاوہ یونانیوں کا بھی یہی خیال معلوم ہوتا ہے۔ کہ سونے کی حالت میں انسان کی روح جسم سے نکل کر باہر کی سیر کرتی رہتی ہے۔ (دسرو رو۔ دوی نی۔ ا۔ ۳۰) توراۃ میں بھی آئندہ کا علم خواب کے ذریعے سے ہونا بتایا گیا ہے حضرت یوسفؑ فرعون کے خانساماں کے خواب کی تعبیر زندان میں کرتے ہیں (تکوین۔ ۴۰ قرآن۔ یوسف) اور خود فرعون کے خواب کی تعبیر انہوں نے کی تھی۔ اس کے علاوہ انکے والد حضرت یعقوبؑ نے بھی خواب دیکھا۔ اور اس کی تعبیر بتائی گئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے خواب کی تعبیر کی تھی (سورہ ۳۷/۱۰۲) اور اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی تھی۔

محدثین کی رائے میں اس قسم کے سچے خواب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور نبوت کی ابتدائی صورت میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ خواب یا رؤیا وحی و الہام کی ایک شکل ہے۔

یہ تعبیر بتانے والے ایک قسم کے معلم یا کاہن تھے۔ جو براہِ راست غیب کی باتیں نہ بتاتے تھے۔ بلکہ ان باتوں کو جو خواب میں عوام پر ظاہر ہوتی تھیں۔ ان کا مفہوم اور مقصد نمایاں کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔

عرّاف عکاظ حلیمہؓ سعدیہ دیہات میں رہتی تھیں اور محمدؐ عربی کو دودھ پلایا کرتی تھیں۔

اسی زمانے میں وہ ایک دفعہ مکے آئی ہوئی تھیں۔ تو آپ کی ماں حضرت آمنہؓ نے کہا۔ کہ محمدؐ کے متعلق کسی عراف یا نجومی سے پوچھو کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ حلیمہ بچے کو اپنے گاؤں میں لے آئیں اور عکاظ کے میلے تک گاؤں ہی میں رہیں۔ جب میلہ ہوا تو بچے کو لے کر وہاں گئیں۔ وہاں بنو ھذیل کا ایک مشہور عراف آیا کرتا تھا اور لوگ اپنے اپنے بچوں کو دکھا رہے تھے۔ جب اس نے محمدؐ کو دیکھا تو پکارا۔ یا معشر ھذیل، یا معشر عرب! میلے والے اسکے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ وہ بولا کہ اس بچے کو قتل کر ڈالو۔ یہ سنتے ہی حلیمہؓ بچے کو لے کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ لوگ پوچھنے لگے۔ کہ کونسا بچہ؟ اس نے پھر کہا۔ یہ بچہ۔ لیکن کوئی چیز سامنے نظر نہ آئی۔ اسلئے کہ ماں اسے لے جا چکی تھی۔ لوگوں نے پھر پوچھا۔ کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ اس نے کہا۔ کہ میں نے ایک بچہ اور اس کے خداؤں (الہتہ) کو دیکھا جو تمہارے ہم مذہبوں کو قتل اور تمہارے خداؤں (دیوتاؤں) کو توڑ ڈالیں گے۔ اور وہ بچہ تم پر غالب آجائے گا۔ لوگوں نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن نہ پایا (طبقات ص ۹۷)

کاہن مکہ — مکے میں ایک کاہن آیا کرتا تھا۔ اس نے محمدؐ کو اس وقت دیکھا جب کہ ان کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اور کہا۔ اے معشر قریش اسے قتل کر ڈالو۔ ورنہ یہ تمہیں قتل کرے گا اور تم میں تفریق ڈالے گا۔ عبدالمطلب انہیں لے کر بھاگ گئے اور قریش ہمیشہ قول کاہن سے ڈرتے رہے۔" (طبقات ص ۱۰۹)

(ب) رحمانی الہامات اور وحیاں

رحمان ایک غیر عربی لفظ ہے۔ لیکن یمن کے عرب اسے جانتے تھے اور راما، یہوواہ، ہرمز، اللہ، خدا یا گاڈ کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہاں ہم خدا یا رحمان کے وجود کے متعلق

مختلف اقوام کے خیالات کا جائزہ نہیں لینا چاہتے۔ صرف یہ جان لینا کافی ہے۔ کہ خدا کا تصور نہایت قدیم ہے۔ اور اسی تصور کے ساتھ ساتھ انسان کے ذہن میں یہ تصور بھی موجود ہے کہ وہ خیر محض ہے۔ یعنی دنیا میں جتنی بھلائی ہے سب اسی کی طرف سے ہے۔ اور وہی اس کا خالق ہے۔

ہاں اس امر میں اختلاف ہے۔ کہ برائی یا شر کا خدا سے کیا رشتہ ہے۔

(۱) مجوس کا عقیدہ ہے۔ کہ خدا فاعل خیر اور اہرمن فاعل شر ہے۔ اور بدی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ دونوں میں جنگ جاری ہے۔ آخر کار فتح یزدان کو ہو گی۔ یزدان نور ہے اہرمن ظلمت ہے۔ بقول بعض مجوس اہرمن بھی قدیم مثل یزداں کے ہے۔

(۲) توراۃ کا یہوواہ (الوہا) صرف اسرائیلیوں کا خدا تھا اور مجسم تھا۔ گو فیلو جودائی یوس (Philo Judaceus) (سنہ ۲۵ ق م) نے یونانی فلسفیوں یعنی افلاطون، ارسطو اور رواقیین (stoics) کے اثر سے یہ تو تسلیم نہیں کیا کہ خدا خیال مجرد (disembodied thought) یا حکمت محض ہے۔ لیکن اس نے بائبل کی تجسیم کو بھی ترک کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ خدا ماورائے تجربہ (Transcendent) ہے اور اس کا جاننا یا تصور ناممکن ہے۔ لوگوس یا کلام اس کی حکمت ہے۔ جو خدا سے الگ ہو کر مادی دنیا پر حکمرانی کرتی ہے توراۃ کے مطابق شیطان کا وجود ایک الگ وجود ہے۔ جو خدا سے برسر پیکار ہے۔ اسی لئے ان یہودیوں نے جنہوں نے پہلے اسلامی علم کلام اور بعد میں نو افلاطونیت کے مطابق اپنے عقاید کی توضیح کی۔ وہ کہتے ہیں کہ افلاطون اور ارسطو کا یہ قول صحیح نہیں کہ کائنات میں روح و مادہ (معنی و صورت) کا تضاد نہیں ہے۔ بلکہ سب چیزیں (خیر و شر) ایک ہی شے یعنی خدا سے پیدا ہوئی ہیں۔ خدا سے پہلے عقل۔ پھر عالمگیر روح۔ پھر قدرت اور آخر میں مادہ پیدا ہوا۔ مادہ

اپنے مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے نہایت کثیف ہے اور چونکہ خالص منفی چیز ہے۔ اسلئے بدی کا سرچشمہ ہے۔ خدا عقل میں آنے والی شے نہیں۔ بلکہ اس سے دُور (ماورائے عقل) اس کی ہستی ہے۔ اور مادہ عقل سے دور ہونے کی وجہ سے منبع شر اور شیطانی ہے۔

(۳) ہندو مذہب کی بنیاد ویدوں پر ہے۔ لیکن ویدوں کے علاوہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے خیالات نے بھی آرین تصورات پر اثر ڈالا ہے۔ اسلئے خدا کے متعلق صنم پرستی سے توحید تک اور وحدت الوجود تک کے فلسفے بن گئے ہیں اور چونکہ آرین تصور سامی تصور مذہب سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اسلئے ہندو پر ماتما یا برھما مختلف ہندو حکماء کے نزدیک مختلف نوعیت رکھتا ہے اور اس فلسفے کا بلند ترین تخیل ویدانت یا وحدت الوجود کے فلسفے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا خالق کائنات بھی ہے اور کائنات بھی وہ منبع خیر ہے اس دنیا کا پیدا ہو جانا ہی جہنم ہے۔ اسلئے کہ وجود حادث اپنے اصلی سرچشمے یعنی خدا سے جدائی کا نام ہے۔ جب یہ جدائی۔ جو زندگی کے عذاب کی صورت میں۔ انسان کے گلے میں پڑی ہوئی ہے دور ہو جاتی ہے۔ اور انسان ترک سندات کے ذریعے سے پھر خدا میں واصل ہو جاتا ہے تو وہ مکمل نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی یہ دنیا گو شر محض ہے۔ لیکن اپنے اعمال (کرموں) کے ذریعے سے اس کا ایسا استعمال کیا جا سکتا ہے کہ اس کی مادیت و شیطنت باقی نہ رہے اور انسان غیر فانی ہو کر فنا فی اللہ ہو جائے۔

(۴) اسلام نے خدا کو منبع خیر مانا ہے۔ کہ وہ غیر مجسم اور منزّہ عن الصفات ہے وہی خالق کل ہے۔ اس کی بس خیر و شر دونوں ہیں۔ شیطان بھی ایک مخلوق ہے۔ اس کے مقابلے میں ملک یا فرشتے ہیں۔ جو رحمانی پیغامات لاتے ہیں۔

(۵) عرب جاہلیہ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی ایک ایسے خدا کو

مانتے تھے۔ جو سب کا خالق ہے۔ اُسے وہ اللہ کہتے تھے۔ دوسرے دیوی دیوتاؤں کو خدائی کارخانے کا مشیر سمجھتے تھے۔

مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اُن کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ کہ اس دُنیا پر شیطان کی حکومت ہے۔ غالباً اسی لئے وہ شیطان اور اس کے ایلچیوں (یعنی جنوں) کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔ شاید وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ خدا کے نزدیک شیطانوں اور جنّوں کا رتبہ بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے دیوی دیوتاؤں کا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے شاعروں اور کاہنوں نے شیطانوں کو خوش رکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔ اسلئے اب تک مغربی ایشیا میں ایک ایسا فرقہ (یزیدی) موجود ہے۔ جو شیطان کی پرستش کرتا ہے۔ اور گو اس فرقے کے عقاید اب تک صیغۂ راز میں ہیں لیکن کہا یہ جاتا ہے۔ کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رحمان تو خیر محض ہے۔ اس سے برائی کا ڈر نہیں۔ اسلئے شیطان کو خوش رکھنا اور قربانیوں اور پرستش سے اس کو ہموار رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ بہر حال عرب جاہلیہ شیطان سے تعلق رکھنے پر مُصر تھے۔ اور شیطان کے ایلچیوں یا جنّوں سے اپنی دوستی کا اظہار کرتے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے۔ کہ جس طرح قرآن نے ایک عجمی لفظ رحمان عربی زبان میں داخل کیا اسی طرح شیطان اور اسکے ایلچیوں (جنّوں) کو مردود قرار دے کر ان سے قطع تعلق کر لینے پر زور دیا اور ان کی شاعری کو (جو جنوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی تھی اور جس کا مقصد صرف جذبۂ انتقام کو بھڑکانا اور خوشامد سے روپیہ کمانا تھا) اور ان کی کہانت کو بھی (جو جنوں ہی کے ذریعے سے حاصل کی جاتی تھی اور غیب دانی کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھی) مردود اور شیطانی قرار دیا۔

قرآن کی اس جنگ آزادی، یعنی انسانی دماغ کو خیالی بھوتوں اور جنّوں سے نجات

دلانے کی کوشش نے قریش کو اتنا زچ کیا کہ وہ شیطان اور خبیث روحوں کی حمایت میں محمدؐ عربی کے قتل پر آمادہ ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توہم پرستی نے شاعروں اور کاہنوں کی فریب کاری کی وجہ سے، ان کے دماغوں پر اتنا تسلّط کر لیا تھا۔ کہ سوائے چند کامل الفہم افراد کے سب شیطان پرست ہوگئے تھے اور 'رحمان' کے ذکر پر ناک بھوں چڑھانے لگے تھے۔ حتیٰ کہ رحمان کو یمامہ کا ایک شخص بتاتے تھے اور شیطان کو ایک دیوتا تصوّر کرتے تھے۔

اسلام نے اس مثنویت کو مٹایا اور دو خداؤں یا متعدد دیوتاؤں کو منسوخ کر دیا اور صرف ایک خدا یا رحمان کا تصوّر پیش کیا۔ اس سلسلے میں ریڈ کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

"مشاہدہ اور تجربہ (یعنی سائنس) سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ:۔

۱۔ نیچر میں ایک وحدت ہے اور کائنات ایک جسم کی طرح ہے۔ جس کا ہر ایک حصہ و عضو ایک دوسرے سے متعلق ہے۔

۲۔ جتنے واقعات (Phenomene) واقع ہوتے رہتے ہیں۔ خواہ وہ مادّی (Physical) ہوں یا اخلاقی (MORAL) وہ سب ایسے قانونوں کے ماتحت واقع ہوتے ہیں۔ جو اسی طرح اٹل ہیں۔ جیسے کہ وہ قانون جن کے ماتحت سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ (ص ۱۴۳)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔ کہ:۔

"یہ عقیدہ کہ خدا ایک ہی ہے اور اسی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ ایک ایسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ جس میں ذرا بھی شک نہیں کیا جا سکتا (حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں وحدت پائی جاتی ہے) لیکن اظہارِ حقیقت کا یہ طریقہ ایک حد تک نامکمل ہے۔ بہر حال جتنے بھی

مذہبی عقیدے ہیں۔ ان سب میں (عقل و تجربہ یعنی) سائنس کے لحاظ سے، یہ عقیدہ سب سے کم قابلِ اعتراض ہے۔ تاہم یہ کسی یونانی فلسفی نے ایجاد یا تصنیف نہیں کیا۔ بلکہ ایک صحرانشین بدوی نے۔ پہلی نظر میں یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی۔ کہ کس طرح یہ صحرانشین لوگ یونانیوں پر ایسے معاملہ میں سبقت لے گئے۔ جس کا تعلق محض عقل سے تھا؟ اور عقل کے معاملہ میں یونانی ان بدویوں سے بہت آگے تھے۔ لیکن یہ تضاد آسانی سے واضح ہو سکتا ہے۔ یونان کے قدرتی مناظر کی کثرت نے اس حقیقت کو ان کی آنکھوں سے چھپا دیا تھا۔ لیکن بدوی دنیا میں کائنات اپنی کامل عریانی کے ساتھ نظر آتی تھی اور اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا۔ کہ متعدد دیوتا ہیں، زمین، آسمان، سورج۔ چاند۔ تارے ہی اس کے معبود ہو سکتے تھے۔" (مارٹرڈم آف مین۔ ص ۱۴۴)

سائق اور شہید کی تعلیم قرآن نے جاہلیہ کے اس خیال کو کہ انسانی اعمال میں امداد دینے والی دو قوتیں ہیں۔ ایک یزدانی اور دوسری شیطانی۔ زیادہ واضح کر دیا اور کہا۔ کہ ہر شخص دو قوتوں سے گھرا ہؤا ہے۔ ایک نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری بدی پر ابھارتی ہے۔ نیکی کی رہبر قوت (یا ملک) کا نام شہید ہے اور برائی کی طرف لے جانے والی قوت (شیطان) کا نام سائق ہے۔ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيدٌ (سورۃ ۵۰۔ قرآن) ان دونوں قوتوں کی کارگزاریاں درج ذیل ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا۔ کہ موجودہ سائنٹفک عہد میں ان کا کیا نام مناسب ہوگا۔

شہید (ملک یا فرشتہ)	سائق (شیطان)
۱۔ قرآن نے اس انتقامی جذبے کو فنا کر دینے کے لئے عفو و احسان کی تعلیم دی اور یہ بتایا کہ قصاص لینا سلطنت کا کام ہے	۱۔ عرب اور دوسری سرکش اقوام میں انتقام لینے کی عادت عام تھی اور جو لوگ انتقام لینے کی طاقت نہ رکھتے تھے وہ ذلیل

سمجھے جاتے تھے۔ جیسے کہ عرب میں یہ مشہور تھا۔ کہ اگر کسی کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے تو ایک چڑیا اس مُردے سے پیدا ہو کر خون کے بدلے کے لئے شور مچایا کرتی ہے۔

(۲) شیاطین اور ان کی ذرّیات پر عقیدہ رکھتے تھے اور کاہن، ساحر، شاعر وغیرہ اپنے آپ کو ان کا بندہ اور شاگرد سمجھتے تھے

(۳) یہ لوگ روپے کے عوض میں غیب کا حال بتانے کا دعوے کرتے تھے اور اپنے جال میں لوگوں کو پھنسائے ہوئے تھے اور شیاطین و جنات۔

(۴) تقدیر کے قائل تھے (جبر)

تاکہ نظام جماعت قائم رہے اور ظالموں کو تباہ کاری کا موقع نہ ملے۔ سلطنت یا حکومت کے حکم سے سرتابی نہ صرف فرد کے لئے بلکہ جماعت کے لئے موت کا حکم رکھتی ہے اسی لئے قرآن نے بتایا کہ اولی الالباب کیلئے اس قصاص میں جو سلطنت سے زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

۲۔ قرآن نے بتایا کہ بُری روحیں کوئی قدرت نہیں رکھتیں۔ خیر محض کے پاس سے جو پیغامات آتے ہیں۔ ان کا لانے والا بھی اچھا ہوتا ہے۔ جسے فرشتہ یا شہید کہا گیا ہے

۳۔ قرآن بغیر کسی معاوضے کے تاریخی استدلال سے یہ بتاتا تھا۔ کہ شیاطین کے دھوکے میں آ کر ہزاروں قومیں تباہ ہو چکی ہیں۔ ان سے اور ان کے نمائندوں سے بچو۔ یہ سب وہمی چیزیں ہیں۔ اور دھوکہ ہیں۔ اور اسی لئے ناجائز ہیں۔

۴۔ قرآن تدبیر کا حامی تھا اور آخری بھروسہ خدا پر کرنا سکھاتا تھا۔ نہ کہ شیطان پر (اختیار)

۵۔ قمار بازی اور شراب خوری پر فخر کرنا شیطان سکھاتا تھا۔ گو قمار باز اپنے جیتے ہوئے گوشت کو غریبوں کو کھلا دیتا تھا اور شراب پلانا بھی فیاضی کی دلیل ہے۔ لیکن صرف نام و نمود کے لئے کھلانا پلانا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

۶۔ مشرکین کے یہاں وہ اخلاقی تعلیم موجود نہ تھی۔ جو قرآن میں موجود ہے بعض باتیں مثلاً فیاضی، حمایت جار، شجاعت و مروت، عشق بازی وغیرہ موجود تھیں لیکن ان کا مقصد ذاتی فخر و غرور اور ریاکاری تھی۔ ان کے کلام میں ان ہی صفات کو شعراء نے نمایاں کیا تھا اور نہایت قدامت پرست ہو گئے تھے۔

۷۔ شیاطین کے ماننے والے قدامت پرست تھے۔ اور اسی لئے فنا کے کنارے آ گئے تھے۔

۸۔ شیاطین کے بندے مادہ پرست تھے

قرآن نے فیاضی کو فرض قرار دیا اور ہر شخص پر اس کی آمدنی کے اعتبار سے ایک ٹیکس (زکوٰۃ) لگا دیا کہ اس کو حکومت کے ذریعے سے فلاحِ جماعت میں خرچ کیا جائے۔ اسی لئے قمار بازی اور شراب بے معنی قرار پائے۔

اسی لئے قرآن نے یہ دعوےٰ کیا تھا۔ کہ تمہارے لٹریچر یا شاعری وغیرہ میں قرآن کی سی ایک سورت بھی نہیں ہے۔ اور یہی ثبوت ہے۔ کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کے لانے والے فرشتے ہیں۔ نہ کہ شیطان۔ اور تحدی کے باوجود کفار ایسا کلام نہ لا سکے۔ اور لاتے کہاں سے؟ ان کے شعراء کا دماغ اتنا فرسودہ ہو گیا تھا کہ وہ تجدید کی راہ ہی نہ نکال سکتا تھا۔

قرآن نے ہر شعبۂ زندگی میں تجدد کی راہ دکھائی۔ اور اسی لئے دنیا کو آگے بڑھا سکا۔

یزداں پرست روحانیت کے قائل تھے

اور حیات بعد الموت کے قائل نہ تھے یعنی قنوطی تھے اور یاس وناامیدی کے دریا میں غوطے کھاتے رہتے تھے۔

اور شیطان کو بھی مخلوق مانتے تھے۔ اور زندگی کو روحانی زندگی کا مترادف سمجھتے تھے۔ جو مادی دنیا کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اسی لئے ان کی امنگیں لامحدود تھیں اور موت سے نڈر تھے۔

۹۔ ان کا خیال تھا کہ ہم مجبور ہیں اور دنیا اور اسکی زندگی متین ہے۔

دنیا اور زندگی کی ایک غایت ہے۔ اور عمل میں خیر وشر کا ہمیں اختیار ہے۔

رحمانی الہامات کی قسمیں

(۱) شاعری

قرآن نے عربی شاعروں، کاہنوں وغیرہ کو کیوں شیطانی قرار دیا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا خود دعوے تھا۔ کہ ہم غیب کی باتوں کو شیطان اور جنوں کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں دوسرے یہ کہ اپنی شاعری اور کہانت کے ذریعے سے جن جذبات وخیالات کا اظہار کرتے تھے۔ وہ بجائے تعمیرِ ملت کے اخلاقی پستی کی طرف لے جاتے تھے۔

لہذا باوجودیکہ قرآن نے جاہلیہ کے عرب شاعروں کو شر انگیز اور گمراہ بتایا۔ لیکن فی نفسہ شاعری کو بُرا نہیں کہا۔ گو رسولؐ عربی خود شاعر نہ تھے۔ لیکن شعر کو پرکھنا جانتے تھے اور نہ صرف اچھے شعر کی تعریف کرتے تھے۔ بلکہ اس کی اثر پذیری سے فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ حسّان بن ثابت دربار رسولؐ کے مقبول شاعر تھے اور ترقی پسند شعراء میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے

اپنی شاعری سے اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت مدد دی۔

اسی طرح ہر قوم میں شاعری کا وجود تھا۔ اور اچھا شاعر، یعنی اچھی باتوں کو نظم کرنے والا شاعر، شیطان کا بھائی نہیں۔ بلکہ رحمان کا تلمیذ یا شاگرد سمجھا جاتا تھا۔ عرب جاہلیہ کا شاعر اس پر مُصر تھا۔ کہ وہ شیطان ہی سے تعلق رکھے۔ لیکن ایران کا شاعر، سروش فرشتے کا معتقد تھا اور دوسری قوموں میں بھی شعر و شاعری کی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی۔ کہ وہ پست جذبات و شہوانی خیالات سے پاک ہو۔ اور انسان کو مسرتِ روحانی حاصل کرنے میں معین ہو۔ لہٰذا ہر ایسی شاعری رحمانی شاعری ہے۔ زبورِ داؤدی اسی ضمن میں الہامی بتائی گئی ہے۔

(ب) قانون

قانون کے لئے عبرانی زبان میں 'کتاب' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی پہلی پانچ کتابیں 'کتاب' کہلاتی ہیں۔ توراۃ کے معنی بھی 'قانون' ہیں۔ لہٰذا قرآن نے کتب الٰہیہ یعنی ان قوانین کو جو تعمیر انسانیت میں مدد دیتے ہیں۔ کتب رحمانی یا خدائی قانون مانا ہے۔ ان میں نہ صرف وہ قوانین (کتب) داخل ہیں۔ جن کا ذکر قرآن میں آگیا ہے۔ مثلاً تورات و انجیل بلکہ وہ بھی جن کا اہلِ عرب کو علم نہ تھا۔ مثلاً قانون حمورابی، یا قانون منو اور قانون روما وغیرہ۔

ج۔ حکمت یا فلسفہ

ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (وہ انہیں قانون و فلسفہ سکھاتا ہے،) میں اسی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو فلسفہ بھی ترقی کی طرف لے جاتا ہو۔ رحمانی حکمت ہے۔ وہ یونان کا ہو۔ چین کا ہو یا ہندوستان کا۔ اسی طرح کہانت کے مقابلے میں قرآن نے فکر و تدبر، مشاہدہ و تجربہ کی راہ کھولی اور سائنس و فلسفہ کو قوانین الٰہیہ کے جاننے کا ذریعہ سمجھا۔

قرآن میں جہاں کہیں ساحر و کاہن کی فریب کاریوں کو دکھایا گیا ہے۔ وہیں حکمت و فلسفہ کا

ذکر ہے۔ اسی لئے شاعروں اور کاہنوں کی جماعت نے اپنے ناجائز حقوق کی حفاظت میں وہی طرز عمل اختیار کیا۔ جو دنیا میں ' ذہنی اجارہ دار ' ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔ حکمت و فلسفہ پر بار بار توجہ دلانا آزادئ رائے' آزادئ قول اور آزادئ عمل کا پیش خیمہ تھا۔ قریش کے سرداروں کو اس تعلیم میں اپنی تباہی کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی نوعیت کی غلامی رائج ہے۔ اس کے لئے آزادی فکر و عمل ہی ایک حتمی دوا ہو سکتی ہے۔

د۔ سائنس

قرآن نے جہاں کہیں تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔ اس میں سائنسی غور و فکر کو حکمت کا ہم معنی قرار دیا ہے۔ پہلی ہی چند آیتوں میں تجربہ و مشاہدہ کا ذکر ہے۔ اور ایسے علم کو علم الہی یا قدرتی علم بتایا گیا ہے۔ یہ علم تحریر میں لائے جانے کے بعد سائنس یا مجرب علم کا درجہ حاصل کر لیتا ہے (علم بالقلم) خدا نے قلم کے ذریعے سے علم دیا) اسی کی طرف اشارہ ہے۔

سائنس کی بنیاد استقرار پر ہے۔ یعنی جزئیات کے مشاہدے اور تجربے سے کلیات پر پہنچنے کا نام سائنس ہے۔ قرآن میں بار بار مختلف اقوام کی تاریخوں کو دہرایا گیا ہے اور ان کی خاص باتوں سے عام سبق نکالا گیا ہے۔

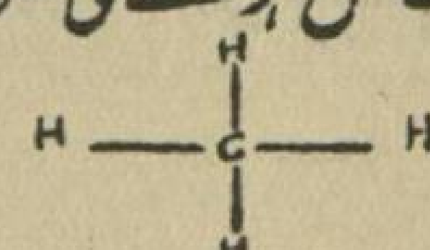
اسکے یہ معنے ہیں۔ کہ سائنسی تدبر کو اسلام نے بہت بڑا درجہ دیا ہے۔ اسی لئے جہاں کہیں قریش نے معجزہ یا خارق العادہ چیزوں کا مطالبہ کیا۔ قرآن نے اس کو غیر سائنسی قرار دے کر اس سے صاف انکار کر دیا۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ جس طرح شعر و کہانت کے مقابلے میں قرآن نے اپنی تعلیم کو پیش کیا۔ اسی طرح سحر و شعبدہ بازی کو لغو قرار دے کر سائنسی تفکر کو پیش کیا۔

یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن میں رسول عربی کا نہ کوئی سحر بیان کیا گیا ہے نہ معجزہ (یا آیت)

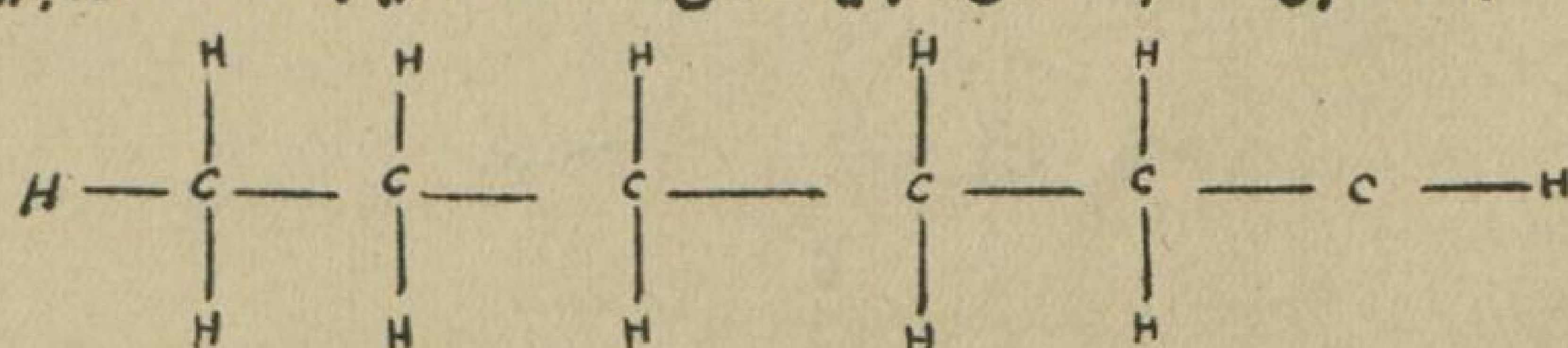
بلکہ بار بار یہی کہا گیا ہے کہ غیب کا علم اور خرقِ عادت صرف خدا کے لئے موزوں ہے۔

سائینس کی دنیا میں نت نئی معلومات ہوتی رہتی ہیں کہیں سیب اشارہ کرتا ہے۔ کہ کائنات میں کشش اجسام ہے کہیں رگڑ سے آگ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور حرارت کے قوانین سامنے آتے ہیں۔ اور تقریباً ہر ایجاد استقرائی الہامی ہوتی ہے۔ اور یہ سب باتیں قرآن کے مطابق رحمانی الہامات ہیں۔ جو فلاح انسانیت کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔

یوں تو سب سائینسی الہامات حیرت انگیز ہیں۔ لیکن کی کولے (KEKULE) کا الہام نہایت دلچسپ ہے۔ وہ زندہ کیمیا (آرگینک کیمسٹری) کے سلسلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ بنزین کا گُر (Formula) کیا ہے۔ تجزیہ سے معلوم ہوا کہ یہ $C_6 H_6$ ہے۔ یعنی اسمیں کاربن اور ہائیڈروجن کے چھ چھ ذرے ہیں۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ کاربن کا ایک ذرہ ہمیشہ چار ذروں سے متصل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے قوتِ اتصال (Valency) کہتے ہیں۔ مثلاً



اب اگر کاربن کے چھ ذروں کو ہائیڈروجن کے ساتھ ملایا جائے۔ تو نتیجہ یہ ہو سکتا ہے

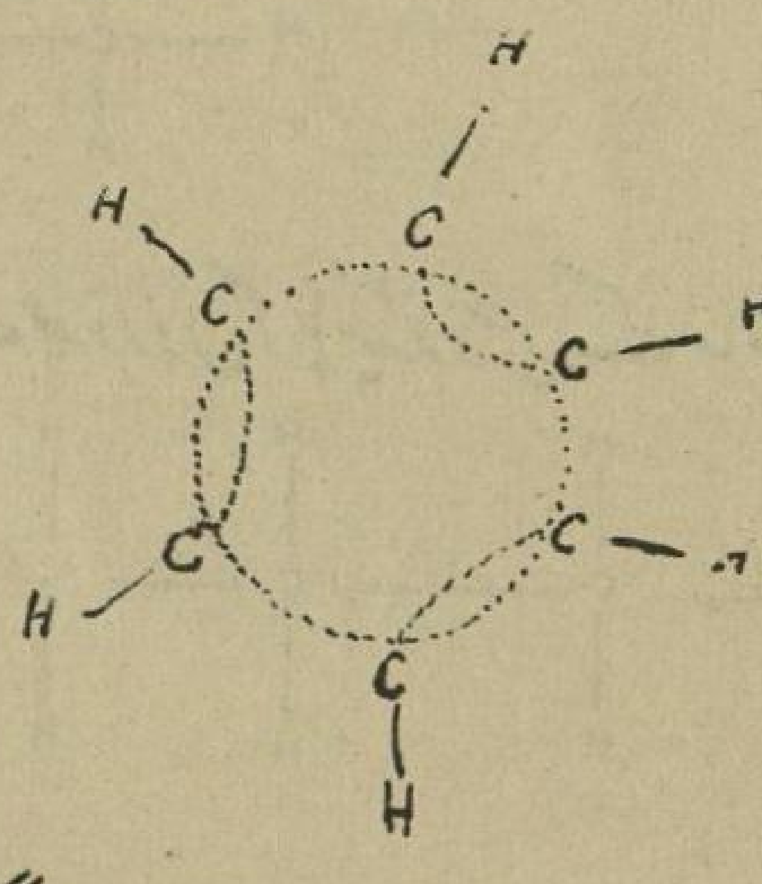


یعنی $C_6 H_{14}$ (کاربن کے چھ ذرے ہائیڈروجن کے ۱۴ ذروں سے مل جاتے ہیں) لیکن اصل حقیقت یہ تھی۔ کہ چھ ذرے صرف چھ ذروں سے ملتے ہیں۔

کی کولے سوچ میں پڑگیا۔ دنیا کے بڑے سے بڑے سائنسدان حیران تھے۔ کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ کیوں ہے۔ آخر کار کی کولے اس تلاش میں اتنا سرگرداں ہوگیا۔ کہ لوگ اُسے خبطی یا پاگل سمجھنے لگے۔

آخر کار بہت دنوں بعد بلکہ مہینوں کے بعد جبکہ وہ ایک موٹر بس میں مارا مارا پھر رہا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک سانپ اپنے منہ میں اپنی دُم نگل رہا ہے۔ یہ رُویا دیکھتے ہی وہ بس سے کُودا اور قریب ترین کارگاہِ سائنس میں جاکر، اس نے سانپ کا سا حلقہ بنایا۔ کاربن کے ذرّوں کو کئی شکلوں میں اس حلقے کے چاروں طرف لکھا اور آخر کار اس کا گُر (فارمولا) بناکر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ دنیا اس الہام سے حیرت میں تھی۔

جو فارمولا یا گُر بنا وہ ایسا تھا۔ بنزین کے چھ کاربن کے ذرّے صرف چھ ہی ہائیڈروجن کے ذروں سے ملتے تھے۔ اور پھر بھی ہر کاربن کا ذرّہ چار سمتوں سے چار ذرّوں سے متصل تھا۔ شکل یہ بنی۔



اس گُر کے سلسلے میں جو الہامی پہلو ہے۔ وہی حیرت انگیز ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی ایسی طاقت ضرور موجود ہے جو تو اہین قدرت کا علم (جو غیب میں ہے)

صرف ان لوگوں کو دیتی ہے۔ جنہیں وہ پسند کرتی ہے۔ غالباً اسی کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ " الا من ارتضی من الرسل "۔

نتیجہ :۔ ۱۔ الہامات، وجدانی باتیں ہیں۔

۲۔ قرآن قول من عنداللہ ہے۔ یعنی معنی دل میں منبع خیر کی طرف سے آتے جسے آپؐ اپنے الفاظ میں سنا دیتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے :۔

(الف) قرآن نے کہا ہے کہ یہ وحی بھی ویسی ہی ہے۔ جیسی کہ قدیم وحیاں ہوتی تھیں، ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ کہ قدیم وحیاں انسانی تصنیفیں ہیں۔ جو اُن ہادیوں یا نبیوں کے منہ سے نکلتی تھیں جو اصلاح انسانیت کے جوش سے مملو ہو کر لوگوں کو راہ راست پر لانا چاہتے تھے اور اپنے موعظ سناتے تھے۔

(ب) الغزالی (۴۵۰ - ۵۰۵ ہجری) نے معارج القدس میں کہا ہے کہ ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ اسکے بعد ہمیں علم ہوتا ہے لیکن نبی پہلے علم حاصل کر لیتا ہے اسکے بعد دیکھتا ہے "۔ اسکے یہ معنی ہیں۔ کہ نبی کے حواس باطنی اور قوت استدراک، سائنٹیفک ہوتی ہے۔ وہ جزئیات سے کلیات بناتا ہے۔

شیخ الاشراق (ولادت ۵۵۰ھ۔ قتل بحکم صلاح الدین ۵۸۶ھ) نے بھی مقاصد المراصد میں اس کی تائید کی ہے۔ اور افلاطون کے نظریہ تخیلات کو مانتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے۔ کہ ہمارے خیالات کی مادی حقیقت عالم برزخ یا عالم مثال یا عالم اشباح میں موجود ہے۔ اسی طرح تصورات بھی مادی حقیقت رکھتے ہیں۔ اور نبی عالم بیداری میں عقول مجردہ اور نفوس سماویہ کو دیکھتا ہے اور کلیات سے جزئیات بناتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ دہلوی (۱۱۴۴ - ۱۲۰۰ ہجری) تفہیمات الٰہیہ ص ۵۸۱ پر کہتے ہیں۔

"قرآن عظیم خدا کی نزدیکی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسکے الفاظ عربی ہیں۔ جنہیں رسول اللہ جانتے تھے اور اسی زبان میں خیالات بناتے یا سوچتے تھے۔ ان دیکھی دنیا سے معنی اُنکے قلب پر نازل ہوتے تھے۔ جو ایک طرح کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ خدا کی قربت حاصل کرنے کے لئے اسکے ذریعے سے وہ لوگوں کو ہدایت کر سکیں۔ اس طرح یہ (یعنی رسولؐ کے الفاظ اور وحی کردہ معانی) مل کر کلام اللہ بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ خلق کی بھلائی چاہتے تھے۔ بھلائی کرنے کی یہ خواہش تھی۔ جو لفظوں کو جمع کر کے مرتب کرتی تھی۔ پھر وہ اسے موجودہ نظم قرآنی کے ساتھ منظم کرتے تھے اور خدائی جبروت کے مطابق اسکو تشکیل دیتے تھے۔ اسی لئے یہ خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا اور کلام اللہ کہلایا۔"

مندرجہ دلائل کے علاوہ چند سلبی دلائل بھی ہیں۔ مثلاً :-

(۱) مصنف کے دماغ میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اگرچہ اس کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم زمانے میں یہ طریقِ کلام ہو گیا تھا۔ کہ اپنی تصنیف کو کسی عظیم طاقت سے منسوب کیا کرتے تھے۔ خواہ وہ طاقت اچھی ہو (یعنی خدا یا دیوتا) یا بُری ہو (اہرمن اور جن) عرب کے شعراء جنوں سے اور کاہن شیاطین یا اَن دیکھی روحوں سے اپنا تعلق ظاہر کرتے تھے ان کے جواب میں رسولِ عربی نے یہ فرمایا کہ سب طاقتوں پر ایک سب سے بڑی طاقت حاوی ہے اور گو جنوں اور شیطانوں کے وجود سے انکار نہیں کیا لیکن یہ بتایا کہ اچھے خیالات صرف خدا کی طرف سے نازل ہو سکتے ہیں۔

اب اگر موجودہ زمانے کے مصنف یہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ کہ خدا کی ہستی کیسی ہے اور آیا اس کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ تو ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ چونکہ ہمیں عرب کے شاعروں کی طرح

شیطانوں اور جنوں تک سے گفتگو کرنے یا تعلق پیدا کرنے کا تجربہ حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ سوائے اپنی نفسی طاقت کے اور کسی قوت سے جو انسان سے خارج میں ہو کسب علم کیا جا سکتا ہے۔ خصوصًا ایسا علم جو ہمارے تجربے میں نہ ہو۔ یعنی وہ علم غیب میں ہو یعنی اگر ایسا ممکن ہوتا۔ کہ انسان اپنے سے بالاتر طاقتوں سے اکتساب علم کر سکتا تو وہ ہزاروں قوانین قدرت دریافت کر لیتا۔ اور سائنس کی ہزاروں حقیقتوں سے پردہ اٹھ جاتا۔ تو دنیا میں کشمکش اور فساد ہی باقی نہ رہتا۔

اس کے یہ معنی ہوئے۔ کہ رسولِ عربی سچ فرماتے تھے۔ کہ ان کا کلام ویسا ہی ہے جیسا گزشتہ نبیوں کا ہوا کرتا تھا۔ یعنی خود ان کی ہی تصنیف ہے۔ لیکن شیطانی نہیں ہے۔ بلکہ رحمانی ہے۔

(۲) اگر یہ خدا کا کلام ہوتا۔ یعنی ایسی ہستی کا کلام۔ جس کے لئے حجابِ غیب شہود ہے اور ماضی مستقبل اس پر عیاں ہے۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن میں ناسخ منسوخ ہوتا یعنی ایک قول نازل کیا جاتا اور پہلے سے یہ نہ بتایا جاتا۔ کہ یہ منسوخ ہونے والا ہے۔ بلکہ حسب ضرورت ہوتی منسوخ کر دیا جاتا۔

یہی نہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ یہ کہا جاتا کہ "اے رسول تمہیں قرآن سکھایا جائے گا اور تم اسے ہرگز نہ بھولو گے۔" (سنقرئك فلا تنسیٰ) اور چند دنوں کے بعد جب آپ چند آیتیں بھول گئے تو اوپر کے کلام کے بعد ہی کہا گیا۔ کہ "سوائے ان باتوں کے جنہیں اللہ بھلانا چاہے (الا ما شاء اللّٰہ) یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جس جزم کے ساتھ پہلی دو آیتیں ہیں۔ اور جس قافیے میں ہیں۔ اس کا تقاضا تھا۔ کہ یا تو رسول عربی کبھی نہ بھولتے یا بھولنے والے تھے تو ان آیات اور اسکے بعد دوسرے قافیے میں استثناء کی ضرورت نہ تھی۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ کلام رسولؐ تھا۔ لیکن رحمانی۔ نہ کہ شیطانی۔

(۳) قرآن میں بعض آیتیں ایسی بھی ہیں۔ جو صرف رسولؐ اللہ کی ہی طرف سے ہو سکتی ہیں۔ (توراۃ اور ویدوں میں اس کی بہ کثرت مثالیں ہیں) مثلاً

(۱) خدا یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ "ابولہب تباہ ہو جائے" (سورہ ۱۱۱) بلکہ بجائے اسکے کہ اپنے رسول سے اس قسم کی بد دعا کرائے وہ اپنی مخلوق (ابولہب) کو تباہی کا خیال لاتے ہی تباہ و برباد کر دیتا اور اس کا "مال و کسب" کچھ کام نہ آتا۔

(۲) قرآن میں کئی جگہ "قاتلهم الله" کا جملہ آیا ہے۔ یعنی خدا انہیں مار ڈالے۔ یا اللہ ان کا بُرا کرے۔ اس قسم کے جملے بھی مندرجہ بالا شق کے ضمن میں آتے ہیں۔

(۳) اسی قسم کی وہ آیتیں ہیں۔ جن میں کہا گیا۔ کہ 'بندر ہو جاؤ' یا 'پتھر لوہا بن جاؤ' (قل کونوا حجارة او حدید ا) یا جہنم میں ہمیشہ رکھے جانے کی وعید ہے۔

(۴) پھر قرآن میں دوسرے کے اچھے اقوال کو بھی رسولؐ اللہ نے داخل کر لیا اور فرمایا کہ حق بات فلاں شخص کی زبان پر جاری ہو گئی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ حق ہونا ہی کلام 'من عند اللہ' ہونا ہے۔ مثلاً مقام ابراہیمؑ کو مصلیٰ بنانے، یا آیت حجاب وغیرہ کے متعلق (دیکھیے بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ)

(۵) نہ صرف قرآن کو قرآن سے منسوخ کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ اقوال رسولؐ جو احادیث میں شامل ہیں۔ قرآن کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ یا ان میں ترمیم و اضافہ کر سکتے ہیں۔ بخاری باب کیف بدء الوحی میں حدیثوں کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ کہ "مجھے قرآن دیا گیا ہے۔ اور اتنا ہی اور" یعنی احادیث کا رتبہ بھی تقریباً قرآن کے برابر ہے۔ فرق صرف یہ ہے حدیثیں قول غیر متلو ہیں اور قرآن متلو۔ یعنی ان کی تلاوت مقرر کر دی گئی ہے۔

اور متن میں جو الفاظ اور معنی ہیں۔ وہ وہی ہیں۔ جو رسولؐ اللہ نے من جانب اللہ بطور قرآن نازل ہونا ارشاد فرمایا۔

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن بھی حدیث کی طرح قول رسول ہے۔ دونوں رحمانی قول ہیں۔ یعنی دونوں اچھی باتیں بتاتے ہیں۔ حق ہیں۔ اور عالمگیر حقایق کے حامل ہیں۔

(۵) قرآن میں متعدد مقامات پر اختلاف قرأت ہے۔ ایک خاص تاریخی ترتیب سے دیا گیا لیکن اس طرح جمع نہیں ہے۔ اس کی طبیعات وہیئت وہی ہے۔ جو عربوں میں رائج تھی اس میں وہی قصے ہیں۔ جو رسولؐ عربی جانتے تھے۔ یا عربوں میں مشہور تھے۔ اس میں حروف مقطعات کے علاوہ اور بھی بعض مبہمات ہیں۔ غرضکہ قرآن کی داخلی شہادت سراسر ثابت کرتی ہے۔ کہ یہ قولِ محمدؐ عربی ہے۔ یہ کلام من عنداللہ ضرور ہے۔ لیکن اس قسم کا کلام اللہ نہیں ہے۔ جیسا کہ توراۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ خدا دو بدو نبیوں سے باتیں کرتا تھا۔ اسلئے رسولؐ عربی نے خود اس کی تردید وحی متلو (یعنی قرآن) میں کر دی ہے اور کہا ہے۔ کہ خدا کے لئے یہ امر شایانِ شانِ خداوندی نہیں کہ کسی سے کلام کرتے۔ البتہ وہ وحی یا پردے سے کلام کر سکتا ہے۔ یعنی اپنے بندوں کے دلوں میں باتیں ڈال سکتا ہے۔

(ماکان اللہ ان یکلمہ . . الا وحیا او من وراء حجاب ونزل علی قلبك روح الامین)

موجودہ زمانے کے مدعیان علم قرآن کو قولِ محمدؐ عربی ماننے والوں کو کیوں گمراہ سمجھتے ہیں؟

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس پجاریوں کی جماعت کو جو سدنہ قریش کی صورت میں عرب میں

پادریوں۔ دستوروں، ربیوں اور برہمنوں کی صورت میں باقی دنیا میں موجود تھی۔ رسولِ عربیؐ نے مٹادیا۔ اور فکرِ انسانی کو آزاد کیا۔ وہی جماعت مسلمانوں میں پیدا ہوگئی۔ اور دین کو عوام کالانعام کی خوشنودی اور دولت کا ذریعہ بنا کر اسلام کو بدنام کرنے لگی۔ پہلے تو یہ کلیہ بنایا کہ "حکمِ الٰہی یا نص کے مقابلے میں سب سے پہلے جس نے بربنائے قیاس چون و چرا کا شبہ پیش کیا وہ شیطان تھا خدا نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر۔ اور اس نے یہ قیاسی حجت پیش کی۔ کہ کیوں کروں جب کہ میں آدمؑ سے افضل ہوں۔ میں آتشی نژاد ہوں اور آدم ذلیل خاکی پتلا۔ میں تو تیرے سوا کسی کے آگے سجدہ نہ کروں گا۔" پھر یہ نتیجہ نکالا کہ عقل و فہم، فکر و تدبر یعنی فلسفہ کا استعمال کرنا شیطانی فعل ہے یہ عقل کے کورے یہ نہیں سمجھتے۔ کہ شیطان کے قصے میں خدا براہِ راست اس ملعون سے گفتگو کر رہا تھا۔ اور شیطان نے یہ نہیں کہا تھا۔ کہ "بارِ الٰہا! میں آتشی نژاد ہوں۔ تیرے حکم کے میں یہ معنی سمجھا ہوں۔ کہ آدم کے قدموں پر اپنا آتشیں سر رکھ دوں اور وہ اپنی خاک کو میری ناری سوزش سے جلا کر اکسیر بنالے۔ وہ فنا ہو جائے اور میری شوکت دنیا پر روشن ہو جائے۔" اس نے قول اللہ کی تاویل نہیں کی۔ یا بلا سوچے سمجھے، اپنی ناقص عقل اور غرور کے زعم میں آدم کے ہیولے کو نذرِ آتش نہیں کر دیا۔ بلکہ اس نے اعترافِ عجز کیا۔ اسنے کہا۔ کہ میری ناقص و کوتاہ عقل میں مصلحتِ خداوندی نہیں آئی۔ کہ ایسا حکم کیوں دیا جاتا ہے۔ میں اس کا مقصد سمجھنا چاہتا ہوں۔

دورِ حاضر کے مدعیانِ علم اگر ایک طرف ایک غلط کلیہ بنا کر انسان کو خدا کی سب سے بڑی نعمت، یعنی عقل و نطق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور نص کے سمجھنے کو شیطانی قرار دیتے ہیں۔ تو دوسری طرف یہ بھی دعوے کرتے ہیں کہ قرآن میں بار بار تفکر، تدبر اور تعقل کی دعوت دی گئی ہے۔ اور ہم ہر نص قرآنی پر سمجھ کر عمل کرتے ہیں۔ یہی نہیں کہ ہم سمجھتے ہیں بلکہ مخالفین تعلیم قرآن بھی

کوئی ایسی تعلیم اسلام نہیں پیش کر سکتے جو عقل میں نہ آتی ہو یا عقل کے خلاف ہو۔ گویا ایک ہی نفس میں وہ متکلم اسلام بھی بنتے ہیں۔ اور عقل کے دشمن بھی ہیں۔ کہیں وہ امام احمد حنبل اور امام شافعی کی آڑ لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ "بلا دلیل و حجت کتاب وسنت میں جو پاتے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔" کہیں یہ کہتے ہیں۔ کہ امام احمد حنبل نے بھی قرآن وحدیث کی باتوں کو پورے طور پر سمجھ لیا تھا۔ وہ بحث کو کوتاہ کرنے اور لوگوں کو عملی زندگی کی طرف رجوع کرنے کے خیال سے قیاس آرائیوں میں اپنا وقت ضایع کرنا اور مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا۔ کہ اتنے بڑے امام قرآن کے صریح احکام کے متعلق تدبر وتعقل سے گریز کرتے۔

معتزلیوں یا بالفاظ دیگر متکلمین نے قرآن وسنت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہو سکتا۔ لطف یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عقل کے مطابق اسلام کے عقاید کو اپنی عقلی دلیلوں کے مطابق بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یونانی فلسفہ نے عباسیوں کے زمانے میں عربی دماغ پر تسلط کر لیا تھا۔ لیکن خود یونانی فلسفے میں سقراط کے شاگردوں نے الگ الگ الہیاتی راستے اختیار کر لئے تھے اور فلسفہ حقیقی زندگی، یعنی سائینس واستقراء سے دور ہو کر محض دماغی ورزش کا ایک آلہ بن گیا تھا۔

پہلے بھی جو غلطیاں ہوئیں اور آئندہ بھی ان کا شدید احتمال ہے۔ ان کی وجہ صرف ایک ہے۔ کہ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق نہیں سمجھا جاتا اور مختلف قسم کے قرآنی اقوال کو الگ الگ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی خطیب کا روئے سخن ایک خاص قسم کے مجمع کی طرف ہو۔ وہ کسی خاص خیال کی طرف انہیں لانا چاہتا ہو۔ یا کسی خاص بات کی تشریح کر رہا ہو۔ تو وہ اپنے مخاطبین کے لحاظ سے گفتگو کرے گا۔ اور علی قدر عقول حاضرین اپنے خیالات کو ایک

خاص تسلسل اور ایک تاریخی و ذہنی پس منظر کے ساتھ بیان کرے گا۔ لہذا اگر کوئی معتزلی یہ چاہے کہ نص قرآنی سے عقل کو سمع (یعنی عقل یا قرآن وحدیث) پر قاضی وحاکم بنائے۔ تو اسے قرآن کے مکی ادوار میں اپنی تائید میں بیانات مل سکتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ رسولؐ عربی کی تعلیم کا مقصد ہی یہ تھا کہ صرف آزادیٔ عقل کا اعلان ہو جائے اور کوئی تعمیری تعلیم مثل فرض وواجب نہ بیان ہو۔

اسی طرح اگر ایک مسلمان انسان کو مجبور محض سمجھے اور متکلمین کے عقیدۂ قدر سے گریز کرے تو وعدہ وعید کی جملہ آیتوں کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے۔ گو خود معتزلہ مانتے ہیں کہ حدیث (القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ۔ یعنی قدر کا عقیدہ رکھنے والے امت محمدیہ کے مجوسی ہیں) حدیث صحیح ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجوس کے معنی جہنمی یا گمراہ کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "مجوس کا لفظ اس طرف دلالت کرتا ہے۔ کہ اگر کوئی اللہ پر ایمان لائے اور یوم الآخر کا قائل ہو۔ تو وہ مجوسیوں کی روش پر چل کر بھی نجات پا سکتا ہے" (قرآن)

خلق قرآن کا مسئلہ بھی، ایسے ہی مسائل میں سے ہے۔ جس کی وجہ سے مفت میں بہت سا وقت ضائع ہوا۔ اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ جب انسان خدا ہی کی ذات کے متعلق ایک رائے نہیں رکھتا۔ تو اسکے کلام اور کلام کے حدوث وقدم پر بحث کرنا ہی لایعنی تھا۔ چہ جائیکہ اس مسئلہ کو عباسیوں نے اتنا اہم بنا لیا کہ بے گناہوں کی خونریزی تک سے دریغ نہ کیا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ قرآن میں کہیں بھی یہ بحث نہیں کہ یہ کلام اللہ ہے یا کلام رسولؐ عربی اگر بحث ہے تو یہ ہے کہ یہ کلام شیطان یا قول شاعر وکاہن ہے یا نہیں۔ اگر شیطانی کلام نہیں ہے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ رحمانی قول ہے۔

مدعیان علم جانتے ہیں کہ یہ قول رسولؐ اللہ ہے۔ یعنی رسولؐ اللہ کے منہ سے نکلا ہے۔

ان ہی کی زبان میں ہے۔ ان ہی کے محاورے میں ہے۔ اور جو تدبّر فی خلق اللہ یا تحدّث وہ عام طور پر کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ہے۔ خدا نے ان کی مدد کی۔ اور انہیں اپنے راستے کی ہدایت کی۔ اور زمانے کے اعتبار سے جو عالمگیر حقایق آپؐ نے بیان فرمائے۔ اس کو رحمانی بنا دیا۔

اسی لئے عارفِ روم کہتے ہیں ؎

گفتۂ او، گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

اللہ اللہ! رسولؐ کا کلام کس درجہ بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن مدعیانِ علم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اگر اسے قولِ رسولِ عربیؐ قرار دیں گے۔ تو شاید اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے۔ کہ اگر یہ کلام اللہ ہوتا یعنی قانونِ الٰہی ہوتا تو فطرتاً اور طبعاً ہر مخلوق کی طبیعت میں راسخ ہوتا۔ یعنی بغیر کسی کے سمجھائے، بغیر نبی کے اظہار کئے دنیا میں جاری و ساری ہوتا۔ ذلک الکتاب میں اسی قانونِ قدرت اور قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ اور قرآن کا اعجاز بھی (اگر اعجاز مانا جائے) تو یہ ہو سکتا ہے کہ رسولِ عربیؐ نے ایسے شائستہ اور مناسب اندازِ بیان میں انسان کو خدائی قوانین کی طرف متوجہ کیا۔ ورنہ بقولِ قرآن دنیا میں جو علم بھی ہے۔ وہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ اور چونکہ قلم کے ذریعے سے خود خدا نے انسان کو علم دیا ہے لہٰذا جو علم بھی تجربہ کے بعد تحریر میں آجائے اور کسی رازِ فطرت کو ظاہر کرتا ہو وہ خدائی علم ہے۔ اور جو بھی پڑھ کر اسے حاصل کرتا ہے۔ وہ نبی ہے۔ یعنی علمِ الٰہی کا مہبط

آیاتِ محکمات و متشابہات

کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن میں دو طرح کی آیتیں ہیں بعض محکم ہیں اور بعض متشابہ فلسفیانہ طور پر اس آیت پر غور کرنے والے (ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات

هن ام الکتاب واُخر متشابهات - یعنی خدا نے تجھ پر (اے محمدؐ) الکتاب نازل کی ہے - اس میں محکم آیتیں ام الکتاب ہیں اور دوسری آیتیں متشابہات ہیں ۔ سورہ آیت) یہ کہنے لگے - کہ قرآن دو حصوں میں تقسیم ہے - یا تو اس کی آیتیں محکم اور مضبوط ہیں - جن میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں اور یا متشابہ ہیں جو محکم کی نقیض ہیں - یعنی ان کی تاویل سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا - اور ایسی آیتوں کے کئی معنی ہو سکتے ہیں - اس کی تفصیل یہ ہے :-

متشابہ	محکم
متشابہ ضد یا نقیض ہے محکم کی۔	(۱) محکم وہ ہے جسکے معنی واضح ہوں ۔
متشابہ کو اللہ نے اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے یعنی وہی اسکے معنی جانتا ہے مثلاً حروف مقطعات یا قیام ساعہ وغیرہ -	(۲) محکم کے معنی صاف ظاہر ہوتے ہیں یا تاویل سے واضح ہو جاتے ہیں ۔
متشابہ میں تاویل سے کئی معنی پیدا ہوتے ہیں -	(۳) محکم میں تاویل سے صرف ایک معنی پیدا ہوتے ہیں ۔
متشابہ کے معنی عقل میں آنا ضروری نہیں مثلاً نمازوں کی تعداد - رمضان میں روزوں کا مخصوص ہونا - وغیرہ -	(۴) محکم کے معنی معقول ہوتے ہیں یعنی عقل میں آجاتے ہیں -
متشابہ ایسی نہیں ہوتی - بلکہ دوسری آیتوں سے تعلق رکھتی ہے - ان کے بغیر اسکے معنی واضح نہیں ہوتے -	(۵) محکم مستقل بنفس ہوتی ہے - خود سمجھ میں آجاتی ہے -
متشابہ میں ہوتی ہے -	(۶) محکم میں تکرار لفظی نہیں ہوتی -

(۷) محکم کا تعلق فرائض، وعدو وعید سے ہے	متشابہ کا تعلق قصص و امثال سے ہے،
(۸) محکم ناسخ، حلال حرام، حدود و فرائض کا ذکر کرتی ہے۔ اور ایسی چیزوں کا جن پر ایمان لاکر اسکے مطابق عمل بھی کیا جائے (عکرمہ و قتادہ)	متشابہ منسوخ، مقدم مؤخر، امثال اقسام کا ذکر کرتی ہے۔ اور ایسی چیزوں کا جن پر ایمان تو لایا جائے۔ لیکن عمل نہ کیا جائے۔ (عکرمہ و قتادہ)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوگا۔ کہ کہاں تک ایک ایک آیت کے متعلق بحث ہوئی۔ اور چھان بین کے بعد متشابہات کے معنی متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس سلسلہ میں ایک اسکول امام نووی کا بھی ہے۔ اور اکثر محدث و علماء اسکے پیرو ہیں، انہوں نے صحیح مسلم کی شرح کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ امر خدا سے بہت بعید ہے۔ کہ وہ اپنی مخلوقات سے ایسے الفاظ میں کلام کرے کہ وہ اسے کسی طرح نہ سمجھ سکیں۔ یہاں آپ کو قرآن کی آیت (۶ سورہ آل عمران) میں یہ بھی غور کرنا چاہیئے۔ کہ اکثر علماء لایعرف تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم کے دونوں جملوں کو ملا کر پڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ قرآن کی متشابہ آیتوں کی تاویل سوائے اللہ اور مضبوط علم والے لوگوں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ عام لوگ جن کا علم مضبوط نہیں اور کچے علم کے لوگ ہیں۔ وہ اپنی کم سمجھی سے متشابہ آیتوں کے معنی سمجھنے میں راہ راست سے ہٹ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی نادانی، کم علمی یا جہالت ہے۔ اس کو قرآن نے زیغ کہا ہے یعنی جن لوگوں کے دلوں میں زیغ ہے وہ ایسی آیتوں کو نہیں سمجھتے۔

اس سے آگے کی آیت میں زیغ کے مقابلہ میں ہدایت کا لفظ آیا ہے۔ گویا زیغ کے دو معنی ہوئے۔ اول تو وہ لوگ جو راسخون فی العلم کے مقابلہ میں ہیں۔ جاہل ہیں۔ اور فتنہ و تاویل کے لئے متشابہات کے غلط معنی سمجھتے ہیں۔ یعنی وہی لوگ زیغ یا کجی میں مبتلا ہیں جو ہدایت پر

نہیں ہیں۔ بلکہ گمراہ ہیں۔ یہ دوسرے معنی ہوئے۔ اس طرح مومن و کافر کے لفظوں سے جن لوگوں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اب عالم و جاہل۔ گمراہ اور ہدایت یافتہ کے لفظوں سے پکارے گئے ہیں۔ اب اس آیت کو جس نے یہ لمبی بحث شروع کرادی ہے پھر پڑھیے۔

(آل عمران۔ آیت ۶) هو الذی انزل علیك الكتاب منه آیات محكمات هن أم الكتاب واُخر متشابهات فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله ج وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون آمنا به، كل من عند ربنا ج ما یذكر الا اولوا الالباب ٥ (آیت ۷) ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هدیتنا وهب لنا من لدنك رحمة، انك انت الوهاب ٥

شانِ نزول کے اعتبار سے یہ آیتیں اہل کتاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ تاریخ نزول کے اعتبار سے یہ اس زمانے کی ہیں جب مدینہ میں ہجرت ہو چکی تھی اور رسول اللہؐ کے پاس نصاریٰ نجران کا وفد آیا تھا۔ ابن ہشام نے اسکی تفصیل دی ہے۔ اور ہم اس موقعہ پر اسے بیاں کرینگے۔ سیاق عبارت سے ان آیتوں کو الگ کر کے سمجھنے میں یہی دقت پیش آتی ہے۔ کہ اگر اللہ ہی آیات متشابہات کے معنی جانتا ہے تو بندوں کو ان کے سننے اور نہ سمجھ کر پریشان ہونے کی کیوں تکلیف دی گئی۔ لیکن جب ہم تاریخ و ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورہ کی آیتوں کو پڑھتے ہیں۔ تو مطلب صاف ہو جاتا ہے کہ جو نصاریٰ محض تعریضاً بحث کرتے ہیں اور صرف ایک لفظ روح اللہ یا کلمۃ اللہ کو سن کر باقی تفصیلات سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے دل میں کجی ہے لہذا جو پورا علم قرآن کا رکھتے ہیں اور ہدایت پر ہیں۔ وہی یہ جانتے ہیں کہ قرآن نے مسیح کو الوہیت کا درجہ نہیں دیا۔ اتنی سی بات تھی جس پر دو گروہ بن گئے اور قرآن کے دو حصے کر دیئے گئے

لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ جن آیتوں کو متشابہ سمجھ کر تاویل سے گریز کیا گیا ہے۔ وہ ایسی آیتیں ہیں۔ جن کو سیاق وسباق سے الگ کر کے معنی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تحریر میں بہت سے جملے محکم ہوتے ہیں اور بغیر دوسری عبارت کی مدد کے ان کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ گویا وہ بنیادی جملے یا اُم الکتاب ہوتے ہیں ان محکم جملوں کی جو تشریح ہوتی ہے۔ یعنی وہ جُملے جو بغیر محکم کی مدد کے سمجھ میں نہیں آتے وہ متشابہات ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ متشابہ جملوں کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں۔ جب محکم سے مدد لی جائے گی۔ اُن کے معنی روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیں گے۔

مثال کے طور پر حروف مقطعات کو لیجئے۔ الگ الگ صرف وہ حروف ہیں۔ لیکن بعد کی آیتوں سے مل کر ان کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کے معنوں میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا۔ اب دیکھئے سورہ القلم یوں شروع ہوتی ہے۔ ن والقلم وما یسطرون یعنی نؔ اور قلم اور جو کچھ لکھتے ہیں۔ یہاں نون کے معنی صاف ہیں۔ یعنی دوات۔ یہی معنی بعض اہل لغت اور مفسرین نے بھی دئے ہیں (اخرجہ ابن جریرؒ)

یہاں دوسری دو آیتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک آیت ہے (سورہ ہود - آیت دوم) الرٰ کتابٌ اُحکمت آیاتہ، ثم فصلت من لدن حکیم خبیرہ ان لا تعبدوا الا اللہ۔ یعنی اس کتاب کی آیتیں نہایت جنچی تلی ہیں (محکم ہیں)، اس کے بعد ان کی تفصیل ایک حکمت والے خبردار کی طرف سے کی گئی ہے۔ کہ سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کرو۔ . . ورنہ مجھے ڈر ہے۔ کہ تم پر بڑے دن کا عذاب ہو۔

دوسری آیت ہے اللہ نَزَّلَ اَحسَنَ الحَدِیث کتاباً متشابھا مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم۔ ثم تلین جلودھم و

قلوبھم الیٰ ذکر اللہ (اللہ نے بہترین بات اتاری ہے۔ اس کتاب میں (یہ باتیں) آپس میں ملتی جلتی (متشابہ) ہیں۔ اور بار بار دہرائی گئی (مثانی) ہیں۔ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اسے سن کر ان کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی کھالوں اور دلوں میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کی یاد سے (سورہ الزمر ۳۹۔ آیت ۲۳)

پہلی آیت میں محکم کے لئے فصّلت کا لفظ آیا ہے۔ یعنی ان کو کھول کھول کے بیان کیا گیا ہے۔ دوسری آیت میں متشابہ کے لئے کہا گیا ہے۔ کہ وہ بار بار بیان کی گئی ہیں اور وہ احسن الحدیث ہیں۔ اور اتنی واضح اور صاف ہیں۔ کہ سنتے ہی لوگوں کے دلوں کو موم کر دیتی ہیں۔ ان دونوں آیتوں سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ محکم آیتوں کو تو سب سمجھتے ہیں لیکن متشابہ کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے۔ بلکہ یہاں تو کھول کے بیان کر دیا۔ محکم آیتوں کو تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی تفصیلی باتیں (متشابہات) بار بار کہی گئی ہیں۔ تاکہ یہ باتیں لوگوں کے دلوں میں اتر جائیں۔ پھر پہلی آیت میں یہ بھی بتا دیا کہ بنیادی یا محکم باتوں میں سے ایک تو یہ ہے۔ کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور اس کے آگے دوسری تفصیل ہے۔

غرضیکہ محکم اور متشابہ کا تضاد۔ جو بعض مفسّرین نے قایم کیا ہے اور اس کو بنیادِ تفسیرِ قرآن مانا ہے۔ وہ ان آیات کی روشنی میں قایم نہیں رہتا۔ یعنی محکم اور متشابہ دونوں انسانی سمجھ سے باہر نہیں۔ اللہ اور راسخون فی العلم ان کی تاویل جانتے ہیں اور اسی کی پیروی مناسب ہے۔

تفاسیر پر ایک نظر

غرضیکہ قرآن کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اور اس سلسلہ میں جتنے علوم ہو سکتے تھے سب کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا۔ تفسیروں کا سلسلہ اب تک جاری ہے

لیکن اب ان میں کوئی جدت نہیں پیدا کی جاتی۔ لغت کے سلسلہ میں جو کام پہلے ہو چکا ہے اُسے ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اور زبانوں کا تقابلی مطالعہ ابھی اس درجہ تک نہیں پہنچا کہ قرآن کے جتنے لفظ غریب ہیں۔ یا دوسری زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب واضح ہو جائیں۔ اسکے علاوہ موجودہ علوم کی روشنی میں قرآن کی تاریخی جگہ بھی متعین نہیں ہوئی۔ گویا یہ گوشہ بھی ابھی تشنۂ تفسیر ہے۔ عربی میں جو کام اس سلسلہ میں ہوا ہے۔ اس کا مختصر حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ تفسیر کے متعلق تین قسم کی کتابیں بلحاظ طوالتِ مضمون کے لکھی گئی ہیں۔ لمبی (وجیز) منجھلی (وسیط) اور چھوٹی (لبسیط)۔ ان کی فہرست مفتاح السعادت صـ۴۳۱ میں یوں درج ہے:۔

وجیز	مصنف	نام کتاب	تاریخ وفات	متفرقات
۱	ابن الجوزی	زاد المسیر		
۲	الواحدی	الوجیز		
۳	امام رازی	تفسیر الواضح		
۴	جلال الدین المحلی جلال الدین السیوطی	تفسیر الجلالین		
۵	ابی حیان	النہر		
وسیط				
۱	الواحدی	الوسیط		
۲	محمود الماتریدی	تفسیر الماتریدی	سنہ ۳۳۳ھ سمرقند	رد قرامطہ میں کتابیں لکھی ہیں
۳	الزمخشری المعتزلی	تفسیر الکشاف	سنہ ۴۶۷-۵۳۸ خوارزم	
۴	حسن بن محمد بن عبداللہ الطیبی	تفسیر الطیبی	سنہ ۷۴۳	شرح کشاف لکھی۔ فلاسفہ کا رد کرتا ہے

وسیط ۵	البغوی الشافعی	تفسیر البغوی	سنہ ۵۱۶ بغ خراسان	
	النسفی	تفسیر التیسیر		
بسیط				
۱	احمد الکواشی الموصلی	تفسیر الکواشی تفسیر الکبیر تفسیر الصغیر	سنہ ۶۸۰ موصل	جلال الدین المحلی نے اسی تفسیر پر اعتماد کیا ہے۔ اور بیضاوی و ابن کثیر نے بھی۔
۲	قاضی عبداللہ شیرازی بیضاوی	تفسیر البیضاوی	سنہ ۶۸۵ تبریز	
۳	محمد انصاری خزرجی	تفسیر		
۴	سراج الدین الهندی	تفسیر		اصول فقہ میں مہارت تھی۔
۵	محمد النسفی	تفسیر مدارک التنزیل		علم الاصول کے ماہر تھے۔
۶	الواحدی	بسیط		
۷	راغب اصفہانی	تفسیر الراغب اصفہانی		
۸	ابی حیان	البحر		
۹	ابراہیم السفاقسی	اعراب القرآن	سنہ ۷۴۲ھ	نحوی
۱۰	عبداللہ بن عطیہ	تفسیر ابن عطیہ	سنہ ۳۸۳	اتقان میں ذکر ہے مگر اب موجود نہیں ہے
۱۱	عمر بن علی الخرقی	تفسیر الخرقی	سنہ ۳۳۴ دمشق	
۱۲	علی بن ابراہیم الحوفی	تفسیر الحوفی البرهان فی تفسیر القرآن علوم القرآن	سنہ ۴۳۰	

۱۳	عبد الکریم القشیری	تفسیر القشیری التیسیر فی علوم التفسیر	سنہ ۴۶۵ھ نیشاپور	
۱۴	ابن عقیل المصری	الاملاء الوجیز علی الکتاب العزیز	سنہ ۴۶۹ھ	
۱۵	ابن رزین	تفسیر		
۱۶	الماوردی	تفسیر		
۱۷	مسلم الرازی	تفسیر		
۱۸	عبد الملک الجوینی	تفسیر امام الحرمین	سنہ ۴۷۸ھ	شافعی تھے اُن کی موت کے دن بازار بند ہو گیا تھا۔
۱۹	ابن مرجان	تفسیر	سنہ ۴۲۷ھ	صلاح الدین کیلئے قرآن سے بحساب جفر فتح قدس کا حکم نکالا تھا
۲۰	ابن المنیر	تفسیر	سنہ ۶۸۳ھ مسموم	
۲۱	ابن النقیب	مقدمۃ التفسیر	سنہ ۷۴۵ھ	
۲۲	امالی الرافعی	تفسیر فاتحہ		
۲۳	الکرمانی	الغرائب والعجائب		علم الحدیث
۲۴	ابن بزیزہ	تفسیر		
۲۵	ابن تیمیہ	قواعد	سنہ ۶۲۱ھ	حنبلی
۲۶	فخر الدین رازی	التفسیر الکبیر	سنہ ۵۴۴ھ میں ولادت اور سنہ ۶۰۶ھ میں ہرات میں وفات	شہاب الدین غوری، پھر علاء الدین خوارزم شاہ کے پاس رہے۔ مفتاح الغیب کی شرح لکھی۔ شیخ نجم الدین کبری سے بحث کی۔ جس سے شرح صدر ہوا۔

۲۷	ابی عبدالرحمان السلمی	الحقایق	۴۱۲ھ	ابن عربی نے ان کی ماں سے نکاح کر کے پرورش کی۔
۲۸	محی الدین الکافیجی الحنفی	تیسیر المختصر فی علوم التفسیر)	۸۷۹ھ	

قرآن کو اپنے زمانے کے مطابق بنانے کیلئے تاویلیں کرنا کہاں تک مناسب ہے

قرآن کو اپنے اپنے زمانے کے نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش اکثر لوگوں نے کی ہے۔ اور اس کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ جب وہ مفروضات وہمی یا غلط ثابت ہوئے۔ تو بعد میں آنے والوں نے کہا۔ کہ ہم سے پہلے جو تفسیر بیان کی گئی۔ وہ غلط تھی۔ مفسر کی ذاتی رائے تھی اور حقیقت سے دُور تھی۔

ہماری رائے میں۔ کسی کتاب یا قانون کو اسکے ماحول سے الگ کر کے سمجھنے میں ہمیشہ مختلف رائیں قایم ہو جاتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی اپنی رائے کی پچ کرنے والے نئے نئے گروہ بنا بیٹھتے ہیں۔ اور اصل کتاب کو چھوڑ کر اپنی رائے کو اونچا رکھنے کے لئے طرح طرح کے جھگڑے قایم کر دیتے ہیں۔ اور اپنے ہم خیال بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ پھر یہ ہم خیالی قدامت پرستی کی بنیادوں کو مستحکم کرتی رہتی ہے۔

اگر آپ کسی کتاب یا قانون کو سمجھنا چاہیں تو علمی طریقہ یہی ہے کہ جس ماحول میں، اور جن حالات میں وہ کتاب لکھی گئی یا وہ قانون بنایا گیا۔ اسے کبھی نگاہ سے دور نہ ہونے دیں اسلئے ہمارا قطعی فیصلہ یہ ہے۔ کہ قرآن کے لئے بھی وہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جو ہر علمی اور تاریخی

تحقیقات کے لئے ضروری ہے۔ یعنی اپنی رائے سے تفسیر کرنا اور اپنے زمانے کے نظریات کو جا و بے جا قرآن میں ٹھونسنا، قرآن نہ ہوگا۔ بلکہ اپنی رائے کو قرآن سمجھنا ہوگا۔ امام طحاویؒ نے بھی اسی خیال کے ماتحت تحقیقات کا دروازہ کھولا تھا۔ اور ہم نے سیرت نبوی کے ہر حصہ میں اس رائے کو درج کر دیا ہے۔ اسلئے ہم قرآن کو اپنے زمانے کے مطابق بنانے کے لئے تاویل سے کام لینا مناسب نہیں سمجھتے۔

تیسری فصل

نسب رسول عربیؐ

قدیم زمانے کی کتابوں میں یہ قصہ ملتا ہے۔ کہ ایک زمانہ ایسا تھا۔ کہ کل زمین پانی کے نیچے تھی۔ پانی کے دُور ہونے کے بعد سب سے پہلی متمدن قوم حضرت نوحؑ کی اولاد مانی جاتی ہے حضرت نوحؑ کے چار لڑکے بتائے جاتے ہیں۔ جن سے نسل انسانی دنیا میں پھیلی۔

۱۔ سام۔ سے سامی اقوام۔ (عرب، عبرانی، آرامی، سریانی، خالدی، فونیقی)

۲۔ حام۔ سے افریقی اقوام، (مصری، کنعانی۔ عکادی)۔

۳۔ یافث (یا ایرج) سے ایرین اقوام (ایرانی۔ یورپی۔ ہندی)۔

۴۔ تور سے تورانی اقوام (ترکی۔ چینی۔ منگولی)۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے دنیا پر سامی اقوام کا دور دورہ تھا۔ یہ عرب سے نکل کر دنیا میں پھیلی تھیں اور بابل سے قرطاجنہ تک ان کی حکومت تھی۔ انکو عرب بائدہ (برباد شدہ) بھی کہتے ہیں۔

عرب کا قدیم ترین قبیلہ جرہم تھا۔ جو عیلام بن سام کی اولاد سے ہے۔
عملیق بن لود بن سام کی اولاد بھی عرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان عمالقہ نے ایک زمانے میں مصر کو

فتح کرلیا تھا۔ اور حی عکسو (چرواہے بادشاہ) کے نام سے مشہور تھے۔

عاد (یا عوض) بن ارام بن سام کی اولاد عاد اولیٰ کہلاتی ہے۔ یہ مشرقی اور جنوبی عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ یمن میں ان کی قدیم عمارتوں کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ یہ قوم نوح کے جانشین تھے۔ ان کی تباہی کے بعد قوم ثمود انکی جانشین ہوئی، عاد کی حکومت بابل تک پھیلی ہوئی تھی۔

ثمود بن جثر بن سام کی اولاد کو قوم ثمود (یا عاد ثانی) کہتے ہیں۔ حجاز سے شام جاتے ہوئے انکے مکانات کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ یہ پہاڑوں کو تراش کر مکان بناتے تھے۔ انکا مسکن مغربی اور شمالی عرب تھا۔

حضرت ہودؑ (عابر) بن شالح بن ارفخشد بن سام کے دو بیٹے تھے۔ فلج اور یوقطان (یا قحطان) (پیدائش باب ۱۰) یہ لوگ جنوبی عرب میں آباد تھے۔ حضرموت اور سبا یہاں کے مشہور مقام تھے۔

حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت ہود کی چھٹی پشت میں تھے۔

(۱) عرب بائدہ (عاربہ) کی تاریخ موجود نہیں۔ یہ قدیم ترین باشندے تھے۔

(عمالق۔ عاد۔ ثمود۔ جرہم۔ طسم۔ جدیس)

(۲) عرب متعربہ (بنو قحطان: کہلان و حمیر)

(۳) عرب مستعربہ (بنو اسماعیل یا عدنانی) رسول اللہ۔

(رومی اثر)
(غسانیہ)
تدمر
شام
عرب

عرب
(عمالقہ)، (بنو لخم)، (ایرانی اثر)

نسب رسول عربی صلعم

رسول عربی صلعم کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتا ہے لیکن عدنان تک آپکا نسب پورے طور پر معلوم ہے۔ اس سے پہلے کے نسب نامے کے متعلق آنحضرتؐ نے خود فرمایا ہے۔ کہ زیادہ تحقیق فضول ہے

حضرت ابراہیمؑ: (تقریباً پانچہزار سال پہلے) خالدیہ (عراق) کے اندر ایک قصبہ اُرؔ کے باشندے تھے۔ یہ ملک اس زمانے بہت متمدن ہو گیا تھا۔ بابل کے شہنشاہ حمورابی نے اسی زمانے میں جو قانون" دنیانی مشعرم" مرتب کیا تھا۔ اس میں وہ بنیادی قوانین موجود ہیں جو بعد میں توراۃ میں داخل کر لئے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے قبیلے کے شیخ تھے اور ایک بڑے خیمے میں ان کا دربار لگا کرتا تھا۔ وہیں خاندانی اور قبائلی معاملات طے ہوتے تھے اور وہیں سے لوگوں کو اجناس تقسیم ہوتی تھیں۔ ان کے پاس بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے گلّے تھے۔ اور موجودہ گوالوں اور چرواہوں کی طرح وہ بھی ایک چراگاہ سے دوسری تک پھرا کرتے تھے ؂

بابل سے ہجرت۔ بابل کے ہر شہر میں بت پرستی رائج تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسکے خلاف آواز اٹھائی۔ تو انہیں آگ میں پھینک دیا گیا۔ ممکن ہے کہ وہ آتشکدے میں پھینکے گئے ہوں۔ جو ہر بتخانے میں سوختنی قربانی کے لئے جلا کرتی تھی۔

اقوام عرب (۲۰۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ ق م تک) عرب کے شمالی حصے میں بنی اسمٰعیل اور جنوبی حصے میں بنی قحطان رہتے تھے۔ ان سے پہلے عرب کے اصلی باشندے عرب عاربہ کہلاتے تھے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ شدعاد اور لقمان کے زمانے میں یہ قوم عاد اولیٰ کے نام سے پکاری جاتی تھی اور یہ لوگ شہر بابل پر ۲۲۱۸ ق م میں قابض ہو گئے تھے اور یہی لوگ ہندوستان بھی آئے تھے (تاریخ عرب۔ سیدی یو) جہاں غالباً سندھ (مہنجے درو) والوں پر ان کا اثر پڑا ہوگا۔ اور مصر میں بھی

چرواہے بادشاہ (ہکسوس) عمالقہ کے نام سے صدیوں حکومت کرتے رہے تھے۔ کہا جاتا ہے بنی قحطان نے انہیں یمن سے نکالا تھا۔ ان قدیم عربوں کے قبیلے عاد۔ ثمود۔ طسم۔ جدیس۔ عمالقہ، امیم۔ جرہم۔ حضرموت۔ حضورا۔ سلف، عبیل، عبد بن ضخم کہلاتے تھے۔

عاد کی حکومت یمن اور عمان کے درمیان تھی۔ ان پر ہودؑ نبی بھیجے گئے تھے۔ عبد بن ضخم کی اولاد طائف میں رہتی تھی۔ اور انہی کو عربی خط کا موجد بتایا جاتا ہے۔

ثمود بن کاثر بن ارم کا ملک حجر اور وادی القریٰ شام و حجاز کے درمیان تھا۔ یہ پہاڑوں کو کاٹ کر مکانات بناتے تھے۔ حضرت صالحؑ ان کے نبی تھے۔

پرانے عربوں (عرب عاربہ یا عرب بائدہ) کی تباہی کے بعد مصنوعی عرب (عرب مستعربہ) یعنی قحطان کی اولاد یمن میں پھیلی۔ ان میں عاد اور جرہم قبیلوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ یہ عاد ثانیہ ہیں۔ بنی جرہم نے یمن سے آ کر حضرت اسماعیل سے معاہدہ کر لیا اور مکہ میں رہنے لگے۔

عرب تابعہ یعنی اولاد اسماعیل بھی قحطانیوں کی طرح سامی النسل ہیں۔ حضرت اسماعیل کی شادی مضاض رئیس جرہم کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اور ان کی اولاد مدنی اور بدوی (شہری اور دیہاتی) دونوں زندگیاں بسر کرتی تھی۔ بدویوں کی معاش مویشیوں پر منحصر تھی۔ بخت نصر نے ان ہی پر حملہ کیا تھا اور بہتوں کو قتل کر ڈالا تھا اور ارمیاہ نبی کے حکم کے مطابق عدنان کے سوا دوسرے عربوں پر بھی بخت نصر نے پھر حملہ کیا تھا اور عرب کے تاجروں کو جو بابل میں موجود تھے قید کر لیا۔ اور حیرہ میں لے جا کر آباد کر دیا۔

بخت نصر کے مرنے کے بعد مَعد بن عدنان زندہ تھا۔ عرب کی حالت تباہ تھی۔ معد نے بنی جرہم میں شادی کی۔ اور نزار پیدا ہوا۔ نزار کے بیٹے ربیعہ، مضر اور ایاد کی اولاد کو

بہت ترقی ہوئی اور وہ عراق و شام تک پھیل گئے۔ قبیلہ مضر سے قریش پیدا ہوا۔ اور قریش کی اولاد میں رسول عربیؐ پیدا ہوئے۔ شجرہ یہ ہے :۔

عدنان ← معد ← نزار ← مضر ← الیاس ← مدرکہ ← خزیمہ ← کنانہ ← نضر ← قریش ← مالک ← فہر ← غالب ← لوی ← کعب ← مُرّہ ← کلاب ← قصیّ

حضرت اسمٰعیلؑ

حضرت ابراہیمؑ کو مصر کے بادشاہ نے ایک عورت ہاجرہ نامی پیش کی تھی ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی پہلی بیوی سارہ لاولد تھیں۔ بعد میں ان کے بطن سے اسحاقؑ پیدا ہوئے تھے۔ سوتیاڈاہ کی وجہ سے بی بی سارہ نے بی بی ہاجرہ کو مع حضرت اسمٰعیلؑ کے جلاوطن کرا دیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ انہیں مکے کے مقام پر چھوڑ گئے اور وہاں ایک معبد بنا دیا تھا۔ جو اب تک کعبہ کے نام سے مشہور ہے۔

مکہ میں ایک بڑا چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔ اسلئے یہاں قدرتاً لوگ آباد ہو گئے تھے۔ یہ قبیلۂ جرہم کے لوگ تھے۔ جوان ہونے پر حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی اسی قبیلے کے شیخ کی لڑکی سے ہوئی۔ یہاں کی عبادت گاہ چرواہوں اور مسافروں کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ اور اس عبادت گاہ کا نام کعبہ تھا۔ جو لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں برابر (مکعب) تھی۔ اس زمانے میں عبادت کا یہ طریقہ تھا۔ کہ 'خدا کے گھر' کے چاروں طرف چکر لگایا جائے اور کچھ نذر پیش کی جائے۔ چکر غالباً اسلئے لگاتے تھے کہ خدا ہر طرف موجود ہے اور نذر اسلئے چڑھاتے تھے کہ پجاریوں کی ایک جماعت قایم رہے اور وہ معاش سے بے فکر ہو کر خدا کی عبادت کے طریقوں کو بتاتے رہیں اور خدا کے گھر کی حفاظت اور مرمت کرتے رہیں۔ کعبہ میں طواف کرنے کے لئے

غالباً اس کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ کہ کس جگہ سے طواف شروع کیا جائے لہٰذا دو دیواروں کے کونے میں ایک پتھر نصب کر دیا گیا تھا۔ اسی کو حجر اسود کہتے ہیں۔ یہ پتھر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں لگایا گیا تھا۔ اسکا رُخ ٹھیک مشرق کی طرف ہے۔ یعنی جب اعتدالِ ربیعی ہوتا ہے۔ تو آفتاب کی شعاعیں ان دونوں دیواروں کو جن کے کونے میں حجرِ اسود لگا ہے روشن کر دیتی ہیں۔ یہی موسمِ حج کا زمانہ ہوتا ہے اور یہودیوں، عربوں اور ایرانیوں میں نیا سال اسی زمانے سے شروع ہوتا ہے۔



حضرت اسمٰعیل کی قربانی اور اسلام

قدیم زمانے میں جانوروں کی قربانی، اور پھل پھول اور اناج کی قربانی کے علاوہ انسانی قربانی بھی جاری تھی۔ لوگ اپنی عزیز ترین چیزوں کو خدا کے نام پر قربان کر دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ چیز خدا تک پہنچ جاتی ہے اسی لئے جب حضرت ابراہیمؑ نے بار بار یہ خواب دیکھا کہ اپنی عزیز ترین شے کی قربانی کرو تو انہوں نے بقولِ قرآن اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ سے خواب کا ذکر کیا اور وہ خوشی سے قربان ہونے کو تیار ہو گئے (توراۃ میں حضرت اسحٰق کو بڑا بیٹا تسلیم کیا گیا ہے اور اسمیں انکی قربانی کا ذکر ہے جسمیں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے اسحٰق کو دھوکہ دیکر باندھ دیا اور انکی مرضی کے خلاف ایندھن پر رکھ دیا کہ جل کر قربان ہو جائیں) اور اسی لئے اسلام کو دینِ حنیف یا دینِ اسلام بھی کہتے ہیں۔ اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں یعنی حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے سامنے گردنِ تسلیم خم کی اور حضرت اسمٰعیلؑ نے بھی اپنے والد سے سنکر خدا کے حکم کی اطاعت پر رضامندی ظاہر کی۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تمہارا نام مسلم رکھا تھا (هو سماكم المسلمين) اور پھر کہا ہے۔ کہ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی بلکہ حنیف مسلم تھا۔ اور مشرکوں میں سے نہ تھا (ما كان ابراهيم يهوديا ولا نصرانيا ولكن كان حنيفا مسلما وما كان من المشركين ق)

اولادِ اسمٰعیلؑ: حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ توراۃ میں انکے متعلق پیشنگوئی ہے۔ کہ یہ بارہ رئیس ہونگے (۲۰۔ کتاب پیدائش ۱۷ ب) اور رفتہ رفتہ یہ اتنے بڑھے کہ پورے عرب پر" بحر احمر سے فرات تک چھا گئے" (یوسفوس۔ انٹی کوئی ٹیز)

اولادِ قطورہ: حضرت ابراہیم کی ایک اور بیوی قطورہ تھی۔ انکی اولاد بھی حجاز سے بحر احمر تک پھیلی ہوئی تھی۔ مدین میں انکے پاس شعیبؑ نبی بھیجے گئے تھے۔ ۳۶ اعراف۔

اولادِ عدنان

حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں قیدار بہت مشہور تھے اور قیدار کی اولاد میں عدنان تھے۔ عدنان سے رسولِ عربی تک اکیس پشتیں ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عدنان کے زمانے میں یعنی ۶۰۰ ق م میں ارمیاؑ اور برخیاہ نبیوں نے شہنشاہ بخت نصر کو آگاہ کیا تھا کہ وہ عدنان پر حملہ نہ کرے (تاریخ عرب۔ از پروفیسر سیدی او) عدنان کے دو بیٹے تھے معد اور عک۔ عک نے یمن میں اپنی سلطنت قایم کی تھی۔

معد کو حضرتِ ارمیاہ اپنے ساتھ شام لیگئے تھے۔ وہاں سے واپس آکر بنو جرہم کو تلاش کر کے اس قبیلے میں شادی کی۔ ان کا لڑکا نزار تھا۔

نزار سے امام احمد بن حنبلؒ کا سلسلہ ملتا ہے۔ انکے بیٹے مُضر تھے۔

مُضر حجاز کے امیر کبیر تھے۔ ان سے الیاس پیدا ہوئے۔

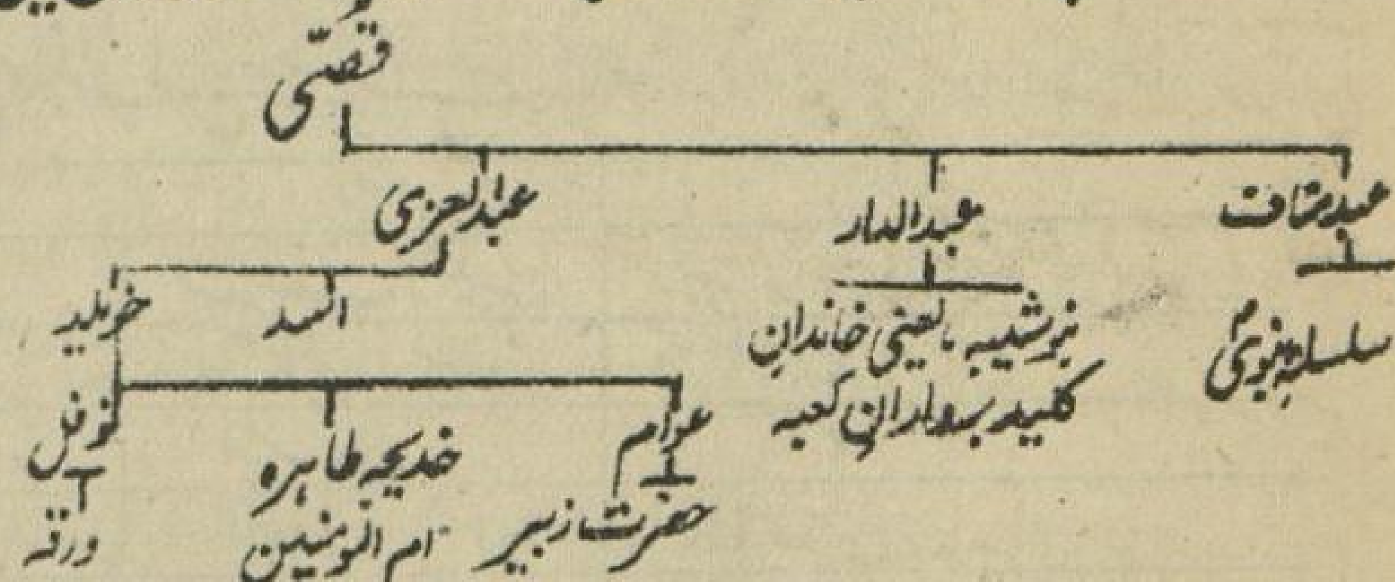
الیاس سے مدرکہ، مدرکہ سے خزیمہ، خزیمہ سے کنانہ پیدا ہوئے۔

بنو کنانہ| صحیح مسلم میں ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ اللہ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں سے اسمٰعیلؑ کو برگزیدہ کیا اور اسمٰعیلؑ کی اولاد سے بنو کنانہ کو اور بنو کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو اور قریش میں بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے ممتاز فرمایا۔ ان کے ایک لڑکے نضر تھے۔

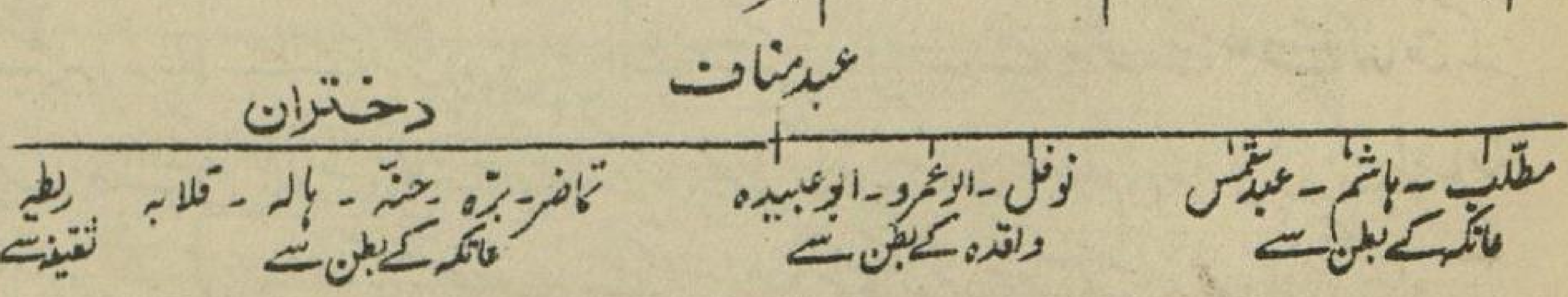
نضر کا صرف ایک لڑکا مالک پیدا ہوا۔ مالک کے دو لڑکوں میں سے ایک کا نام فہر یا قریش تھا۔

فہر (قریش) انکے زمانے میں یمن کا حاکم حسان خانہ کعبہ کو ڈھانے فوج لیکر آیا۔ فہر نے مقابلہ کیا۔ اُسے شکست ہوئی اسوقت سے انکا لقب قریش (یعنی وھیل مچھلی) ہو گیا۔ اولادِ فہر کو بھی قریش کہتے ہیں۔ فہر کا ایک لڑکا غالب تھا۔

غالب کا ایک لڑکا لوئی تھا۔ انکا ایک لڑکا کعب تھا۔ انکی پیدائش سے سنہ کا شمار ہوتا تھا۔ اور واقعۂ فیل سے تقریباً چار صدی پہلے تک جاری رہا۔ کعب کا ایک لڑکا مرہ تھا حضرت ابوبکرؓ کا چھ پشت پہلے اُنسے سلسلہ ملتا ہے۔ انکا ایک لڑکا کلاب تھا اور انکے دو لڑکوں میں سے ایک قصی تھا



عبد مناف نہایت جمیل تھے۔ قمر البطحا لقب تھا۔ مناف (یا مناة) ایک دیوی تھی۔ جسکے نام پر انکی ماں نے ان کا نام رکھا تھا۔ اصلی نام مغیرہ تھا۔



بنو المطلب: المطلب عبد مناف کے چھوٹے بیٹے تھے انکے تین بیٹے صحابی تھے۔ عبیدہؓ (شہید بدر) طفیل اور حصین (المتوفی ۳۳ھ) عبد مناف کے مرنیکے بعد ہاشم سردار قوم مقرر ہوئے۔ اور ہاشم کے مرنیکے بعد چونکہ انکے لڑکے نابالغ تھے المطلب نے سرداری سنبھال لی تھی اور ہاشم کا بیٹا عبد المطلب (شیبہ) مدینے میں تھا۔

بنو ہاشم۔ ہاشم کا نام عمرو ہے۔ عبد مناف کے بعد سردار قوم ہوئے۔ انکے بھتیجے امیہ نے مخالفت کی۔ آخر عسفان کا ایک کاہن حکم مقرر ہوا۔ اُسنے مفاخرت میں ہاشم کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہاشم ہی نے قیصر روم سے یہ فرمان حاصل کیا کہ قریش کے مال پر شام میں کوئی محصول نہ لیا جائے۔ یہ بڑا فیاض تھا اور قحط کے زمانے میں لوگوں کو روٹیاں ہشم (ٹکڑے ٹکڑے) کرکے شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھلایا کرتا تھا اور وہی سردار قوم تھا۔ انکا لڑکا شیبہ (عبد المطلب) تھا۔

عبد شمس۔ اسکا لڑکا اُمیہ تھا۔ اسنے ایکدفعہ باجازت ہاشم دعوت حجاج کرنا چاہی لیکن پورا حق ضیافت ادا نہ کرسکا اسلیئے مفاخرت میں ہاشم سے نہ بڑھ سکا اور مفاخرت میں شکست کھانیکے بعد مکہ سے شام جلاوطن ہونا پڑا۔ ہاشم کے مرنیکے بعد واپس آیا۔ امیہ کا لڑکا حرب تھا۔ اسے بھی بنو ہاشم سے عداوت رہی۔ حرب کا بیٹا ابو سفیان تھا جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔

بنو نوفل۔ جبیر رض بن مطعم بن عدی کا نسب ان سے ملتا ہے۔

بنو ہاشم

	زوجہ	لڑکا	لڑکی
۱	سلمیٰ بنجاریہ	عبد المطلب (شیبہ)	رقیہ (بچپن میں مرگئی)
۲	ہند خزرجیہ	ابا صیفی (صیفا)	x
۳	قیلہ عامریہ	اسد	x
۴	اُسیمہ دیناریہ	نضلہ	شفاء
۵	واقدہ (مازنیہ)	x	ضعیفہ۔ خالدہ
۶	ندہ ثقفیہ	x	حنّہ

ہاشم کی وفات کے وقت شیبہ نابالغ تھے اور یثرب (مدینہ) میں اپنی ننھیال میں رہتے تھے۔ انکا نام عامر اور لقب شیبہ (بڈھا) ہے اسلیئے کہ بچپن ہی میں انکے سر کے چند بال سفید تھے۔ ہاشم نے المطلب سے کہا تھا کہ میرا ایک لڑکا مدینے میں ہے لیکن المطلب اس بات کو شاید بھول گئے تھے اور اپنی قوم کی سرداری پر فائز رہے۔ اسطرح دس سال گزر گئے۔ آخر کار انسے ایک شخص نے بتایا کہ مدینے میں ہاشم کا ایک لڑکا موجود ہے۔ مطلب وہاں سے گئے اور اسے لے آئے۔ مکہ والوں نے شیبہ کو انکے پیچھے بیٹھا ہوا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون ہے۔ تو انہوں نے کہا ایک غلام ہے۔ لوگوں نے اسکا نام عبد المطلب مشہور کردیا۔ اور المطلب کے مرنیکے بعد وہ سردار قوم ہوا۔

عبد المطلب (۴۹۷ء۔ ۵۷۹ء) ... بے مثال سخاوت میں عبد مناف کی طرح تھے ان ہی کے زمانے میں اصحاب فیل نے

نوٹ۔ بنو ہاشم اور بنو المطلب دونوں شعب ابو طالب میں محصور کر دیئے گئے تھے اور رسول اللہ نے یہ حق اپنے خاندان کیلیئے رکھے تھے وہی بنو المطلب کیلیئے بھی رکھے [illegible]

مکہ پر حملہ کیا تھا۔ حمیر کے مرنے کے بعد حبشہ کے بادشاہ یمن پر مسلط ہو گئے تو ابرہہ یمن کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے یمن میں ایک بڑا گرجا بنایا۔ اور اپنے گرجے کی زیارت کو ترقی دینے کیلئے خانہ کعبہ کو تباہ کرنا ضروری سمجھا لیکن اسی زمانے میں ایک کنانی (بنو کنانہ میں سے) جس کے خاندان میں اوقات حج بتانا اور قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنا تھا آیا، اور اس نے گرجے میں قضائے حاجت کی اور اسے گندا کر دیا۔ ابرہہ نے غصہ میں آ کر ایک لشکر جرار تیرہ زنجیر ہاتھیوں کے ساتھ مکے پر حملہ کر دیا جب وہ طائف پہنچا تو اسود بن مقصود مکے گیا اور لوگوں سے بہت سا مال لیکر ابرہہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اسنے کہا۔ مجھے مال متاع کی ضرورت نہیں ہیں صرف کعبہ کو ڈھانا چاہتا ہوں، عبدالمطلب اس قاصد کے ہمراہ ابرہہ کے پاس گئے اسنے اپنے برابر بٹھایا اور آنے کی وجہ پوچھی عبدالمطلب نے کہا میرے بہت سے اونٹ تمہارے آدمیوں نے گرفتار کر لئے ہیں انہیں چھڑانے آیا ہوں، ابرہہ کو تعجب ہوا اور بولا کہ میں تو سمجھا تھا کہ تم خانہ کعبہ کو ویران نہ کرنے کیلئے کہو گے۔ عبدالمطلب نے کہا۔ کہ میں اونٹوں کا مالک ہوں صرف انہیں چاہتا ہوں، خانہ کعبہ کا بھی ایک مالک (رب) ہے۔ وہ خود اسکی حفاظت کریگا۔ ابرہہ نے اونٹ واپس کرا دئے اور محمود ہاتھی کو آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا وہ کعبہ کیطرف بڑھتا تھا لیکن دوسری سمتوں میں بھاگتا تھا۔ اسی دوران میں ابرہہ کے لشکر میں کنکریاں برسنے لگیں، ہاتھی بھاگے لشکر میں چیچک میں مبتلا ہو گئے اور ابرہہ کو بری طرح ہزیمت ہوئی اور جتنا مال و اسباب وہ چھوڑ کر بھاگے تھے وہ نصیب قریش ہوا۔ یہ سنہ ۵۷۵ء سے ۵۷۶ء تک قریش کے سردار رہے۔

بیویاں عبدالمطلب

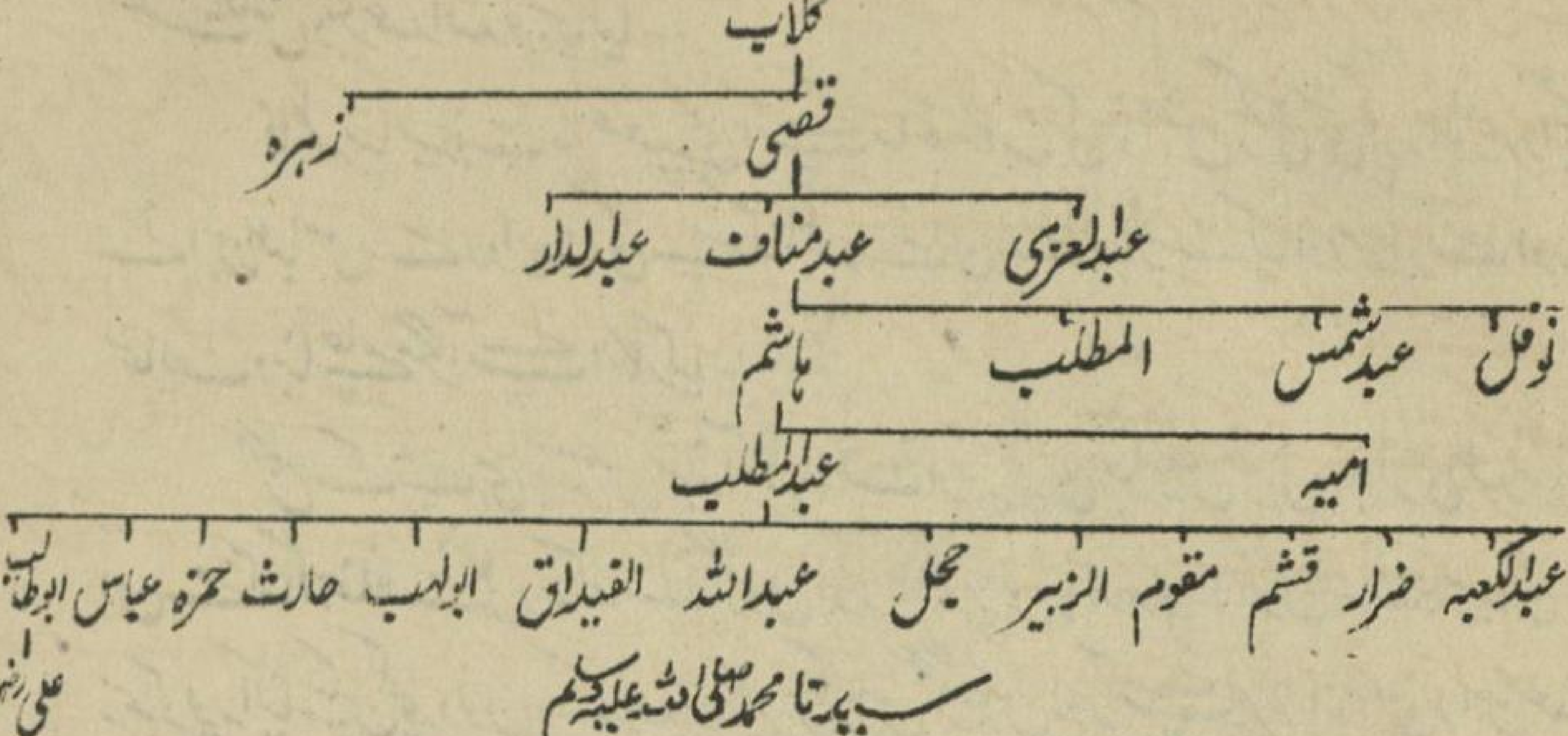
	نام زوجہ	لڑکا	لڑکی
۱	صفیہ بنت جنیدب (نضریہ)	حارث۔	
۲	فاطمہ بنت عمرو (مخزومیہ)	زبیر۔ ابوطالب۔ عبدالکعبہ۔ عبداللہ	ام حکیم۔ البیضا۔ امیمہ اروی۔ برہ۔ عاتکہ
۳	لبنیٰ بنت ہاجرہ (خزاعیہ)	عبدالعزیٰ (ابولہب)	
۴	ہالہ بنت وہیب بن عبد مناف بن زہرہ	(مقوم) حجل۔ مغیرہ۔ حمزہ	صفیہ
۵	نتیلہ (نمریہ)	ضرار (قثم) عباس	
۶	منعمہ (خزاعیہ)	(غیداق) مصعب	

بعض کا قول ہے کہ غیداق کا دوسرا نام (حجل) تھا عبدالکعبہ کا (مقوم) تھا اور عبدالعزیٰ کو ابولہب کہتے تھے اسلئے کہ اسکا چہرہ سرخ آتشین تھا۔ اور قثم کوئی نہ تھا بعض کا قول ہے کہ صرف دس لڑکے تھے۔ یہ قول راجح ہے۔

زمزم اور الہام

عبدالمطلب نے سنا تھا کہ کعبہ کے قریب ایک کنواں تھا۔ جسکا نام زمزم تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس جگہ ہے اس کنویں کو عمرو بن حرث جرہمی نے پاٹ دیا تھا۔ آخر ایک روز خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ کہ "اٹھ، زمزم کو کھود اسجگہ تیرے باپ اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ کا کنواں ہے"۔ خواب سے بیدار ہونے پر نہ معلوم ہوا کہ مقام زمزم کہاں ہے۔ اسی طرح پھر خواب میں دیکھا کہ اسجگہ ہے جہاں کوا چونچیں مارے۔ وہاں کنواں کھودنا شروع کیا۔ لیکن چونکہ کوئی ساتھ دینے والا نوجوان لڑکا نہ تھا اسلئے خدا سے نذر مانی۔ کہ اگر میرے دس بیٹے ہو جائیں گے۔ تو ان میں سے ایک کو تیرے لئے قربان کرونگا خدا کی شان کہ دس بیٹے ہو گئے۔ زمزم کی وجہ سے انکی سیلوت چمک اٹھی تھی اور کافی دولتمند ہو گئے تھے۔ اب بیٹوں کی بدولت خاندانی گروہ بندی میں بھی اضافہ ہو گیا اور عبدالمطلب نے نذر پوری کرنا چاہی۔ قرعہ ڈالا۔ تین مرتبہ عبداللہ کے نام پر نکلا۔ ابو طالب عباس اور دوسرے بھائی بہن التجا کرنے لگے کہ ایسا نہ کیجئے۔ دوسرے لوگ درمیان میں پڑے اور کہا کہ آپ بہترین قریش ہیں اگر آپ ایسا کرینگے تو یہ رسم جاری ہو جائیگی اور قریش کا نام دنیا سے مٹ جائے گا۔ آخر کار ایک بڑی کاہنہ (عرافہ) کے پاس گئے اسنے کہا کہ ایکطرف عبداللہ اور دوسری طرف دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو۔ اور جبتک اونٹوں پر قرعہ نکلے دس کی تعداد (جو اس زمانے میں ایک انسان کا خونبہا تھی) بڑھاتے جاؤ۔ ایسا ہی کیا گیا۔ حتیٰ کہ سو اونٹوں پر قرعہ نکلا۔ عبداللہ کی جان بچی اور اس وقت سے ایک حُر (آزاد انسان) کی جان کا خون بہا سو اونٹ قرار پائے اسی لئے رسول عربی نے فرمایا ہے کہ میں ابن الذبیحین ہوں یعنی ابن اسمٰعیلؑ و ابن عبداللہ۔

اوپر کے قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی قربانی کی رسم کسی نہ کسی صورت میں اس زمانے میں رائج تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق رؤیائے صادقہ بھی گو ایک قسم کی وحی من عنداللہ ہے لیکن وہ ایسے لوگوں پر بھی نازل ہو سکتی ہے۔ جو کسی مستند الہامی مذہب کے پیرو نہ ہوں۔ جیسا کہ جناب عبدالمطلب تھے۔



جناب عبداللہ ذبیح اللہ

(سنہ ۵۴۵ء تا سنہ ۵۷۰ء)

قربانی سے نجات پانے کے چند دنوں بعد عبداللہ بن عبدالمطلب کا نکاح بی بی آمنہ سے کر دیا گیا۔ بی بی آمنہ کے والد کا نام وہب تھا۔ یہ بنی زہرہ کے ایک شیخ تھے۔ شجرہ یہ ہے۔ وہب بن عبدالمناف، بن زہرہ بن کلاب (قریشی) ان کی قریش میں عزت کی جاتی تھی۔

بعض کتابوں میں یہ روایت ہے۔ کہ قوم یہود کو علم ہو گیا تھا کہ جناب عبداللہ سے رسولِ عربی پیدا ہونگے اسلئے چند یہودیوں نے جبکہ وہ شکار میں تھے انہیں قتل کر ڈالنا چاہا۔ اتفاق سے وہب بن عبدمناف اسی میدان میں شکار کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جب یہودیوں نے عبداللہ پر حملہ کیا تو حمیت وطنی کے لحاظ سے انہیں بچانے کیلئے آگے بڑھے اور بعض کا خیال ہے کہ بیچ بچاؤ کا ارادہ تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بعض شخص ابلق گھوڑوں پر سوار نمودار ہوئے اور یہودیوں کو

شکست فاش دیکر عبداللہ کو بچا لیا۔

فاطمہ شامیہ بنت مر الخثعمیہ بھی آپ کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتی تھی اور ابونعیم و ابن عساکر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ فاطمہ نے ان سے اظہار محبت کیا اور سو اونٹ اور دیگر تحائف دینا چاہے مگر آپ نے انکار کیا۔

نکاح کے پہلے ہی ہفتہ میں سیدہ آمنہ امانت دار نور محمدی ہو گئیں تھیں۔ بوڑھی عورتوں نے ان سے کہا کہ حفاظت حمل کے لئے گردن اور بازو پر لوہا باندھ لو۔ انہوں نے جاہلیہ کی اس رسم کو پورا کیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ چیزیں کہیں گر گئیں اور آپ نے پھر نہ باندھیں (ابن سعد طبقات)

نکاح کے چند روز بعد جناب عبداللہ شام بغرض تجارت چلے گئے۔ واپسی کے وقت مدینہ میں قیام کیا۔ تاکہ عبدالمطلب کے حکم کے مطابق کھجوریں خریدیں لیکن بیمار ہو گئے۔ اور عین نوجوانی میں انتقال فرمایا۔ محمد عربی ہنوز شکم مادر ہی میں تھے۔ آپ نے پانچ اونٹ، چند بھیڑیں، ایک حبشی کنیز برکت (ام ایمن) ترکے میں چھوڑیں۔ اور حارث بن سراقہ العدوی کے مکان میں دفن ہوئے۔ حارث عبدالمطلب کے ماموں تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ نابغہ کے مکان میں مدفون ہوئے۔ یہ بنو نجار میں سے تھے +

تیسرا حصہ ختم

A.R. Grt

حصہ چہارم

حیات سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ولادت سے بعثت تک

فہرست مضامین حصّہ چہارم

پہلی فصل

عرب کی ذہنی بیداری

(چھٹی صدی مسیحی میں)

جس طرح مسیحؑ سے چھ سو سال پہلے دنیا میں ترقی کی ایک لہر آئی تھی اور بابل، ہند، مصر، یونان دماغی بیداری سے لطف اٹھا رہے تھے، اسی طرح مسیحؑ سے چھ سو برس بعد کا زمانہ بھی تاریخ عالم میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ حکمت و تاریخ کے ماہروں کا نظریہ ہے کہ دنیا والے مصیبت میں گھر جاتے ہیں، تو قدرت انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی کوشش کریں۔ اور اسی کوشش میں فلسفہ و حکمت کے ساتھ ساتھ حقیقی اور سچا علم، جو ہمارے مشاہدہ اور تجربہ پر قائم ہوتا ہے نشو و نما پانے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس طرح کے علم کو 'سائنس' کہتے ہیں۔

چھٹی صدی کی دنیا، زخموں سے چور تھی۔ جنگ، وبا، مذہب، قدامت پرستی، عجائب پرستی اور غلامی نے انسانیت کا خون چوس لیا تھا۔ شہنشاہیت کا لازمی نتیجہ جنگ تھا۔ مذہب سیاست کا غلام بن چکا تھا، اس لئے قدامت پرستی ناگزیر تھی۔ تلاشِ علم، جو تلاشِ حق کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے ناممکن تھی کہ یہ مذہبی اجارہ داروں کی ذاتی ملکیت بن گئی تھی۔ انسان کا دماغ اور اس کا جسم دونوں مذہب اور حکومت کے قوانین سے جکڑے ہوئے تھے!

لیکن، اس زمانے میں صرف ایک ملک تھا، جس پر نہ کسی کی کبھی حکومت ہوئی تھی، اور نہ

کسی خاص مذہب کی پابندی نے لوگوں کو مجبور بنایا تھا ۔ یہ ملک عَرَب تھا ۔ وہاں مختلف مذاہب باہر سے آئے تھے ۔ مجوس اور یہود و نصاریٰ ملک کے مختلف زرخیز حصوں پر قابض تھے اور وہاں ان کا مذہب بھی پھیل رہا تھا ، لیکن حجاز ان مذاہب کی وبا سے محفوظ تھا ۔ اور حجاز میں بھی خصوصیت سے وہ "وادی غیر ذی ذرع" اپنی اصلی اور نیچرل سادگی پر باقی تھی جس میں مسیحؑ سے دو ہزار سال پہلے ایک بیت اللہ (عبرانی بیت اِل) بن چکا تھا ۔

مکہؐ یمن و ہند کی تجارت کا مرکزی سٹیشن تھا ۔ اس لئے یہاں ہر ملک کے لوگ آتے تھے ، اور خدا کے گھر کی زیارت کے بعد اپنے مزدوروں کو بدل کر رومی اور ایرانی بازاروں کا رُخ کر دیتے تھے اس طرح مکہ والے نہ صرف پُورے عرب کے حالات سے واقف تھے بلکہ اپنے تجارتی سفروں کی وجہ سے اس زمانے کی تجارتی دنیا کے حالات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے ۔ ہندوستان کے مغربی ساحل سے پرانے تعلقات تھے ، اس لئے وہاں کی معلومات بھی تھیں ۔ سندھ کا تمدّن بابلی تمدّن سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا ۔ اور اُن کے تعلقات عراق اور یمن سے تھے ۔ یمن سے مکہ اور مکہ سے شام ، مصر ، عراق اور حبشہ تک بہت بڑی آمدورفت تھی اور ہر ملک کے مذہبوں اور تہذیبوں سے واقفیت ہونا تعجب کی بات نہیں تھی ۔

پانچویں اور چھٹی صدی میں قریش کے تعلقات سب ملکوں سے بڑھ گئے تھے ، اور مختلف وجوہ سے بحر احمر کی جہازی تجارت تقریباً بند ہو گئی تھی ، اور خشکی کے راستے پھر آباد ہو گئے تھے اور وادیٔ مکہ میں پھر قافلوں کے پڑاؤ ہونے لگے تھے ۔ اِن سَو ، دو سَو برسوں کے اندر دیکھنے والی آنکھوں ، اور سوچنے والے دلوں نے کیا کیا نہ دیکھا اور سوچا ہو گا ۔ ان متلاشیانِ حق کے متعلق ہم آگے لکھیں گے لیکن ان کے متعلق لکھنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ اِن لوگوں میں سے کسی میں یہ جرأت نہ پیدا ہوئی کہ وہ جس چیز کو حق سمجھتے تھے اُس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ، یا ایک نیا گروہ بناتے ۔ اِسی

لئے یہ سمجھنا کہ کُل عرب ایک نئی تعلیم قبول کرنے کے لئے تیار تھا، بڑی حد تک غلط ہے۔ ڈاکٹر شپرنگر نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" (صفحات ۳۹ تا ۴۹) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرتؐ نے "اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ انہوں نے اُن عناصر کو جو عرب میں باہر سے آئے تھے، یا وہیں پیدا ہوئے تھے، ایک جگہ جمع کر دیا، اور بجائے اس کے کہ وہ عرب کو اپنے خیالات کے مطابق بناتے خود اس زمانے کی طاقتور روح کی رَو میں بہ گئے"۔ وہ آگے لکھتا ہے: "اسلام محمدؐ (صلعم) کا کام نہیں ہے۔ نہ اس مذہب کے عقائد اُن کے بنائے ہوئے ہیں" (ص ۱۷۵) اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم مسیحیت اور نصرانیت سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن جو چیزیں مسیحیت کے خلاف ہیں ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس مصنوعی نبی نے اس تعلیم کو اپنی بداخلاقی اور ذہنی پستی کی وجہ سے ملوث کر دیا ہے (ص ۱۷۵)" (نعوذ باللہ من ذٰلک)

لیکن تھیوڈور نوئل دیکے نے اپنی کتاب "ماخذ و تدوین قرآن" میں شپرنگر کے مفروضات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اور ولیم میور اپنی "لائف آف محمد" کے مقدمہ میں (ص ۲۳۸ - ۲۳۹) لکھتا ہے: "انسان کی یہ کمزوری ہے کہ کوئی واقعہ ہو چکتا ہے تو اس کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس کے سوا اور کسی طریقے پر یہ بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ محمدؐ ظاہر ہوئے اور اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ عربوں میں ایک نئی اور روحانی لہر دوڑ گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ پورا عرب ایک نئی تبدیلی کو لبیک کہنے کے لئے تیار کھڑا تھا، اور عرب حقانیت کا وہ راستہ اختیار کرنے کے لئے بے چین تھے جو محمدؐ (صلعم) نے چند سال پہلے معلوم کر لیا تھا، ورنہ چند سال بعد تو یقیناً سیدھے راستے پر خود بخود لگ جاتے۔ لیکن جب ہم کُل واقعات پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسیحی منادی کو پانسو برس گزر گئے تھے، پھر بھی عرب میں خال خال مسیحی تھے۔ مثلاً نجران کے بنو حارث

یمامہ کے بنو حنیفہ، اور چند آدمی بنو طے کے، جو تیماء میں آباد تھے۔ بس، (بنو تغلب اور غسان اور حیرہ کے نزدیک رہنے والے مسیحی قبائل اس لئے قابل اعتنا نہیں ہیں کہ وہ حجاز سے بہت دور تھے) یہودیت زیادہ طاقتور تھی اور ذونواس نے کچھ لوگوں کو وقتاً فوقتاً یہودی بنایا بھی تھا، لیکن جہاں تک لوگوں کو یہودی بنانے کا تعلق ہے، یہ طاقت ختم ہو گئی تھی۔ مختصر یہ کہ مسیحیت کا اثر بہت کمزور اور یہودیت کا ایک حد تک گہرا اثر کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا، لیکن مقامی بت پرستی اور اسمٰعیلی روایات کی مسلسل موجیں ہر طرف سے کعبہ کی طرف موجزن تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ کا مذہب اور اس کی عبادت کی غلامی میں پورا عرب مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔"

"تاہم ایسی قدامت پرست قوم میں ایسے عناصر موجود تھے، جن پر ایک کامل دماغ کا انسان کام کر سکتا تھا اور انہیں اس ذہنی غلامی سے نجات دلا سکتا تھا۔ نصرانیت کو سب جانتے تھے، اور اس کے پیرووں کی زندہ مثالیں قبائل عرب میں موجود تھیں۔ انجیل کی تقدیس نہیں تو کم از کم عزت ضرور کی جاتی تھی، بحیثیت کتاب کے یہ خدائی کتاب مانی جاتی تھی۔ بعض مقامات پر یہ آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھی، اور اس کے بعض عقائد اور واقعات عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے۔ یہودیت کے عقائد اس سے زیادہ مشہور تھے، اور اس کی مقدس کتابیں نہیں تو اس کے قصے پورے عرب کو معلوم تھے۔ مکہ کی عبادات اُن بزرگوں (ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ) کی روایات پر قائم تھیں، جو نصرانیت و یہودیت دونوں میں مشترک تھیں۔ یہ وہ زمین تھی جس پر روحانی مرکز بنایا جا سکتا تھا، یہی وہ میدان تھا جس میں متلاشیٔ حق حقانیت کی تلاش کر سکتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے عربوں کے دلوں نے، محمد (صلعم) سے پہلے اس آواز پر کان دھرا ہوگا اور سرسری طور پر ہی سہی، نصرانیت و یہودیت کا پیغام سُنا ہوگا۔ بہت سی بدوی روحوں نے اس کا اقرار کیا تھا کہ قانون (یہود) اچھا اور منصفانہ ہے اور بہت سے روشن دماغوں نے تاروں بھرے آسمان پر نظر ڈال کر یہ

کہا ہوگا کہ یہ کائنات ایک بڑی ہستی کی پیدا کی ہوئی ہے اور مصیبت کے وقت بہت سی مضطر روحیں بخوشی مسیحی قربانی پر ایمان لائی ہونگی - قُس، جو نجران کا پادری تھا، پہلا اور فصیح ترین متناد نہیں تھا، بلکہ اَور بھی تھے، جو انسانوں کو گمراہی سے نکال کر پاکبازی، سچائی اور آنے والے یوم الحساب کی خبر سُناتے تھے۔"

"تبدیلی کا مواد موجود تھا، لیکن اس میں صنعت و کاریگری کی ضرورت تھی، وہ صنّاع و کاریگر محمدؐ (صلعم) تھے - جس طرح ریشم کے نرم لچھوں سے خود بخود حریر کی چادر تیار نہیں ہو جاتی اُسی طرح اسلام کا نافتہ خود بخود عرب کی حالت سے وجود میں نہیں آیا- سب جانتے ہیں کہ جنگل کی اَن گھڑ لکڑی سے نہ تو خود بخود جہاز بن جاتا ہے نہ پتھروں کے ڈھیروں سے عالیشان محل وجود میں آتے ہیں-

آخر میں میور اُس نتیجہ پر پہنچتا ہے (ص ۱۴۲) کہ" اپنے عمل سے صنّاع موجودہ مادوں کو ایک شکل دیتا ہے - مادّہ نہ تو خود بخود اپنی ایک صورت میں ڈھال سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے (جیسا کہ بعض کا خیال ہے) کہ مادّہ خود کاریگر کو ڈھال دے - یہ محمدؐ (صلعم) ہی تھے جنہوں نے اسلام کو ڈھالا- خود اسلام، یا کسی پُرانی اسلامی روح نے محمدؐ (صلعم) کو نہیں بنایا"۔[1]

آنحضرتؐ اور اسلام کے متعلق غیر مسلموں کے متضاد نظریے ہیں، اس کے نمونے اوپر دیئے گئے ہیں- سیرت نبویؐ کے مطالعہ کے بعد آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ آنحضرتؐ نے اسلام کو نئے سرے سے دنیا میں پھیلایا، یا عرب کے حالات ہی کا یہ اقتضا تھا کہ خود بخود قدیم ڈھانچے گر جائیں اور ایک نئی اور زندہ دنیا وجود میں آجائے۔

اس سلسلہ میں مؤرخوں نے اُن لوگوں کے حالات جمع کئے ہیں جو عرب میں بطور مصلح کے گزرے ہیں، یا خود موحد تھے اور شرک کی پستی سے نکل چکے تھے، ذیل میں ان کا ذکر ہے:-

[1] میور لائف آف محمدؐ

عرب کے موحد اور متلاشیانِ حق

اسلام سے پہلے، عرب میں مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت سے زیادہ لادینیت، ارواح پرستی (Animism) اور بُت پرستی کثرت سے رائج تھیں۔ ان سب میں بعض ایسی خرافات چیزیں تھیں جن سے عقلِ سلیم رکھنے والوں کو نفرت شروع ہوگئی تھی اور بعثت رسول عربیؐ سے پہلے ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جو حق کی تلاش میں مصروف تھے۔

ابوالبقا نے اپنی کلیات میں ان ناموں کو درج کیا ہے جن کے متعلق یہ اختلاف ہے کہ وہ نبی تھے یا نہیں۔ مثلاً لقمان، ذوالقرنین، خضر، ذوالکفل، سام، طالوت، عزیر، تبّع، کالب خالد بن سنان، حنظلہ بن صفوان، اسباط — اور حوّا، مریم، ام موسیٰ، سارہ، ہاجرہ اور آسیہ (سوائے شیخ ابوالحسن اشعری کے اور کسی نے عورت کو نبیّہ قرار نہیں دیا) بہر حال عربوں میں سے جنہیں نبی کہا گیا ہے، ان کا حال یہ ہے:۔

تبّع لقب ہے شاہانِ یمن کا۔ معلوم نہیں کس تبّع کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ نبی تھا۔ الرائش پہلا تبع تھا اور تبان اسعد آخری تبّع تھا۔ اِسی نے خانہ کعبہ کو کسوت پہنائی تھی اور مدینے میں احبار یہود کے اثر سے یہودی ہو کر یمن واپس آیا اور وہاں اس کی وجہ سے یہودیت پھیلی۔

خالد بن سنان بن غیث العبسی کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ وہ مومن تھا، نبی نہیں تھا۔ لیکن بعض نے اسے نبی مانا ہے۔ الحلبی نے سیرت حلبیہ میں اس کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ مجدد دین عیسوی تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے تین سو سال بعد ہوا تھا۔ اُسی نے اس آگ کو بجھایا تھا جو مکہ اور مدینہ سے آٹھ رات کے فاصلہ سے دکھائی دیتی تھی اور مجوس اُس کی روشنی دیکھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ یہ آگ ایک کنوئیں سے نکلتی تھی اور اس نے حکم خدا سے یہ کام کیا تھا۔

حنظلہ بن صفوان کو (بقول حلبی) خدا نے اصحاب الرّس کے پاس خالد بن سنان کے تنو

سال بعد نبی بنا کر بھیجا تھا۔ انہوں نے حنظلہ کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا جس پر یہ عذاب نازل ہوا کہ پانی کڑوا اور باغات خشک ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسان سے وحشی ہو گئے اور ان کی جماعت متفرق ہو گئی۔

متلاشیانِ حق کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ زید بن عمرو بن عقیل بن عبدالعزیٰ
۲۔ ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی
۳۔ عبیداللہ بن جحش بن ذئاب
۴۔ عثمان بن الحویرث بن اسد

یہ سب جاہلیہ میں بتوں کے طواف اور ان کے میلوں اور قربانیوں کو برا سمجھتے تھے (ابن اسحٰق) انہوں نے تلاش دین حق شروع کی۔ ورقہ نصرانی ہو گیا۔ یہ ام المومنین خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی تھے۔ عبیداللہ اسلام لائے، پھر حبشہ ہجرت کی اور وہاں نصرانی ہو کر مرے۔ یہ رسول عربی کے پھوپھی زاد بھائی تھے یعنی امیمہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ حبشہ میں مرنے کے بعد ان کی بیوی ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان کو رسول اللہؐ نے اپنے نکاح میں لے لیا۔ عثمان، قیصر روم کے پاس جا کر نصرانی ہو گئے (یہ بھی ام المومنین خدیجہؓ کے عمزاد بھائی تھے) لیکن زید بن عمرو دین ابراہیم کی تلاش میں رہا اور یہودی یا نصرانی نہیں ہوا۔ اس نے بت پرستی، مُردہ، خون اور بتوں پر جو جانور چڑھائے جاتے تھے کھانا چھوڑ دیا اور لڑکیوں کے قتل وغیرہ سے لوگوں کو روکتا رہا اور حنیف ہو گیا یعنی خدا کے سوا اور کسی کی پرستش نہ کرتا تھا۔ یہی بقول نصاریٰ دین ابراہیم تھا۔ ان کے بیٹے سعیدؓ اور چچا زاد بھائی عمر بن الخطابؓ نے رسول اللہؐ سے کہا کہ زید کے لئے دعائے مغفرت کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا "بے شک دعا کروں گا، وہ قیامت کے دن اکیلے ایک امت کی طرح پیدا ہو گا۔"

۵۔ قس بن ساعدۃ الایادی　اس نے طویل عمر پائی تھی، اور عکاظ کے میلے میں رسول اللہؐ نے

اس کا خطبہ سُنا تھا۔ اس کے خُطبے نہایت فصیح و بلیغ ہوتے تھے۔ یہ بھی موحد تھا (اگرچہ جو خطبے، ان سے منسوب ہیں وہ مصنوعی سمجھے جاتے ہیں)

۶۔ **سحنہ بن الخلف الجرہمی** اس نے عمرو بن لحی کو کعبہ کے گرد بُتوں کے رکھنے پر ملامت کی تھی

۷۔ **التلمس بن امیۃ الکنانی** وہ صحن کعبہ میں لکچر دیتا تھا کہ کئی دیوتاؤں کی پرستش سے خدائے واحد کی عبادت بہتر ہے۔ عربوں نے سمجھا کہ وہ بنی تمیم کے دین پر ہے۔ رسول اللہ صلعم کے اجداد اسی قبیلہ سے تھے۔

۸۔ **کعب** وہ صلہ رحم، حفظ عہد، رعائت حق قرابت اور فقراء پر صدقہ دینے اور یتامےٰ پر احسان کرنے کی نصیحت کرتا تھا۔

۹۔ **قصّی** حرم کی تعظیم کرنے اور عبادت اوثان سے دُور رہنے کی تعلیم دیتا تھا۔

۱۰۔ **عبد مناف** اللہ سے ڈرنے اور صلہ رحم کا قریش کو حکم دیتا تھا۔

۱۱۔ **ہاشم** مسافروں کی تواضع کرتا تھا اور اللہ پر ایمان رکھتا تھا۔

۱۲۔ **عبد المطلب بن ہاشم** موحدین میں سے تھا۔ قصۂ فیل میں اس کا ذکر ہے کہ اس نے خانہ کعبہ کو ربِ کعبہ پر چھوڑ دیا تھا۔

۱۳۔ **وکیع بن سلمہ بن زہیر بن ایاد** بیت اللہ کی ولایت جرہم کے بعد ملی تھی۔ عرب اُسے صِدّیق سمجھتے تھے۔ اس کے بعض مواعظ منقول ہیں۔

۱۴۔ **قیس بن نشبہ** ابن سیدہ نے المخصص میں لکھا ہے کہ وہ نجومی و فلسفی تھا، اور رسول کا منتظر تھا جب آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے تو آکر پوچھا کہ اے محمدؐ! محلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا آسمان۔ اُس نے کہا محلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا زمین۔ یہ سن کر وہ ایمان لے آیا اور کہا نبی کے سوا یہ باتیں کوئی نہیں جانتا۔

۱۵- عبد الطانجہ بن ثعلیب بن وبرہ بن قضاعہ کا ذکر شہرستانی نے ملل ونحل میں کیا ہے۔

۱۶- علّان بن شہاب تمیمی اللہ اور یوم جزا پر ایمان رکھتا تھا۔

۱۷- زہیر بن ابی سلمٰی اللہ کے وجود، حیات، علم اور قدرت کو مانتا تھا۔ موت کے بعد بعث کا قائل تھا۔ اور حنفیوں کی طرح ثواب وعقاب اور کتابت اعمال کو مانتا تھا۔

۱۸- عبد اللہ بن تغلب بن دبرہ بن قضاعہ دین حنیف پر تھا۔

۱۹- عبید بن الابرص الاسدی بھی موحد تھا۔ اس کے اشعار شاہد ہیں۔

۲۰- عامر بن الضرب العدوانی بعث کا قائل تھا۔

۲۱- سیف بن ذی یزن نے عبد المطلب بن ہاشم کو آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی۔

۲۲- ابو قیس صرمہ بن ابی انس ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ وہ بنو نجار میں سے تھا۔ نصرانی ہوتے ہوتے رُک گیا۔ پھر ایک گھر میں رب ابراہیم کی پرستش کرنے لگا، اور اسلام لایا۔

۲۳- اُمیّہ بن ابی الصلت الثقفی نے دینِ ابراہیمی اختیار کر لیا تھا اور خود نبی ہونا چاہتا تھا۔ جب آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تو اس نے حسد کیا اور کہا کہ طائف یا مکہ کے کسی رئیس کو نبی ہونا چاہیئے۔ یہ عام لوگوں کا نادار نبی مجھے پسند نہیں۔

۲۴- نابغۃ الجعدی حسان بن قیس بن عبد اللہ شاعر تھا۔ تارک خمر تھا۔ جُوا چھوڑ چکا تھا۔ موحد تھا۔ طویل العمر تھا۔ اسلام لا کر اچھا مسلمان ثابت ہوا۔

جناب الامین کے خاص خاص دوست، جاہلیہ میں

جناب الامین اپنی امانت و دیانت کے باعث جاہلیہ میں خاص شہرت رکھتے تھے، اور مختلف ملکوں اور قوموں میں اپنی تجارتی خوش معاملگی کی وجہ سے اچھے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ خود

اپنے وطن میں، اپنے اور بیگانوں کی ہمدردی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اور حلف الفضول کے دوبارہ زندہ کرنے کی وجہ سے کمزوروں، مظلوموں اور غلاموں کے حامی تصور کئے جاتے تھے۔ عرب میں ایک مثل مشہور ہے کہ انسان اپنے ہم جلیسوں اور دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی لئے اگر ہم آپ کے جاہلیہ کے دوستوں کو تلاش کریں تو چند ایسے بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں جن کی زندگیاں بھی بے لوث اور جن کا چلن عام سطح سے بہت بلند تھا۔

۱۔ **عبدالکعبہ بن ابی قحافہ** خود تاجر تھے، نرم دل تھے اور جاہلیہ میں مدتوں جناب محمدالامین کے شریک صحبت رہے (اصابہ) ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا (اسلام لانے کے بعد آپ کا اسم گرامی ابوبکر الصدیق عبداللہ بن ابی قحافہ تھا)

۲۔ **حکیم بن حزام** یہ اُم المومنین خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ مکے کے رئیسوں میں سے تھے۔ جناب الامین سے پانچ سال بڑے تھے اور مکے کی اہم خدمات، رفادہ اور ندوہ پر مامور تھے۔

۳۔ **ضماد بن ثعلبہ** آزد کے قبیلے کے طبیب اور جراح تھے۔ مسلم اور نسائی کی حدیث ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کی وحی کا حال سُنا تو لوگوں کے کہنے سے یہ باور کیا کہ شائد آپ پر جنّ کا اثر ہے اور اُسی کے زیر اثر آپ مجنونانہ کلام کہتے ہیں آپ کا علاج کرنے کے آئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قدیم زمانے میں طبیب کا کام پھونک جھاڑ کرنا بھی ہوتا تھا۔ وہ اکثر بیماریوں کو آسیب سمجھ کر اُتارا کرتے تھے۔ یہ حالت اب تک اکثر پست اور توہم پرست اقوام کی ہے۔ لیکن جب انہوں نے آنحضرتؐ کو دیکھا اور قرآن سُنا تو کہا یہ قول ہرگز جنّ یا شیطان کے اثر سے نہیں ہو سکتا۔ یہ خدائی کلام ہے۔ یعنی آپ نے رسول اللہ صلعم کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔

۴۔ **قیس بن صائب مخزومی** تجارت میں جناب محمدالامین کے شریک تھے (اصابہ) معاملے کے بہت صاف اور دیانت دار تھے۔

دُوسری فصل

حالاتِ جنابِ محمدؐ الامین صلعم

(ولادت سے بعثت تک)

(۵۷۰ تا ۶۱۰ مسیحی)

۱۔ ولادت کی تاریخ۔ تاریخ ولادت میں مؤرخوں کو اس لئے اختلاف ہے کہ وہ لوگ "نسی" کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔ اصل میں نسی اور کبس ایک ہی چیز ہے، یعنی دوسری قوموں کی طرح عربوں میں بھی ہر دوسرے یا تیسرے سال قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے ایک قمری مہینہ بڑھا دیا جاتا تھا۔ اور چونکہ عربوں کے قریبی تعلقات صابئین بابل، مجوس ایران، یہود یثرب و دین اور نصاریٰ سے تھے لہٰذا وہ لوگ مندرجہ بالا اقوام کی طرح موسموں کے تغیّر و تبدّل سے پورے طور پر واقف تھے اور حج کے موسم کو اعتدال ربیعی کے قریب رکھنا پسند کرتے تھے۔ یہ موسم فروری۔ مارچ کا ہوتا تھا، اس لئے ہم نے جو تقویم بنائی ہے اُس کے اعتبار سے ربیع الاول کا مہینہ جُون کے مہینے کے قریب قریب ہوتا تھا۔ اکثر تاریخوں میں ۲۲۔ اپریل تحریر ہے، جو قطعی غلط ہے۔

تاریخ طبری و ابن خلدون میں ۱۲ ربیع الاول درج ہے۔ ابوالفدا نے ۱۰ ربیع الاول بتائی ہے۔ محمد طلعت حرب نے تاریخ دول العرب و اسلام میں ۹ ربیع الاول اس لئے لکھی ہے کہ جملہ مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ ماہ ربیع الاول میں دوشنبہ کے دن ولادت ہوئی ہے اس لحاظ سے

۵۷۱ء میں جو ربیع الاول بغیر کبیسہ (لونڈ) کئے ہوئے واقع ہوتا ہے اس کی نویں تاریخ کو دوشنبہ کا دن ہوتا ہے۔ محمود پاشا فلکی نے بھی حساب سے یہی بات نکالی ہے۔ لیکن اگر اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ عرب جاہلیہ حسب ضرورت لونڈ کا مہینہ بڑھایا کرتے تھے، تو آپؐ کی حیات (۶۳ سال) کے اندر اکیس مہینے قمری بڑھائے گئے ہونگے، تب قمری موسم، شمسی سال کے مطابق ہوا ہوگا۔ الہ آباد میں محلہ دارا گنج، متصل سنگم (ملتقی النہرین گنگ وجمن) جوتشیوں کا ایک قدیم خاندان ہے جس کے پاس ہزاروں سال کی ایک مکمل جنتری موجود ہے۔ اسی طرح یہودی حبروں اور رومن کیتھولک پوپوں سے عید فصح اور ایسٹر کے ایام کا قدیم کیلنڈر موجود ہے۔ ان سے ہر سال کی صحیح قمری وشمسی تاریخیں، مہینے اور دن معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور ہم نے حساب کی رو سے جو تقویم بنائی ہے، وہ اس کتاب کے آخر میں درج کر دی ہے اس سے معلوم ہوگا کہ عیسوی حساب ولادت محمدیؐ کی تاریخ جون ۵۷۱ء میں ہوئی تھی اور ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ یہی سنہ محمدی قرار دیا گیا ہے۔

چونکہ نسی یا کبیسہ کی رسم ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ مطابق ۸ مارچ ۶۳۲ء کو منسوخ کی گئی اس لئے اس سے پہلے عربی، ایرانی، رومی اور ہندی سال سب یکساں تھے اور ہمیشہ ایک ہی شمسی موسم میں نوروز منایا جاتا تھا۔ بیت المقدس میں اسی مہینے میں لوگ دُور دُور سے آکر مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی تقریب مناتے تھے اور ایران میں جشن جمشیدی ہوتا تھا اور ہندوستان میں ہولی منائی جاتی تھی۔ یہ تاریخیں عرب وعجم میں عام طور پر مشہور ہوتی تھیں۔ اور ان میلوں میں شرکت کرنے کے لئے عرب بھی حج کا میلہ مخصوص شمسی تاریخوں میں مقرر کیا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد سُوقِ عکّاظ سے ہوتے ہوئے عراق وشام کی طرف تجارتی قافلے روانہ ہو جاتے تھے۔

غرضکہ ہم پُورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ولادت محمدیؐ کا مہینہ ربیع الاول سنہ محمدی جون ۵۷۱ء کے مطابق تھا اور اسی سال ولادت سے پچپن دن پہلے نجاشی شاہ حبشہ کے گورنر کی

فوج یمن سے مکہ پر حملہ آور ہوئی تھی کہ خانہ کعبہ ڈھا کر، مسیحی مذہب اور سامراج کو حجاز تک بڑھا دے!

سیدہ آمنہؓ، بنت وہب

سیدہ آمنہؓ کے والد وہب کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپ نے اپنے چچا وہیب کی سرپرستی میں پرورش پائی تھی۔ وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب اپنے خاندان کے سردار تھے اُن کے بھائی وہیب بھی معززین قوم میں سے تھے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب ذبیح اللہ تھے۔ اور چونکہ عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اس لئے لاڈلے بھی تھے۔ عرب میں پہلے یہ دستور تھا کہ انسان کی جان کے بدلے دس اونٹ خون بہا میں دیے جاتے تھے، عبداللہ کی قربانی کے سلسلے میں کاہنہ کی چالاکی سے اُن کی جان بچی اور سَو اونٹ انسان کی جان کا معاوضہ قرار پائے۔ اس طرح عبداللہ کی قیمتی جان نے دوسرے انسانوں کی جانوں کی بھی قیمت بڑھا دی ؛

عبداللہ تجارت پیشہ تھے۔ اور سیدہ آمنہ سے نکاح کے چند روز بعد ہی بغرض تجارت شام کو روانہ ہو گئے تھے۔ واپسی پر مدینے میں کھجوریں خریدنے کے لئے ٹھیرے ہوئے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس سال کی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نکاح کے پہلے ہی ہفتہ میں سیدہ آمنہؓ امانت دار نور محمدی ہو گئی تھیں۔ ابن سعد راوی ہے کہ دوران حمل میں مکہ کی بڑی بوڑھی عورتیں مختلف قسم کے ٹوٹکے کیا کرتی تھیں، اسی لئے سیدہ آمنہؓ کے گلے اور بازو پر کچھ لوہا آسیب سے بچانے کے لئے باندھ دیا گیا تھا، لیکن یہ چیزیں کہیں ضائع ہو گئیں اور پھر آپ نے کوئی ٹوٹکا نہ کیا۔

ماحول ولادت محمدی

دنیا ایک حد تک ترقی کر چکی تھی اور ترقی کر رہی تھی۔ یہ چھٹی صدی مسیحی تھی۔ مذہب نے لوگوں کو کئی راستے دکھائے تھے۔ اور پست سے پست اور بلند سے بلند مذہبی خیالات مختلف قوموں میں پھیل چکے تھے۔ بُت پرستی، کئی خدا پرستی، ایک خدا میں کئی خداؤں کی شرکت، صرف ایک خدا یعنی اپنی اپنی قوم کا تنہا خدا، کائنات پرستی، خدا، یا خداؤں کا قطعی انکار، خود خدا ہونے کا تصور۔ غرضکہ اس طرح کے بہت سے عقیدے پیدا ہو چکے تھے۔

فلسفے نے بھی ہر قوم کو سوچنے سمجھنے کی طرف مائل کر دیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامی قوموں میں جو جگہ مذہب کی تھی، وہی آریہ قوموں میں فلسفے کی تھی۔ اور یونان سے ہند تک جتنی آریہ قومیں تھیں ان کا فلسفہ ہی ان کا مذہب تھا۔ چینی اور مصری قومیں بھی فلسفی قومیں تھیں، لیکن —— چھٹی صدی مسیحی تک پہنچتے پہنچتے فلسفے نے کٹ حجتی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شائد یہ سامی عمل اور آریہ خیال کا ایک دوسرے پر ردّعمل تھا کہ دنیا والے مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ حتیٰ کہ اپنی مایوں کے لئے اپنی جان دینے اور دوسروں کی لینے میں بھی دریغ نہ کرتے۔ دنیا ایک رزم گاہ بن گئی تھی۔

یورپ کا تمدن مسیحی فرقہ بندیوں سے پامال ہو رہا تھا۔ تقلید جامد (Orthodoxy) نے یونانی اور مصری عقلیت پر گہن ڈال دیا تھا، اور اس بات کی کوشش ہو رہی تھی کہ لوگوں کے اقوال، افعال اور زندگی پوپوں کے افکار کے باعث ہو جائے۔ اور جو بحثیں نئے تجربوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھیں وہ بائبل کے الفاظ کی روشنی میں قطعی طور فنا کر دی جائیں۔ قسطنطین اعظم نے چوتھی صدی مسیحی میں رومی شہنشاہت کو عیسوی مذہب سے مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی اور پوپوں کے ذریعے سے

انسانی دماغوں کو غلام رکھنے کی بنیاد ڈالی تھی، اسی لئے جہاں کہیں آزاد خیالی شروع ہوتی تھی اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا، حتیٰ کہ شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) کے زمانے تک یہ حالت ہوگئی تھی کہ اگر کوئی آریوس (Arrius) ۳۲۱ء میں یہ کہتا کہ خدا باپ، خدا بیٹے سے زمانے میں پہلے تھا تو وہ جلاوطن کر دیا جاتا تھا اور اس پر کفر کے ساتھ ساتھ موت کا فتوے صادر کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی اپال لینارس (Apollenoris) یہ کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ حقیقت میں انسان تھے تو قسطنطنیہ کی کونسل (۳۸۱ء) یہ طے کرتی کہ غلط ہے۔ اگر کوئی نسطوریس یہ کہتا مصری دیوی آئی سس کی طرح حضرت مریمؑ کو "خدا کی ماں" کہنا خدا کی توہین ہے تو مسیحیوں کی ایک عام کونسل بیٹھ جاتی اور اُسے یہودا (Judas) کا بھائی، کافر و ملحد قرار دے کر جلاوطن کر دیا جاتا (۴۳۱ء) بلکہ یہ قرار دیا جاتا کہ خدا اور اس کا بیٹا دونو ایک ہی ہیں، لہٰذا نسطورہ کا یہ قول غلط ہے کہ باپ اپنے بیٹے سے پہلے ہوتا ہے۔ آخر کار خالسی دوں (Chalcedon) کی کونسل ۴۵۱ء میں یہ طے کرتی کہ باپ اور بیٹا قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔ حتیٰ کہ عیسوی مذہب ایک معجون مرکب بن گیا!

ایشیا میں، اردشیر کا زندہ کیا ہوا زردشتی مذہب بھی موبدوں اور دستوروں کے ذریعے افکار انسانی پر جکڑ بندیاں کر رہا تھا۔ عیسائیوں پر زردشتی مذہب کے نام ظلم ہو رہے تھے۔ جناب مانی کی زندہ کھال کھینچ لی گئی تھی! (۲۷۷ء) اور خسرو اوّل کے زمانے تک، چھٹی صدی مسیحی کے اواخر میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ بدھ، مانوی، مسیحی اور زردشتی مذاہب و فلسفہ نے مل جل کر ایشیائی اقوام کو بے معنی بحثوں میں پھنسا دیا تھا۔ اور تقلید نے سائنس کا رستہ روک دیا تھا۔

ہندوستان فلسفہ کا گھر تھا۔ یہاں اپنشدوں کا بلند ترین فلسفہ زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرنے کے کئی طریقے بتا چکا تھا۔ گوتم بدھ نے فلسفے سے ہٹا کر عمل پر زور دینا سکھایا تھا، لیکن زمانے نے اُن کی تعلیم کو چین و یونان تک تو پھیلایا، لیکن خود ہندوستان میں مذہبی پوپوں

یادستوروں کی جماعت نے راجاؤں کو مدد دے کر اونچی اور نیچی ذاتیں قائم کر دی تھیں۔ اور برہمنوں نے اس طرح عوام کے دماغوں پر قبضہ کیا تھا کہ آخر کار بُدھ مت کی مساوات انسانی مٹائی جانے لگی تھی اور خود یہ عملی فلسفہ ہندوستان سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اور بودھوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ پھر بھی ہندوستان میں علوم طب، نجوم و جوتش، فلسفہ اور منطق کی تعلیم پر پابندیاں نہ تھیں، حالانکہ یورپ میں اواخر چھٹی صدی مسیحی میں، پوپ گریگری کے حکم سے طب کی جگہ گنڈے، تعویذوں نے لے لی تھی، اور ہر مرض کا علاج شہد، دُودھ اور بپتسمہ سمجھا جاتا تھا۔ طب، فلسفہ، نجوم، ریاضی وغیرہ کی تعلیم حکماً حرام قرار دی گئی تھی۔ ایسے ماہرین فن کو قتل، اور کتابوں کو نذر آتش کرنا عام بات تھی! یہی زمانہ تھا کہ پلیٹی نیٹ (Platinate) کا قیمتی قلمی کتب خانہ راکھ کا ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ اور شہنشاہ جسٹی نین (Justenian) نے یونانی فلسفہ کے مدرسے بند کر دیئے تھے۔ یہ مدرسے ہزار سال سے افلاطون کے زمانے سے برابر قائم تھے۔ لیکن یہی شہنشاہ اس رومن قانون کا مدوّن ہے جو یورپ کے قوانین کی بنیاد مانا جاتا ہے۔

ہر ملک میں ایسی جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں جو انسانوں کی بڑی تعداد کو ذہنی غلام بنائے ہوئے تھیں۔ اور دنیا کے علم پر، جو ہر انسان کو تجربہ سے حاصل ہوا تھا، قبضہ کئے ہوئے تھیں۔ یہ برہمن، پوپ اور سادن (قریش کے پجاری) ہر ملک میں تھے۔ اور علم (سائنس) کو اپنی جماعت کی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے، حتےٰ کہ بعض جگہ اُس کو سُن لینے کی سزا موت تھی! اور کہیں کہیں کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ پلا دیا جاتا تھا!!

غلامی کی دوسری شکل انسان کے جسموں پر تھی اور اس کی بدترین صورتیں دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ حتےٰ کہ بعض جگہ اُن کی ذاتیں بنا دی گئی تھیں اور وہ اپنی غلامی کو خدا کی طرف سے ماننے لگے تھے اور اس پر قانع ہو گئے تھے۔

ذہنی غلامی سے نجات دِلانے کے لئے یسوع ناصری (۴ء تا ۳۰ء) اور مانی (۲۱۶ء تا ۲۷۶ء) کی طرح کے انسان علم بغاوت بلند کرچکے تھے۔ خود اٹلی میں رومن غلاموں نے بغاوت کرکے (۷۳ ق م) یہ دکھادیا تھا کہ غلامی سے موت بہتر ہے۔ لیکن عورتوں کی مجبور صِنف کو کسی جگہ آہ کرنے کی بھی جرأت نہ تھی، وہ علم اور آزادی سے ہر جگہ محروم تھیں اور ذہن وجسم کو غلام بنانے والا انسان ہر ملک میں اپنا مضبوط گروہ بنائے ہوئے تھا۔

ولادت محمّدی کے زمانے کا یہ ماحول تھا۔

روایات محمّد بن سعد کاتب الواقدی از طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۶۲

محمّد بن علی:۔ رسول اللہ دوشنبہ کے دن، دس راتیں ربیع الاول کی گزرنے کے بعد پیدا ہوئے۔ یعنی ۱۰ ربیع الاوّل، عام الفیل۔ اِسی سال ۱۵ محرّم کو اصحاب الفیل حملہ آور ہوئے تھے۔ گویا آنحضرتؐ حملۂ فیل سے پچپن دن بعد تولد ہوئے

ابو معشر نجیح المدنی:۔ رسول اللہ دوشنبہ کے دن دو راتیں ربیع الاوّل کی گزرنے کے بعد پیدا ہوئے۔

ابن عباسؓ:۔ رسول اللہ دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے۔ عام الفیل میں۔

سعید بن جبیرؓ:۔ (وغیرہ) رسول اللہ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

یعنی ربیع الاوّل کا مہینہ، دوشنبہ کا دن اور عام الفیل پر سب کا اتفاق ہے۔ یہ مہینہ شمسی ماہ جون کے مطابق ہے۔

ولادتِ باسعادت

"جب دنیا مصیبتوں میں گھر جاتی ہے، اور نور پر تاریکی کا غلبہ ہو جاتا ہے تو خدا خود ایسا سامان کرتا ہے کہ ہر طرف روشنی پھیلے۔" (ایران)

"ظلم کو دور کرنے کے لئے خدا اپنی قوت کا ظہور انسانوں کے ذریعے سے کرتا ہے۔ اور بار بار کرتا ہے۔" (ویدانت ہند)

"خدا نے سب کو آزاد پیدا کیا ہے۔ چالاک انسان انہیں غلام بناتا ہے۔ سچا راستہ وہی ہے جو آزادی کی راہ دکھائے۔" (حکمت عرب)

"عدل اور نیکی پھیلانے والا دیوتاؤں کا بیٹا ہے۔" (یونان)

"جنگ اور غلامی کی جڑ سرمایہ پرستی ہے۔ قسمت پر شاکر ہونے کی تعلیم مُردہ بناتی ہے آؤ، اپنے عمل سے دکھا دیں کہ ہم مجبور نہیں، مختار ہیں اور زندہ ہیں۔" (غلامی کا مؤرخ)

"محبت، جمہوریت اور مساوات کا انحصار سعی انسانی پر ہے۔ یہی خدائی پیغام ہے۔" (ایک پیغمبر)

"محبت سے دنیا جنت بن جاتی ہے......" (ایک صوفی شاعر)

دنیا، اپنے بچپن سے جوانی کی طرف جا رہی تھی۔ دُنیا والے بچوں کی طرح بہت سے گھروندے بنا بنا کے مٹا چکے تھے۔ بچوں ہی کی طرح وہ خوش نما چیزوں کو پسند کرتے اور ظاہری رنگ روپ کے فریبوں میں مبتلا تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے علم و تجربہ کی طاقت کا اندازہ کر لیا تھا اور ایسی ٹولیاں بنا بیٹھے تھے جو علم، گیان، یا وید اور حکمت پر قبضہ کئے ہوئے تھیں۔ دولت، طاقت سے حاصل ہوتی تھی۔ طاقت علم سے۔ علم والے سب سے اونچے درجے کے تھے۔

باقی سب اُن کے غلام تھے۔

یہ بھولے بھالے انسان، یہ نہیں سمجھتے تھے کہ پانی کی طرح علم کو بھی رواں دواں رہنا چاہیئے۔ یہ دولت، کثرتِ استعمال سے بڑھتی ہے، نکھرتی ہے اور سب کو اتنا ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جتنا ایک برہمن یا پجاری کو۔

کون جانتا تھا کہ عرب کے ریگستان میں ایک غریب گھرانے کے اندر ایک ستارہ طلوع ہو رہا ہے جو آج سے چالیس سال بعد پوری کائنات کے ذرہ ذرہ کو آفتاب بنا دے گا اور علم و حکمت سے کھیلنے والوں کو یہ سبق دے گا کہ بچپن چھوڑیں اور سب مِل کے علم کے ذریعے عمل کے میدان میں بڑھنا شروع کریں۔ جس طرح خدا کی بنائی ہوئی ہوا اور آسمان کا پانی کوہ و صحرا میں تفریق نہیں کرتا اور بقدرِ ظرف ہر ایک کو زندگی کی وسعتوں سے بہرہ اندوز کرتا ہے اُسی طرح آزاد علم کی ہوائیں، محبت و مساوات کے چشموں سے مِل کر خرابِ آبادِ انسانی کو چمنستان بنا سکتی ہیں۔

سیدہ آمنہ کے بطنِ مبارک سے دوشنبہ کے دن، صبحِ صادق کے وقت، گرمیوں کے موسم میں اُس یتیم بچے کی ولادت ہوئی جس نے دنیا کے مزاج کو علم کے چھینٹوں سے نہیں، علم و مساوات کے دریاؤں سے معتدل بنا دیا! (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ)

قریش ہر سال کا الگ نام رکھتے تھے۔ ولادتِ محمدی کے سال کا نام سنتہ الفتح والابتہاج" (فتح اور خوشی کا سال) تھا۔ اس لئے کہ اس سال خوب پانی برسا، قحط دُور ہوا اور لوگ خوشحال ہو گئے۔

۱ ولادت سے سات مہینے پہلے آپؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب شام سے قریش کے قافلۂ تجارت کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔ بیمار ہو گئے اور پچیس سال کی عمر میں وہیں وفات

پائی۔ اس لئے آپؐ پیدائشی یتیم تھے، اور آپؐ کے گھر، مالِ دنیا سے صرف پانچ اونٹ، چند بکریاں اور ایک لونڈی اُمِّ ایمن (برکت) تھی جو آپ کو کھلایا کرتی تھی اور جسے آپؐ نے آزاد کر کے زید کے ساتھ بیاہا تھا۔

عبدالمطلب کو جب اپنے پوتے کی ولادت کی خبر دی گئی تو وہ (صحن کعبہ میں بیٹھے ہوئے) بہت خوش ہوئے۔ آمنہؓ بنت وہب کے گھر گئے اور نومولود کو گود میں لے کر خانہ کعبہ تک لائے۔ خدا کی حمد کی اور بچّے کا نام محمدؐ رکھا۔

(نوٹ۔ آمنہ بنت وہب کی چچا زاد بہن ھالہ بنت وہیب عبدالمطلب سے بیاہی ہوئی تھیں اس طرح آنحضرتؐ ھالہ کے بھانجے بھی تھے)

رضاعت

ولادت کے بعد سات دن تک سیدہ آمنہ نے آپؐ کو دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپؐ کے چچا عبدالعزّٰے (ابولہب) کی لونڈی ثوبیہ نے دودھ پلانا شروع کیا۔ لڑکوں کی ولادت سے عربوں کو بہت خوشی ہوتی تھی، اسی لئے آپؐ کی ولادت کی خبر سُن کر ابولہب نے ثوبیہ کو جو اس کی لونڈی تھی، آزاد کر دیا۔

قریش کا دستور تھا کہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے اور وہ دیہات میں اپنے اپنے قبیلوں میں لے جا کر دودھ پلاتی تھیں۔ اور وہ آزاد بدوی زندگی میں پرورش پا کر عربوں کی جملہ صفات سے متصف ہو جاتے تھے۔

چونکہ آپؐ ایک غریب گھرانے کے تھے اور یتیم بھی تھے، اس لئے دودھ پلانے والیوں

کو آپؐ کی رضاعت سے کسی نفع کی امید نہ تھی، پھر بھی بنو سعد قبیلے کی ایک عورت نے جن کا نام حلیمہؓ تھا، آپؐ کو قبول کر لیا اور اپنے ساتھ لے گئیں۔ اور بنو سعد* کے قبیلے میں، جو طائف کے قریب رہا کرتا تھا، آپؐ کی ابتدائی پرورش ہوئی۔ حلیمہؓ کے لئے آپؐ کا قدوم نہایت مبارک ثابت ہوا۔

جب آپؐ پاؤں پاؤں چلنے لگے، اور دو برس کے ہوئے تو حلیمہؓ نے دودھ چھڑا دیا اور آپ کو سیدہ آمنہ کے پاس مکہ لائیں، لیکن وہاں بیماری تھی اور صحرا کی آب و ہوا نے بچے کو تندرست اور توانا بنا رکھا تھا، اس لئے ماں نے واپس کر دیا، اور آپؐ پانچ سال تک بنو سعد ہی میں پرورش پاتے رہے۔ اس قبیلے کی زبان پورے عرب کے لئے نمونہ فصاحت و بلاغت تھی اسی لئے آپؐ نے فرمایا ہے کہ انا اعربکم۔ انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر۔ یعنی میں تم سب سے زیادہ عرب ہوں۔ اوّل تو مَیں قریش ہوں، پھر میری زبان قبیلہ بنی سعد کی ہے۔

آپؐ کی شادی کے بعد حلیمہ سعدیہؓ قحط سے پریشان ہو کر مکہ آئی تھیں اور آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے ایک ناقہ اور چالیس بکریاں دلوائی تھیں۔ اسی طرح جب بعد میں بنو ہوازن کے لوگ گرفتار ہوئے تھے، اور آپؐ سے رضاعت کا واسطہ دے کر ہمدردی کی درخواست کی، تو آپؐ نے اُن پر بہت مہربانی فرمائی تھی۔

---

* نوٹ۔ بنو سعد کا قبیلہ، بنو ہوازن کی شاخ تھی۔ اور جس مضر بن نِزار سے قریش تھے اسی مضر بن نزار سے بنو ہوازن بھی تھے۔ یعنی بنو ہوازن بن خصفہ بن قیس بن عیلان بن مُضر بن نِزار بن معد بن عدنان۔

مکہؐ میں ماں کے ساتھ

پانچ سال آزاد آب وہوا میں زندگی بسر کرنے کے بعد حلیمہ سعدیہؓ آپؐ کو سیدہ آمنہ کے پاس پہنچا گئیں۔ ایک سال تک آپؐ مکہ میں رہے۔ چھٹے سال کے ختم کے قریب سیدہ آمنہ کے ساتھ یثرب (مدینہ) کا سفر کیا۔ ام ایمن بھی ساتھ تھیں۔ مدینے پہنچ کر بنو عدی کے یہاں نابغہ کے گھر میں قیام کیا۔ اسی جگہ آپؐ نے بنو عدی کے تالاب میں پیرنا سیکھا اور اسی مکان اور بچپن کے دوستوں کی یاد آپؐ کے دل پر ہمیشہ نقش رہی۔

مدینے میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد سیدہ آمنہ واپس ہوئیں اور مقام ابوا، پر، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک موضع ہے، وفات پائی۔ اور آپؐ اُم ایمن کے ساتھ مکہ واپس آئے۔

کفالت عبد المطلب بن ہاشم

عبد المطلب آپؐ کے دادا تھے۔ ان کی عمر اسّی سال کی ہو گئی تھی۔ یتیم محمدؐ بن عبد اللہ اب اپنے دادا کی کفالت میں پرورش پانے لگے۔ خانہ کعبہ کے سائے میں فرش بچھایا جاتا تھا عبد المطلب کے بیٹے پوتے وہاں حاضر ہوتے تھے اور ننھے محمدؐ سے کھیلا کرتے تھے۔

لیکن ابھی ماں کی وفات کا غم تازہ تھا کہ دو سال کے اندر ہی عبد المطلب بھی چل بسے، عام الفیل کے بعد یہ آٹھواں سال تھا۔ آپؐ پر اس جدائی کا خاص اثر ہوا۔

اب تک عبد المطلب، خاندان ہاشم کے سردار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد حرب

بن اُمیّہ بن عبد الشمس سردار بن گیا۔ اس کے خاندان والے تعداد میں زیادہ تھے۔
عبد المطلب کے کئی لڑکے تھے۔ زبیرؓ سب سے بڑے تھے اور عباسؓ و حمزہؓ بہت چھوٹے تھے۔ زبیرؓ، ابو طالب اور عبد اللہ (والدِ رسول اللہؐ) ایک ہی ماں سے تھے۔ زبیر وارث خاندان قرار پائے، لیکن انھوں نے ابو طالب کے حق میں دست برداری دے دی۔ ابو طالب نادار تھے، لہٰذا "رفادہ" (حاجیوں کو کھانا کھلانا) بھی عبّاس بن عبد المطلب کے سپرد کردیا۔ لیکن وہ بھی یہ بار نہ سنبھال سکے اور ان کے پاس صرف "سقایہ" (حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت) باقی رہ گئی۔

ولایت ابو طالب

مرتے وقت عبد المطلب نے یتیم محمدؐ کو ابو طالب کے سپرد کیا تھا۔ اور انھوں نے اپنے بھتیجے کا آخری وقت تک ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ ان کے لئے شعب ابو طالب میں (سنہ ۷ تا ۱۰ نبوی) محصور رہے اور طرح طرح کی اذیتیں اُٹھائیں۔

پہلا سفر شام

جب آپ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو چچا ابو طالب بن عبد المطلب کے قافلے کے ساتھ آپؐ نے شام کا سفر کیا۔
ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ شیتاء (شیت، سرد) یا سردی کے موسم میں عرب کے تاجر

یمن اور حبشہ کی طرف جاتے تھے۔ المطلب بن عبد مناف نے یمن میں شاہانِ حمیر سے معاہدہ کر کے تجارت کی راہ کھولی تھی اور ان کے بھائی عبد شمس نے نجاشی سے تجارتی معاہدہ کیا تھا۔ صیف، یا گرمی کے موسم میں مکہ کے شمال کے ملک معتدل اور سفر کے لئے پُر لطف موسم رکھتے تھے۔ بہار کے زمانہ میں ایران و فلسطین میں جشن منائے جاتے تھے۔ اور عرب اپنا حج ختم کر کے ان ملکوں کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ رومی اور غسانی بادشاہوں سے ہاشم بن عبد مناف نے معاہدہ کیا تھا اور رومی شہنشاہ کی طرف سے انہیں پروانۂ امن بھی مل گیا تھا۔ نوفل بن عبد مناف نے شاہِ ایران سے عراق و فارس میں تجارت کی اجازت حاصل کی تھی۔ قریش کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کی ہمراہی میں جو قافلہ ہو وہ لوٹ مار سے محفوظ رہتا تھا۔

یہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ قصی کے بعد اس کے دونو لڑکوں کو مسابقت اور طمع نے جنگ پر آمادہ کر دیا تھا۔ عبد مناف (جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے القمر کہلاتا تھا) عبد الدار سے چھوٹا تھا۔ قصی نے ریاست عبد الدار کو دی تھی لیکن عبد مناف نے اپنے بیٹوں کے زور پر رفادہ اور سقایہ اپنے بڑے بھائی سے چھین لیا تھا۔ مطیبین اور لعقۃ الدم کی لڑائی اسلام کے بعد تک قائم رہی تھی۔

عبد مناف کے بیٹوں میں سے بنو ہاشم اور بنو المطلب ایک گروہ بنے ہوئے تھے۔ اور نوفل اور عبد شمس نے دوسرا گروہ بنا لیا تھا۔ ہاشم کو رفادہ اور سقایہ میراث میں ملا تھا۔

عبد شمس کے بیٹے اُمیہ نے ہاشم کو منافرت کا چیلنج دیا تھا اور ایک کاہن نے ہاشم کے حق میں فیصلہ کر کے اُمیہ کو سو اونٹ ہارنے اور دس سال کے لئے جلا وطن ہونے کا حکم دیا تھا۔ بنو اُمیہ اور بنو ہاشم میں دشمنی کی آگ برابر سلگتی رہی تھی۔

حرب بن اُمیہ اور عبد المطلب بن ہاشم میں بھی منافرت ہوئی تھی اور حرب ہارا تھا، لیکن اس زمانے میں عبد المطلب کے اولاد نہ تھی۔ نہ اُس نے زمزم کے کنوئیں کو کھودا تھا۔ اس لئے

وہ خدا سے یہی دعا کیا کرتا تھا کہ اُس کے دَس بیٹے ہو جائیں تو وہ ایک بیٹے کو خدا کی بھینٹ چڑھاوے گا۔ رسول عربی صلعم کے والد عبداللہ آخری بیٹے تھے اور وہی ذبیح اللہ قرار پائے تھے۔ لیکن ایک کاہنہ کی ترکیب نے اُن کی جان بچائی تھی۔

غرضکہ وہ تجارت، جو حضرت یعقوبؑ کے زمانے سے مصر و شام کو یمن اور ہند سے ملاتی تھی اور بعد میں بنبتی قوم الحجر (پتھرا Petra) سے یمن تک اور یمن سے ہند تک تجارت کی واحد ٹھیکہ دار تھی، جہاں رومیوں نے اونچی اونچی فوجی سڑکیں بنائی تھیں جنہیں صراط کہتے تھے۔ ایک صراط عقبہ (عیلہ) سے پتھرا تک تھی جہاں سے وہ دو راستوں میں پھٹ جاتی تھی۔ ایک راستہ غزّہ (Gaza) کی طرف چلا جاتا تھا جو بحر روم پر واقع تھا، اور دوسرا دمشق کو جاتا تھا۔ یہ صراطیں آنحضرتؐ کے زمانے تک قائم تھیں، اس لئے کہ ہاشم کی وفات غزّہ ہی میں ہوئی تھی۔ (واقدی ص ۱۴) (ہیرین کی ایشیاٹک ریسرچز، ج ۲ ص ۹۸) پتھرا کے جنوب میں بُصرٰے (Bostra) تھا۔ اس جگہ ابو طالب کے ساتھ اس سفر میں آنحضرتؐ گئے تھے۔

لیکن چند صدیوں کی تجارتی ترقی نے جن شہروں کو جنّت بنا دیا تھا وہ پہلی صدی مسیحی میں تجارتی راستے کی تبدیلی اور قسطنطنیہ کی سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے بالکل تباہ ہو گئے۔ مدینہ اور شام کے درمیان اقوام عاد و ثمود کی تباہی اور حضر موت سے آبادی کا شمال کی طرف منتقل ہونا بھی، تجارت کی تباہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ رومیوں نے بحر احمر کے ذریعے سے مصر کو ہندوستان سے مِلا دیا تھا۔ اور اس کا نتیجہ تھا کہ وہ تجارتی صراط، اور صراط کے شہر جو خشکی کے راستے پر تھے بالکل تباہ ہو گئے تھے۔ ایران اور روم کی جنگیں، اور کسی مضبوط مرکزی سلطنت کا راستوں کو محفوظ نہ رکھ سکنا بھی ایک بڑا سبب تباہی کا تھا۔ بحر مُردار کے قریب جو آثار قدیمہ نکلے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ تباہی بہت وسیع تھی۔ جِراش، غدارہ اور عُمّان (Philedel-phia)

اور بتھرا کے کھنڈر اُس عظمت پر اب تک آنسو بہا رہے ہیں جو ان شہروں کو تجارت اور حکومت کی بدولت حاصل تھی۔

چونکہ ابو طالب کا یہ خیال تھا کہ سفر میں آپؐ کو ساتھ نہ لے جائیں، اس لئے عین اُس وقت جبکہ قافلہ روانہ ہو رہا تھا، آپؐ اپنے چچا سے لپٹ گئے، اور ساتھ جانے پر اصرار کیا ظاہر ہے کہ دونوں میں بہت زیادہ محبت تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی نئی جگہ جانے کے لئے بچے بیتاب ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کے دامن سے لٹک جاتے ہیں۔ شاید یہی صورت پیش آئی ہو گی اور ابو طالب نے یہ دیکھ کر اس بچہ کا میرے سوا کوئی نگراں نہیں ہے اُنہیں اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھا لیا ہو گا۔

یہ سفر منزل بہ منزل طے ہو رہا تھا۔ قافلے راتوں کو چلتے تھے اور صحرا کی چاندنی راتیں اور پُر ہیبت و خاموش منظر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ ایسے آسمان پر، جہاں شاذ و نادر ہی بادل نظر آتے ہوں، تاروں بھری راتوں کا پورا سماں عجب پُر کیف ہوتا ہے، اور خصوصیت سے اُس بچے کے لئے، جس کی ابتدائی نشو و نما ہی صحرا کی آزاد ہواؤں میں ہوئی ہو۔

بڑے شہروں کے رہنے والے، ہزار سال کے بعد جب عربی زندگی، خصوصیت سے ایشیائی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں، تو وہ اس پرانے تمدن کے پس منظر کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لکھنے والا خواہ بنگال سول سروس کا ایک ملازم ہو (ولیم میور) یا یورپ کے کسی شہر کا مشنری ہو (مارگولیوث) وہ اُن اثرات کو سمجھ ہی نہیں سکتا، جو کسی قصبے کے رہنے والے بچے کے دل پر، انوکھے تمدن، اور شاندار شہروں کے مناظر پیدا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے دلوں میں پرانے آثار اور کھنڈروں کو دیکھ کر خوف نہیں پیدا ہوتا، بلکہ زندگی اور امیدوں کی دنیا میں ایک ہیجان اور جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یا تو یہ اُجڑے ہوئے شہر پھر آباد ہو جائیں اور

یا کم از کم میں اپنے گاؤں یا قصبہ کو ایسا بنا دوں کہ لوگ اُسے دنیا کا بہترین شہر سمجھنے لگیں۔

یقیناً آپؐ اس سفر میں، یا بعد کے سفروں میں، جب حضرت خدیجہؓ کے میر تجارت کی حیثیت سے کام کرتے تھے، ان کھنڈروں سے بھی گزرے ہوں گے، جو بحر مُردار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اُن شہروں کو بھی دیکھا ہو گا، جہاں نئے نئے تمدّنوں کے پرورش یافتہ انسان، تجارت اور سیاست کی کامرانیوں سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے۔

یثرب، مکہ کے مقابلہ میں ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن وہاں، اور اُس کے جوار میں بیت المقدّس تک یہودیوں کے قصبے اور شہر تھے۔ وہ چار دیواریوں سے محفوظ تھے وہاں پانی کی کثرت تھی۔ کھیتیاں ہوتی تھیں۔ نخلستانوں کے سایے میں دن کی وہ تپش اور بے چینی نہ تھی، جو مکہ کے بے آب و گیاہ ریگستان میں تھی۔ رومن شہنشاہیت کے اثرات سے ہر طرف صراطیں (Strata) بنی ہوئی تھیں، جو باقاعدہ پتّھر کے چوکوں سے پُختہ کی گئی تھیں راستوں پر، جہاں جہاں کنوّاں یا تالاب تھا وہاں آبادی، زندگی اور چہل پہل تھی، اور ایسے ہی مقامات پر منزل کی جاتی تھی۔

کہیں یہودی نظر آتے تھے، جو اپنے لمبے لمبے چوغوں میں مست تھے (یہ چوغہ وہی لفظ ہے جو رومی زبان میں ٹوگہ ہے) یہ اپنے آپ کو خدا کی خاص اور برگزیدہ قوم سمجھتے تھے۔

لیکن ان کی سلطنت کہیں باقی نہ تھی۔ عبرانی پڑھانے کے مدرسے (مدراش) اور قانون (توراۃ) یاد کرنے اور اس پر اضافہ کرنے یا شرحیں لکھنے کا ہر یہودی قصبے میں رواج تھا۔ وہ سؤر اور اونٹ دونو کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اور اُن کے یہاں اسی طرح کی بہت سی چیزیں حرام تھیں۔

رومی سلطنت میں عیسائیت پھیل چکی تھی، لیکن اُس عیسائیت کی وہ شکل باقی نہ تھی، جو حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ خود یہودی تھے اور وہ یہودیوں کی اصلاح کرنا چاہتے

تھے - جب یہ مذہب رومیوں نے قبول کرنا شروع کیا، تو حضرت عیسیٰؑ کے اقوال و اعمال کا صحیح نقشہ اُن کے سامنے نہ تھا - حتیٰ کہ وہ اپنے دین کے کلمہ پر بھی متفق نہ تھے - کوئی کہتا تھا کہ خدا ایک ہے، کوئی کہتا تھا کہ خدا باپ ہے اور حضرت عیسیٰؑ بیٹے ہیں اور حضرت مریمؑ بھی اِس تثلیث میں شریک ہیں - ایک جماعت کہتی تھی کہ جب خدا باپ ہے تو وہ یقیناً بیٹے سے پہلے ہوگا - دوسری کہتی تھی کہ نہیں، یہ دونو آگے پیچھے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک ہی ساتھ ہیں - غرضکہ ان لوگوں نے جب عیسائیت قبول کی تو اُن میں وہی خیالات باقی رہ گئے جو اُن کے قدیم مذاہب کے تھے - اس لئے بخلاف یہودیوں کے اُنہوں نے حلال حرام پر زور نہیں دیا - اور کھانے پینے، رہنے سہنے کی جتنی سماجی رسمیں تھیں وہ باقی رہیں - حتیٰ کہ وہ مذہب، جو مصری فلسفہ تثلیث سے قائم تھا وہی پھر قائم ہوگیا، اور جس کا جو جی چاہا وہ سمجھنے لگا - اس موقعہ پر ایک مذہبی جماعت بن گئی اور عوام کے رجحانات کے مطابق عیسائی مذہب کو چلانے لگی اور جس طرح یہودیوں میں صدوقی اور فریسی فرقے تھے، اُسی طرح عیسائیوں کے متعدد فرقے ایک دوسرے کو کافر بنانے لگے -

پھر بھی یہودیوں اور نصرانیوں میں اس طرح کے فرقے موجود تھے جو ایک خدا کو مانتے تھے اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے - عیسائیوں میں ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی جو راہب کہلاتے تھے، اور انجیل کی ایک آیت کی لفظی پیروی میں ہیجڑے بن کر زندگی بسر کرتے تھے - وہ بالکل تارک الدنیا ہو کر صومعہ نشین ہو جاتے تھے اور انجیل کی نقلیں تیار کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ کرتے تھے، اس لئے عرب (امیّوں) کی سادہ زندگی بسر کرنے والوں کی نظر میں یہودیوں، نصرانیوں اور رومی شہنشاہیت کے باشندوں کا تمدّن اور اُن کی معاشرت و سیاست یقیناً جاذب نظر تھی - اسی لئے عرب امیّوں کے مقابلے میں اہل کتاب

یا متمدن مانے گئے تھے۔کتاب، توراۃ یا قانون کو کہتے ہیں۔ان قوموں کی زندگی کا ایک قانون تھا اور اسی لئے ان کی ترقی و تنزل پر اہل نظر غور کیا کرتے تھے۔

یہودی کیوں سود خور ہیں، کیوں پریشاں حال ہیں؟ عیسائی انہیں کیوں اچھوت سمجھتے ہیں؟ ان کی سلطنت کیوں مٹی؟ وہ خدا کے برگزیدہ ہونے کے دعوے کے باوجود کیوں مغضوب ہیں؟ یہ سوالات ہر شخص کے سامنے فوراً آجاتے تھے۔

پھر مکہ کی تجارت کا انحصار صرف حج پر تھا۔ اس کے بازار یمن، روم اور ایران سے مال لاتے تھے، اور وہاں کے لئے عرب کی پیداوار مہیا کرتے تھے۔عرب میں مزدور زیادہ اور تاجر کم تھے۔کسی مضبوط سلطنت کے نہ ہونے کی وجہ سے راستے بھی محفوظ نہ تھے، اس لئے جو لوگ ایرانی اور رومی شہنشاہیتوں کے باشندے تھے، اُن کا تمدُن یقیناً عرب تمدّن سے بدرجہا ترقی یافتہ تھا، لیکن اس میں گھُن لگ گیا تھا اور دونو شہنشاہیتیں مذہبی ٹھیکہ داروں کے زیر اثر تھیں ایک میں خدا اور شیطان برابر کے حصّہ دار تھے اور شاید اسی کے اثر سے دوسری شہنشاہیت میں بھی نصرانیت نے یہ مان لیا تھا کہ اس دنیا میں شیطان کا راج ہے۔اور گرجوں میں تین قوتوں کے ایک مجموعے کے سامنے (جس کا نام خدا باپ تھا) یہ دعا مانگی جاتی تھی کہ اگرچہ تیری بادشاہت آسمان پر ہے لیکن ابھی تک وہ زمین پر قائم نہیں ہوئی۔یہاں شیطان غالب ہے" ہماری دعا ہے کہ زمین پر بھی تیری بادشاہت اُسی طرح ہو جس طرح آسمان پر ہے۔" غرضکہ دونو جگہ مذہب ایک آلہ تھا جس کے ذریعے سے شہنشاہانِ وقت عوام کو جاگیرداروں، پوپ اور دستوروں کے ذریعے سے اپنے قبضہ میں کئے ہوئے تھے اور ذہنی اور جسمانی غلامی عالمگیر تھی!

بُصریٰ ایک تجارتی منڈی تھی۔کاروان یہاں پہنچا تو ایک نصرانی راہب کی خانقاہ میں ٹھیرے۔اس کا نام بحیرا تھا، اور وہ غالباً نسطوری عقائد کا عیسائی تھا، یعنی خدا کو ایک

مانتا تھا۔ اُس نے قافلے والوں کی خاطر تواضع کی۔ مکہ کی سادہ اور بے کیف زندگی کے مقابلے میں اس زاہدِ خلوت نشیں کی زندگی اور اس کی لذتیں یقیناً بہت نظر فریب تھیں۔ مکہ میں بارش کی قلت کی وجہ سے جو عمارتیں بنائی جاتی تھیں اُن کے مقابلہ میں بُصرے کی عمارتیں عالیشان محل معلوم ہوتے تھے۔ مکہ میں راتوں کو چراغ بھی نہ جلتا تھا۔ عورت مرد سب رفع حاجت کے لئے باہر میدان میں جاتے تھے، آٹا چھاننے کی چھلنی تک وجود میں نہ آئی تھی۔ اس کے مقابلہ میں خانقاہ کی چاندی کی شمعیں، جو رات بھر زاہدوں کے عالیشان کمروں کو جگمگاتی تھیں، کتنی جاذب توجہ ہوئی ہونگی! پھر، پانی کی کثرت نے باغات کے علاوہ صاف کپڑوں اور صاف خوبصورت جسموں کا نظارہ بھی پیش کیا ہوگا۔ رومیوں کے زرق برق ہتھیار اور لباس، یہودیوں کے رنگین چوغے، تاجروں کے تیز رفتار گدھے، باغات کے پھول پھل اور پرندوں کے چہچہے ایک نیا عالم پیش کرتے تھے۔ لیکن مکہ سے زیادہ یہاں حبشی و تکرونی غلام نمایاں نظر آتا تھا۔ مکہ میں تو غلام، جزوِ خاندان تھا اور آقا و مالک میں قانونی و سماجی فرق کے علاوہ بدیہی طور پر کوئی بڑا امتیاز نہ تھا، لیکن دولت کے چوچلوں، اور حکومت و مذہب کے امتزاج نے، یونانی فلسفہ اور رومن سیاست کو غلامی کے متعلق جو سبق پڑھایا تھا، اُس کا نمونہ ہر کوچہ و بازار، ہر صومعہ و خانقاہ میں نظر آتا تھا۔

بہر حال ابوطالب نے کافی نفع پر اپنا مالِ تجارت بُصریٰ میں فروخت کردیا، اور اپنے محبوب بھتیجے کے ساتھ، ضروریاتِ زندگی خریدتے ہوئے مکہ واپس آئے۔

حربِ فجّار

آنحضرتؐ کی عمر بیس سال کی ہوگی کہ قریش اور قیس کے قبیلوں میں ایسے زمانے میں

جنگ چھڑ گئی جس میں لڑائی حرام تھی اور یہ مہینے (ذی الحجہ اور محرم) ایسے تھے جن میں خون بہانا اور لڑنا ناجائز تھا۔ اس لڑائی میں حرب بن امیہ قریش کا سپہ سالار تھا۔ آپؐ بھی اس جنگ میں شریک تھے، لیکن خود نہیں لڑے، حالانکہ آپؐ کی عمر (بقول امام سُہیلی) لڑائی کی عمر تک پہنچ گئی تھی۔ اِس لڑائی کو فِجار اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ لڑائی عربوں کے مقرر کردہ رواج کے مطابق ناجائز تھی۔

لڑائی سخت تھی اور دونو طرف کے بہت سے سُورما کام آئے۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ دونو قبیلے بہت کمزور ہو گئے، اور صلح ہو گئی۔

حلف الفضول

حرب فجار کے بعد مظلوموں کی حمایت کے لئے ایک مجلس قائم ہوئی۔ اس کا نام، ایک قدیم مجلس کے نام پر "حلف الفضول" رکھا گیا۔ امام سُہیلی کا خیال ہے کہ چونکہ اس معاہدے میں یہ لفظ تھے "فضول" یا گری پڑی چیزیں اُن کے مالکوں کو واپس کر دی جائیں، اس لئے اس جماعت نے جو معاہدہ کیا، وہ "حلف الفضول" کے نام سے مشہور ہوا۔

عموماً مکہ کے زائرین پر بعض جاہل اور سرکش لوگ مختلف قسم کے ظلم کیا کرتے تھے اور اُنکی کوئی داد فریاد نہ تھی۔ اگر کسی بات پر آپس میں جھگڑا ہو جاتا (حالانکہ حج کے مہینوں میں جھگڑا منع تھا) یا غیر موسم میں کوئی غیر شخص کسی قریشی سے اپنا قرض واپس مانگتا، یا کوئی انصاف چاہتا، تو کوئی ایسی جماعت نہ تھی کہ اس معاملے کو چکا دے اور حق دار کو حق دلوائے۔ یہ جماعت گویا ایک قسم کے منصف تھے جو مجبوروں اور مظلوموں کی دادرسی کی خدمت انجام دینا چاہتے تھے۔

زُبیر بن عبد المطلب نے بنو ہاشم کو اس تحریک میں اپنا ہم خیال بنایا۔ اس کے بعد

بنو زہرہ اور بنو تمیم بھی اس خدمت کے لئے تیار ہو گئے اور عبداللہ بن جدعان کے یہاں یہ طے پایا کہ ہم سب ظالموں کی بیخ کنی کر دیں گے اور ہر مظلوم اور فریادی کی حمایت کریں گے۔

آنحضرتؐ بھی بنو ہاشم کے ساتھ اس معاہدے میں شریک تھے اور بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ "وہ معاہدہ مجھے اتنا عزیز تھا کہ اگر اس کے بدلے میں مجھے کوئی بیش قیمت سُرخ رنگ کے اونٹ بھی دیتا تو میں قبول نہ کرتا۔ اور اب بھی حمایت مظلوماں کے لئے ایسی جماعت بنے تو مَیں اُس میں شریک ہونے کو تیار ہوں۔"

تعمیر کعبہ و حجرِ اسود

کعبہ کی عمارت ایک پختہ چاردیواری تھی۔ اس کے چاروں طرف گردش کرنے کو طواف کہتے ہیں۔ یہ طواف اُس مقام سے شروع کیا جاتا تھا، اور اب بھی کیا جاتا ہے جہاں دو دیواروں کے کونے پر حجرِ اسود لگا ہوا ہے۔ اُس زمانے میں اس کی دیواریں صرف قدِ آدم اونچی تھیں۔ اور اس کے اندر مختلف بُت اور دیوی دیوتاؤں کی تصویریں تھیں۔ چھت پر ہُبل کا سب سے بڑا بُت تھا (ممکن ہے کہ ہُبل مخفف ہو "ھو بعل" کا، جو ایک سامی لفظ ہے، یا خود سامی قوم کے لوگوں نے ہُبل کو صرف "بعل" بنا لیا ہو، جو بابلی اور عربی دونوں زبانوں میں "مالک" یا "آقا" کے معنے رکھتا ہے)

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ دیوی، دیوتاؤں، بتوں اور بزرگوں اور اُستادوں کی عبادت کا طریقہ اب تک ہندوستان میں یہ ہے کہ جس کی عبادت کرنا ہوتی ہے اُس کا طواف کرتے ہیں۔ اسے سنسکرت میں "پے کرما" کہتے ہیں۔ اور یہی طریقہ مغل اقوام میں بھی جاری تھا۔ اس کا مقصد غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کرنیوالا اپنے معبود پر اپنی جان تصدق کرنا چاہتا ہے۔ اور طواف کرنے

کے بعد خود اپنی جان تو نہیں دیتا، لیکن اپنے بدلے کسی جانور کو دیوتا پر ذبح کر دیتا ہے۔ غالبًا اسی رسم کی پابندی میں بابر نے اپنے بیمار بیٹے کا طواف کیا تھا اور خود مر گیا اور بیٹا اچھا ہو گیا۔ ہندوستان میں اب تک کوّے، کبوتر وغیرہ سر کے گرد پھرا کے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اور جانور بھی جان کے بدلے میں ذبح کئے جاتے ہیں!

کعبہ (جس سے انگریزی لفظ کیُوب (Cube) بن گیا ہے) مکہ کی وادی کے سب سے نشیب والے حصے میں ہے۔ اور جب کبھی سخت بارش ہو جاتی تو پورا سیل اس جگہ جمع ہو کر اس عمارت کو ڈھا دیتا تھا۔ اس لئے اس عمارت کو پختہ بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے اسے ڈھا دیا گیا اور نئے سر سے بنانا شروع کیا۔ قریش کا ہر شخص اس مقدس کام میں شریک تھا۔

اسی زمانے میں یہ اتفاق ہُوا کہ جدّہ کے قریب ایک رومی تجارتی جہاز ساحل سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور ولید بن مغیرہ نے اُس کے تختے خرید لئے اور اُسی جہاز کے ایک رومی معمار کو ساتھ لا کر عمارت کعبہ بنانے میں مدد لی۔ اب تک کعبہ پر چھت نہ تھی۔ جہاز کے تختوں سے چھت بنائی گئی اور اس پر ہُبل نصب کر دیا گیا۔ غالبًا یہ جنگی دیوتا تھا، اس لئے کہ جنگ اُحُد میں ابو سفیان نے اسی کی جے پکاری تھی (اُعْلُ ھُبَل)

دیواریں تیار ہو گئیں تو اُس سیاہ پتھر کے لگانے کا وقت آیا جسے حجرِ اَسوَد کہتے تھے۔ یہ پتھر دیواروں کے کونے پر قدِ آدم بلندی پر اب بھی لگا ہُوا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح لگایا گیا ہے کہ ۲۱ مارچ کے آفتاب کی شعاعیں براہ راست اس پر پڑیں اور معلوم ہو جائے کہ حج کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔

ہر شخص اس فخر کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور بعض نے تو خون کے پیالے میں اُنگلیاں ڈبو کر یہ حلف لے لیا کہ اس فخر کو حاصل کرنے کے لئے جان دے دیں گے! آخر چار دن کے بعد

ابو امیہ مغیرہ نے، جو عمر میں سب سے بڑا تھا، یہ تجویز کی کہ کل صبح کو جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے وہی اس امر کا فیصلہ کرے۔ سب منتظر رہے، ایکایک حضرت محمدؐ بن عبداللہ سب سے پہلے حرم میں داخل ہوئے۔ آپؐ نے جھگڑا مٹانے اور سب کو خوش کر دینے کی جو تجویز پیش کی اُس پر سب رضامند ہو گئے۔ آپؐ نے ایک چادر بچھائی، اُس پر حجر اسود رکھا اور ہر قبیلے کے نمائندہ سے چادر کے کونوں کو پکڑوا کر حجر اسود کو اٹھوایا، اور اُن کے وکیل کی حیثیت سے خود اس پتھر کو اُس کی جگہ پر لگا دیا۔ اس طرح آپؐ نے اپنی ذہانت و تدبیر سے ایک بہت بڑی خون ریزی کو روک دیا اور سب خوش ہو گئے۔

چونکہ سامان کی کمی تھی اس لئے کعبہ کی اصلی بنیاد کی کچھ زمین خالی رہ گئی۔ اُسے ایک دیوار سے گھیر دیا گیا تھا کہ جب لکڑی ملے گی، تو اسے چھتوا دیا جائے گا، مگر حالات ایسے ہوتے گئے کہ وہ اُسی طرح باقی رہ گئی۔ آنحضرتؐ کا خیال تھا کہ اسے بھی کعبہ میں شریک کر لیا جائے مگر اس خیال سے کہ شائد لوگوں میں اضطراب پیدا ہو، یہ نہیں کیا گیا۔ اور وہ دیوار اب تک اسی طرح قائم ہے اور اس کو کعبہ میں شامل سمجھا جاتا ہے، یعنی طواف اس کے باہر سے کیا جاتا ہے۔

د دوسرے تجارتی سفر

عمر سنہ ۱۲ تا سنہ ۲۵ محمدی یعنی سنہ تا سنہ عیسوی

بارہ سال کی عمر میں آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ پہلا تجارتی سفر کیا تھا۔ سیرت کی کتابوں میں، بارہ سے پچیس تک کی عمر کے درمیان، آپؐ نے جو سفر کئے، ان کا ذکر نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں بھی آپ اپنے چچاؤں کے ساتھ کسی نہ کسی سفر میں، خواہ وہ شمال کی طرف گرمی کی ابتدا محرّم میں (اپریل) ہو، یا جنوب کی طرف۔ رجب (اکتوبر) کے حرام مہینے میں

سردی کے شروع میں، کسی نہ کسی سفر میں ضرور جایا کرتے ہونگے۔

عربوں نے خون ریزی اور لوٹ مار کو محض سفر کے لئے حرام نہیں قرار دیا تھا بلکہ ان سفروں کی غرض و غایت تجارت تھی۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ حج کا زمانہ نفعوں کا زمانہ ہے۔ اس میں تجارت خوب چمکتی تھی اور تجارت کے ساتھ مرکزی عبادت گاہ کی زیارت اور فنون سیف و لسان کی نمائش بھی ہوتی تھی۔

بڑے بڑے بازار (سُوق) قائم ہوتے تھے۔ اور ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرّم میں (جو فروری، مارچ اور اپریل کے مہینوں میں ہوا کرتے تھے) عربوں کے ہر حصے کے لوگ اپنا مال تجارت مختلف بازاروں سے لاکر، پہلے مکہ میں جمع ہوتے تھے۔ اس کے بعد منیٰ، عکاظ اور دوسرے میلوں میں ہوتے ہوئے اپنے کارواں بنا لیتے تھے اور شمال کے ٹھنڈے ملکوں کی طرف، عرب کی سخت گرمی سے بچنے اور تجارت سے نفع اُٹھانے کے لئے روانہ ہو جاتے تھے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے عرب کی سب بازاریں (سُوق) دیکھی تھیں۔ اس میں شمال، یعنی بُصریٰ و شام۔ جنوب یعنی یمن۔ مغرب یعنی بحرین وغیرہ کی بازاریں شامل ہیں۔ مولٰنا شبلی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"اہل مکہ، عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تقریب سے متعدد سفر کئے۔ شام اور بُصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپؐ کا تشریف لے جانا ثابت ہے۔ عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے، ان میں جباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپؐ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے (جو یمن میں ہے) حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے، اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپؐ

دو دفعہ تشریف لے گئے، اور ہر دفعہ حضرت خدیجہؓ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔"

"نبوت کے بعد جس سال آپؐ کی خدمت میں دور دراز مقامات سے وفود آئے ان میں جب بحرین سے عبد القیس کا وفد آیا، تو آپؐ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا۔ لوگوں نے تعجب سے پوچھا: آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔" (مسند امام حنبل ص ۲۰۶) (سیرت ص ۱۳۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بحرین کے قریب خلیج فارس کا سمندر اور یمن کے ساحل پر بحر ہند اور خود جدہ میں، یا اس کے قریب بحر احمر کا ضرور معائنہ کیا ہوگا۔ اور بحر مردار کے کھنڈروں اور آباد شہروں کا دیکھنا تو صاف ظاہر ہے۔

بحرین میں مجوس، یہود اور نصاریٰ کی کافی آبادی تھی۔ اور یہاں ایران کی حکومت تھی اس کے صحراؤں میں قبائل عبد القیس، بکر بن وائل اور تمیم مقیم تھے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں منذر بن ساوی، اسپ ذی (گھوڑے کی پرستش کرنے والا) عربوں کا حاکم تھا۔ اور ہجر کا مرزبان یا حاکم سی بخت تھا۔ ۸ھ میں جب رسول اللہؐ نے ان دونو کے پاس علاء بن عبد اللہ کو بھیجا تو کُل عرب اور بعض عجم مسلمان ہو گئے، اور باقیوں نے جزیہ دینا قبول کیا۔ مجوس اور یہودی مسلمان نہیں ہوئے۔

یمن میں بھی مجوس، یہود اور نصاریٰ تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی حکومت بھی رہ چکی تھی۔ ۵۷۰ء میں ابرہہ نصرانی نے مکہ پر ہاتھیوں سے حملہ کیا تھا۔ اسی سال آنحضرتؐ کی ولادت ہوئی تھی۔ لازمی طور پر جب آپؐ ایک تاجر کی حیثیت سے یمن گئے ہونگے تو آپؐ نے یہاں کی سیاست و معاشرت پر گہری نظر ڈالی ہوگی۔ ۵۷۵ء میں شاہان حمیر کے

خاندان کے ایک شخص معدی کرب نے حبشی حکومت سے تنگ آکر قسطنطنیہ اور فارس سے مدد چاہی۔ رومیوں نے مدد نہیں کی، لیکن شاہِ فارس نے وہراز کی سرکردگی میں غلاموں کی ایک فوج بحری راستے روانہ کردی۔ آٹھ جہازوں میں بھری ہوئی فوج عدن پہنچی اور حبشی گورنر مسروق کو وہراز نے قتل کرکے معدی کرب کو تخت نشین کردیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ آنحضرتؐ کے دادا، عبد المطلب کو قریش نے یمن بھیجا تھا کہ عربی قومی حکومت کے قیام اور بیرونی حبشی حکومت سے آزادی پر معدی کرب حمیری کو مبارک باد دے۔ لیکن حبشیوں پر پورا تسلط نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بارہ سال بعد ۵۹۷ء میں پھر اسی وہراز نے حبشیوں کا قطعی استیصال کردیا، اور خود حاکم بن بیٹھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور یمن ایرانی شہنشاہیت کا ایک جزو ہو کر رہ گیا۔ جب اسلام پھیلا تو باذان مطیع ہوگیا۔ اور ابن اسحٰق (بروایت بلاذری) نے بھی لکھا ہے کہ ملوک حمیر حارث ونعیم، و شرح ابنائے عبد کلال اور نعمان ومعافر وہمدان مسلمان ہوگئے تھے اور جو مجوس وغیرہ اسلام نہیں لائے تھے ان پر جزیہ لگایا تھا۔

ان سب مقامات کے باشندوں سے آپؐ کی یقینی طور پر ملاقاتیں ہوئی ہونگی۔ مشرکین عرب تو ہر سال مکہ میں حج کے موقع پر آتے ہی تھے، لیکن وہ لوگ، جو دوسرے مذاہب سے تعلق رکھتے تھے ان میں سے مجوس اور نصرانیوں کی دو بڑی شہنشاہیتیں قائم تھیں، اور یہی لوگ اپنی حکومتوں کے اثر سے تجارت وتمدن کے اجارہ دار تھے، لیکن ان دونو فریقوں کے مذہبوں میں بنیادی فرق تھا۔ ایک الٰہین (دو خداؤں) کا قائل تھا۔ دوسرا تثلیث میں مبتلا تھا۔ آنحضرتؐ کی مکی زندگی اور مکی قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے بعد جن اقوام کی طرف آپؐ کا روئے سخن اور قرآن کا پیغام تھا وہ مجوس اور نصاریٰ ہی کی طرف تھا۔ یہود کا ذکر ضرور آتا ہے لیکن ان کی کوئی

آزاد سلطنت نہ تھی، اور توراۃ کی تعلیم کے مطابق انہیں ایک ہی خدا اور ایک عالمگیر مذہب کا پابند ہونا چاہیئے تھا، لیکن وہ مرورِ زمانہ سے اتنے گر گئے تھے کہ شاید بالکل ناقابلِ اصلاح تھے۔

سیّدنا محمدؐ بن عبداللہ کا بی بی خدیجہؓ سے نکاح

جب آپؐ بُصریٰ کے تجارتی سفر سے واپس آئے، اور تقریباً تین مہینے گزر گئے تو بی بی خدیجہؓ نے آپؐ کے ساتھ نکاح کی خواہش کی۔ آپؐ کی امانت و دیانت کی خبریں تو مشہور ہی تھیں، لیکن بی بی خدیجہؓ کو اپنی پونجی سپرد کر دینے پر جو پھل ملا، اس کا انہیں ذاتی تجربہ ہو گیا میسرہ نے بھی، جو بی بی خدیجہؓ کا غلام تھا، آپؐ کی شرافت و دیانت، خُلق و متانت کی تعریف کی۔ یہ غلام، اس سفر میں آپؐ کے ساتھ تھا۔

بی بی خدیجہؓ نے نفیسہ بنت مُنبہ کو بلایا، اور کہا کہ میں محمدؐ بن عبداللہ سے نکاح کرنا چاہتی ہوں، اگر تم انہیں اس بات پر مائل کر دو تو بہت اچھا ہو۔ یہ سن کر نفیسہ، الامینؐ کے پاس گئیں اور بولیں:
نفیسہ: "محمدؐ! انہیں کس چیز نے نکاح سے باز رکھا ہے؟"

الامینؐ: "میرے پاس نہ مال ہے نہ دولت۔ شادی کس طرح کروں؟"

نفیسہ: "اگر یہ چیز پُوری کر دی جائے۔ اور تم جمال، مال، شرف اور کفائت کی طرف بُلائے جاؤ تو کیا تم قبول نہ کرو گے؟"

الامینؐ: "ایسی کونسی خاتون ہے جس میں یہ سب صفتیں پائی جاتی ہیں؟"

نفیسہ۔ "خدیجہ!"

الامینؐ: "میں اس کام کو کیسے انجام دوں؟"

نفیسہ۔ "میرا ذمہ ہے کہ یہ کام ہو جائے گا"

اتنا اشارہ پاکر نفیسہ خوش خوش بی بی خدیجہؓ کے پاس گئی، اور انہیں یہ خوشخبری سنائی بی بی خدیجہؓ نے جناب الامینؐ کو ایک مقررہ وقت پر آنے کے لئے کہا، اور اپنے چچا عمرو بن اسد کو بھی بلایا۔ اس نے محمدؐ الامین سے بی بی خدیجہؓ کا نکاح کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد، حرب فجار سے پہلے فوت ہو چکے تھے (از طبقات ابن سعد ص ۸۴)

بعض روایات میں ہے کہ بی بی خدیجہؓ کی طرف سے مہتمم نکاح ورقہ بن نوفل تھے۔ (یہ بی بی خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی تھے) اور ابو طالبؓ نے خطبۂ نکاح پڑھا تھا اور نکاح منعقد کیا تھا اور پانسو، سونے کے درہم مہر مقرر ہوا تھا۔ نکاح کے وقت جناب محمدؐ الامین کی عمر پچیس سال، اور اُم المؤمنین خدیجہؓ کی چالیس سال کی تھی۔

اُم المومنین خدیجہؓ مکہ کی ایک مالدار خاتون تھیں۔ ان کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا تھا، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا نکاح ابو ہالہ ھند بن نباش تمیمی سے ہوا تھا۔ ان سے تین لڑکے ھالہ، طاہر اور ہند پیدا ہوئے اور اسلام لائے۔ طاہرؓ بن خدیجہؓ کو آں حضرتؐ نے یمن کے ایک حصے کا والی بنا دیا تھا۔ ہندؓ بن خدیجہؓ حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں سے تھے، اور جنگ جمل میں شہید ہوئے۔

ام المومنین خدیجہؓ الطاہرہ کی ایک بہن ہالہؓ بنت خویلد تھیں۔ یہ بھی اسلام لائیں۔ ان کے شوہر ربیع تھے۔ ان سے ابوالعاصؓ بن ربیع پیدا ہوئے تھے اور آنحضرتؐ کے داماد تھے۔ ان کے ساتھ سیدہ زینبؓ بنت خدیجہؓ بیاہی ہوئی تھیں۔ یہ غزوۂ بدر کے بعد مسلمان ہو گئے۔

حضرت خدیجہؓ کے حقیقی بھائی کا نام عوّام تھا۔ جن کے بیٹے الزبیرؓ بن العوام عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

حضرت خدیجہؓ، رسول اللہؐ سے ۱۵ سال بڑی تھیں، یعنی عام الفیل سے ۱۵ سال پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ رسول اللہؐ سے نکاح کے بعد جب آپ کی عمر ۶۵ سال کی ہوئی تو شعب ابوطالب سے خروج کے بعد انتقال فرمایا۔ یہ رمضان ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔

آپ کے ہاں رسول اللہؐ سے چار بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ یعنی زینبؓ، رقیہؓ فاطمہؓ اور ام کلثومؓ اور دو بیٹے قاسمؓ اور طیبؓ (یا طاہر) جو صغر سن ہی میں وفات پا گئے۔ سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے اور دو سال کی عمر میں وفات پائی۔ پھر اسی زمانۂ قبل نبوت میں علی الترتیب زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ پیدا ہوئیں۔ اور نبوت کے بعد عبداللہؓ پیدا ہوئے جن کا نام الطیب الطاہر کر دیا گیا۔

صفیہ بنت عبدالمطلب کی لونڈی سلمیٰ، قابلہ کا کام کرتی تھی۔ ہر لڑکے کی ولادت پر دو بکریاں اور لڑکی کی ولادت پر ایک بکری عقیقہ کی جاتی تھی۔ ہر بچے کی ولادت میں ایک سال کا فاصلہ ہوتا تھا۔ سلمیٰ ہی دودھ پلاتی تھی۔

حالات الامینؐ ۲۵ سنہ محمدی سے ۴۰ سنہ محمدی تک

(یعنی ۵۹۵ء سے ۶۱۰ء تک)

جناب الامینؐ کی جوانی تک کے حالات کتنے مختصر ہیں! محض رنگ آمیزی کے لئے اس زمانے کے پس منظر کو بیان کرنا پڑتا ہے، ورنہ جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اتنا ہے کہ آپؐ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانا شریف ونبیل (Noble) تھا۔ یعنی مکہ کے نظم ونسق میں آپؐ کے پردادا ہاشم کا بڑا ہاتھ تھا۔ پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کے سلسلے میں جو بُت پرستی رائج تھی، اس کو جاری رکھنے کے لئے، یا اُس کے ذریعے سے دولت واقتدار حاصل کرنے کے لئے قریش کے دو فریق ہو گئے تھے۔ جس زمانے میں آپ جوان تھے اُس وقت بنوامیہ کے قبیلے کا ایک شخص یعنی حرب فوجی سردار تھا۔ اور آپؐ کے خاندان ہاشمی کے پاس صرف زمزم یعنی پانی پلانے کی ڈیوٹی (سقایہ) رہ گئی تھی۔

آپؐ مکہ والوں کی بکریاں چراتے تھے، پھر اپنے چچا کے ساتھ شام گئے، اور شام سے واپسی پر، حرب فجار میں آٹھ سال بعد شریک ہوئے۔ کعبہ میں حجرالاسود لگایا، بی بی خدیجہؓ کی تجارت کے مہتمم رہے اور پھر پچیس سال کی عمر میں ان سے شادی ہو گئی۔

حضرت ام المؤمنین خدیجہؓ مال دار تاجر تھیں۔ شادی کے پندرہ سال بعد جناب محمد الامینؐ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ان پندرہ برسوں کا کوئی حال ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپؐ اس درمیان میں بھی شغل تجارت میں مصروف رہے ہونگے۔ اور عرب اور عرب سے باہر کے بازاروں اور شہروں میں آتے جاتے رہے ہونگے۔

آپؐ کی زوجہ محترمہ مشرکہ تھیں، ان کی لڑکیاں بھی مشرکوں ہی سے بیاہی گئی تھیں،

اس لئے یہ کہنا کہ اسلام سے پہلے آپؐ نے عربی معاشرت کے مشرکانہ پہلوؤں سے گریز کیا ہوگا تسلیم کرنا مشکل ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح اونچے تمدّن اور بلند خیالات کو قبول کرنے کی صلاحیت ہر متفکّر میں موجود ہوتی ہے، اس لئے آپؐ نے ضرور عربوں اور ہمسایہ قوموں کے تمدّن، مذہب اور قابل اعتراض طرز حکومت کا تقابل کیا ہوگا۔ اور بعض باتوں کو بہتر اور بعض کو ناقص پایا ہوگا۔

یہودی اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ عربوں کے لئے اس کے کھانے کے کافی مواقع تھے۔ بلکہ وہ تو سوسمار تک کھا جاتے تھے! اس سلسلہ میں جب آپؐ نے غور کیا ہوگا، تو آپ کے قلب سلیم نے یقیناً ایک اچھی اور پاکیزہ راہ کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔

قانون حمورابی، قانون یہود (توراۃ) اور قانون مجوس (جو محض بادشاہ اور دستوروں کے حقوق کا ایک نام تھا) کے نمونے آپؐ کے سامنے موجود تھے۔ ہر جگہ غلام، مسکین، عورت، قیدی مقروض اور مظلوم آپؐ کے سامنے تھے۔ اور ان سب کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ انسان، انسان کو کھا جانا چاہتا تھا، اپنی زندگی کے لئے دوسرے کو فنا کر دینا معمولی بات سمجھتا تھا۔ اور اپنی بقا کے لئے اُس نے سیاسی و مذہبی گروہ بھی بنا لئے تھے، جو اندھا دُھند مطلق العنان ملوکیت کے حامی تھے

اسی لئے اس پندرہ سال کی متاہل زندگی کے بعد، جب الامینؐ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو آپؐ نے دنیا کو ایک ایسا پیغام سُنانے کا ارادہ کیا، جسے وہ سُن تو پہلے ہی چکے تھے، لیکن سُن لینے کے باوجود، عمل سے قاصر تھے۔

چالیس سال کی عمر میں جوانی کا ہیجان کم، اور پختہ کاری کی ناگزیر متانت شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے آپؐ صرف پیغام سنانے پر ہی قانع نہ تھے بلکہ آپ ایک ایسی منظم (Disciplined) جماعت بنانا چاہتے تھے جسے مسلم یا فرماں بردار و جان نثار کہہ سکتے ہیں۔ یہ جماعت، مجبور و مقہور

انسانیت کو اُس غلامی سے نکالنا چاہتی تھی، جس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اُس کے قوائے ذہنی وجسمانی مفلوج تھے۔ یہ جماعت، اپنی جان کو دوسروں کے لئے فدا کرنے والوں کی جماعت تھی اس کا نام مسلم و مؤمن تھا۔

تیسری فصل

خلاصۂ تاریخ عالم

ابتدائے تاریخ انسانی سے موجودہ زمانے تک جو اہم باتیں ہوئیں، اور جن کی وجہ سے انسانی خیالات میں تموّج پیدا ہوا، ان کا ایک خاکہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف تفکرات انسانی کی تدریجی ترقی بہ یک نظر ہمارے سامنے آجاتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اب ہم کہاں ہیں، کدھر جارہے ہیں اور کدھر جاسکتے ہیں ؟

تواریخ قبل مسیح :-

۵ ہزار تا ۴ ہزار ق م بابل، مصر، اور سندھ (؟) اور یمن (؟) میں عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اور سحر و جادو، فطرت پرستی اور روح کا خیال شروع ہوا۔

۳۸۰۰ ق م عکاد بادشاہ سرغون اور اس کے بیٹے نارم سِن نے بابلونیہ کو متحد کیا، اور سامی نسل کی شہنشاہیت قائم کی۔ اس میں شام اور فلسطین بھی شامل تھے۔

۴۰۰۰ — ۳۵۰۰ ق م جیزہ کا ہرم مصر میں بنا۔ اور قدیم مِصریوں کی "کتاب مُردگاں" لکھی گئی۔

۳۱۰۱ ق م ہندو سنہ کل جگ شروع ہوا۔

۲۹۵۰ ق م فوہی، شہنشاہ چین نے مندروں اور مقبروں میں عبادت کی بنیاد ڈالی۔ آب پاشی، ناچ گانا اور تہذیب پھیلائی۔

۲۳۰۰ ق م یاؤ اور شُن حکمائے چین نے غالباً کتاب "شوکنگ" تصنیف کی۔ جس کی کنفوشے نے پیروی کی۔ یہ چینیوں کا "ست جگ" تھا۔

۱۷۰۰ ق م آرین قوم ہندوستان میں داخل ہونے لگی۔ اور ویدوں کے بھجن تصنیف ہونے لگے۔
غالباً اسی زمانے میں زردشت بھی تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ۱۰۰۰ء قبل مسیح یا
۶۰۰ء ق م میں تھے۔

۱۷۰۰—۱۴۰۰ } ق م سامی قبائل کا خروج۔ سیدنا ابراہیمؑ، اسمعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ۔
یا
۲۰۰۰—۱۶۰۰ } توریت کے باب تکوین کی تصنیف۔

۱۴۰۰ ق م فلسطین پر مصری قبضہ

۱۳۰۰ ق م حضرت موسیٰ۔ مصر سے خروج۔

۱۳۰۰—۱۰۳۰ ق م کنعان کی فتح۔ قاضیوں کی حکومت۔

۱۰۳۰ ق م بنو اسرائیل کا پہلا بادشاہ طالوت۔

۱۰۰۰ ق م فینیقیوں نے یہودیوں کی عبادت گاہ تعمیر کی۔ اور ہاتھی دانت، بندر، مور اور
صندل مہیا کیا۔ اس میں بہت سے نام ہندوستانی تھے۔ انہوں نے افریقہ
کے گرد کشتیوں سے سفر کیا۔ اور ہندوستان سے تجارت کی بنیاد ڈالی۔

۱۰۱۰—۹۷۳ ق م سلطنت داؤدؑ

۹۷۳ ق م سلیمانؑ بادشاہ ہوئے۔

۱۰۰۰—۹۰۰ ق م اشوریہ کا عروج۔ ہومر شاعر یونان کا زمانہ۔

۹۳۰ ق م سلطنت کنعان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اسرائیل شمال میں اور یہوداہ جنوب میں۔

۸۶۰ ق م ایلیاہ۔

۸۰۰—۷۰۰ ق م اسرائیلی رسول (عموس، ہوسیا، عیسائیہ، میکاہ)

۷۲۱ ق م اشوریہ نے سلطنت اسرائیل کو تباہ کر دیا۔

۶۲۱ ق م "کتاب قانون" یعنی توراۃ معبد میں دستیاب ہوئی۔

۶۰۴-۵۱۷ ق م لوتسز، ہادیٔ چین ہونان میں پیدا ہوئے۔

۶۲۳-۵۵۶ ق م گوتم بدھ (آخری بدھ) ہندوستان میں تھے۔

۵۲۸-۵۲۶ ق م مہابیر (ویسالی کے قریب) پیدا ہوئے۔ ہادیٔ جینیاں۔

۵۸۵ ق م یونان عظیم یعنی ایشیائے کوچک میں فیثاغورث پیدا ہوا۔

۵۳۹ ق م بابل پر کیکاؤس کا قبضہ

۵۳۶-۳۳۳ ق م فلسطین پر ایرانیوں کی حکومت۔

۵۱۷ ق م لوتسز کی وفات اور بدھ کی شکل میں جنم لینا۔

۵۵۰-۴۷۸ ق م کنفوشس چینی رہبر۔

۴۸۳ ق م یونان کا فلسفی زینو الٰہیات کی تعلیم دیتا ہے۔ اور ہرقلیطوس مذہب کو جنون بتاتا ہے

۴۵۸ ق م عزیر فلسطین میں بہت سے مہاجر یہودیوں کو لے کر آتے ہیں۔

۴۲۴ ق م دمقراطیس بدھ کی تعلیم کے مطابق فراغت کاملہ کی تعلیم دیتا ہے۔

۴۲۰ ق م سقراط۔

۴۱۸ ق م یروشلم کا معبد نئے سرے سے بنایا جاتا ہے۔ افلاطون۔

۴۰۰ ق م ارسطو کہتا ہے کہ مجوسی، مصریوں سے زیادہ قدیم ہیں۔

۳۸۷ ق م دیوجانس کلبی گوتما کی یہ تعلیم پھیلاتا ہے کہ روح محض ایک زندگی کی طاقت ہے اور جسم (یا مادے) سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے۔

۳۷۷ ق م بدھ مذہب کے سات سو عالم ویسالی میں جمع ہوتے ہیں اور دوسری دفعہ بدھ مذہب کی بنیادی تعلیمات مرتب کرتے ہیں۔

۳۶۰ ق م من سی اس چین میں کنفیوشس کی تعلیم پھیلاتا ہے۔

۳۳۱ ق م اربیلا پر فارسیوں کو سکندر اعظم شکست دیتا ہے۔ اور آتشکدہ میں سپاہیوں کی بدمعاشی سے بعض دساتیر جل جاتی ہیں۔

۳۲۰ ق م بطلیموس سوتر مصر پر قبضہ کر لیتا ہے اور ایک لاکھ یہودیوں کو پکڑ لاتا ہے اور اسکندریہ میں آباد کر دیتا ہے۔

۳۰۰ ق م اوشا اور ژند کا یونانی ترجمہ ہوتا ہے۔ اور مزدیوں نے اپنی کتابیں جمع کرنا شروع کر دی ہیں۔

۲۹۸ ق م تھیوڈوٹس بختیاریہ کا بادشاہ ہو جاتا ہے۔ جہاں جین مت، بدھ مت اور مذہب زردشت موجود ہے۔ اور یہودی ہرات و بلخ میں موجود ہیں۔

۲۵۹ ق م اشوک اعظم شہنشاہ ہند ہے۔ اپنے کو دیونام پیا (حبیب اللہ) کہتا ہے۔ وہ زینو سے خط و کتابت کرتا ہے۔

۲۵۰—۲۰۰ ق م سکندریہ میں توارۃ السبعین کا یونانی ترجمہ ہوتا ہے۔

۲۴۲ ق م بدھوں کی تیسری مجلس بمقام پٹنہ ہوتی ہے اور برہمنوں کو دور کرتی ہے۔ اور اشوک بجائے حبیب اللہ کے "پیادسی" (محب خیر) کا لقب اختیار کر لیتا ہے۔ ہندوستان میں بدھ مذہب راج دھرم ہو جاتا ہے۔

۲۴۱ ق م برہمنوں پر مظالم شروع ہوتے ہیں۔

۲۱۸ ق م بلخ میں نو وہار (آتشکدۂ نوبہار) بدھوں کا مندر بن جاتا ہے۔

۱۶۸ ق م معبد یہود میں "ذی اس" دیوتا کی پوجا شروع ہو جاتی ہے اور مقدس کو ناپاک کیا جاتا ہے۔

۱۶۷-۱۶۳ ق م یہود کو آزادی۔ مقدس کی طہارت۔

۶۳ ق م پمپے نے یروشلم کو فتح کر کے یہودیہ کو رومی صوبہ بنا دیا۔

۴۰ ق م اتفاقاً برو کیتم کے کتب خانے میں آگ لگ گئی اور چار لاکھ چالیس ہزار کتابوں کے ساتھ توراۃ السبعین بھی جل گئی۔

۳۷-۴ ق م ہیرو، فلسطین کا روم کی طرف سے حاکم ہوتا ہے۔

۱۹-۱۰ ق م ہیرو، یروشلم میں تیسری بار مقدس بناتا ہے۔

۵ ق م ولادت عیسےٰ مسیحؑ۔

بعد مسیح

۲۸-۳۰ ء یسوعؑ ناصری کا علانیہ تبلیغ دین۔

۳۰ ء یسوعؑ کو بقول یہود صلیب دی گئی۔

۱۰-۶۵ ء سنیکا رواقی، جسے شہنشاہ کلی گلا نے جزیرہ کارسیکا میں جلا وطن کر دیا (۴۱ء) پھر ۴۹ء میں وہ ظالم نیرو کا اتالیق مقرر ہوا۔ پھر نیرو کے حکم سے اس نے خودکشی کر لی۔

۷۰ ء رومیوں نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ اور طیطوس نے مقدس کی معیاری توراۃ کو رومہ بھیج دیا۔

۸۱-۸۵ ء فلسفی ایکٹیٹوس اور طسی طوس۔

۱۲۸ ء بد دماغ اکیلاس نے توراۃ کا یونانی ترجمہ شروع کیا۔

۱۳۰-۱۳۲ ء شہنشاہ ہیڈریان نے یروشلم کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور وہاں یونانی دیوتا جوف کا مندر بنایا۔ یہودیوں نے بغاوت کی اور جلا وطن کیے گئے۔

۱۴۰ ء باسلیڈیس نے الحاد پھیلایا۔

۱۶۰ ء شہنشاہ مارکس آریلیس (۱۲۱--۱۸۰ء)

۲۱۵ ء ایک قصہ یہ مشہور ہوا کہ تورات السبعین ایک پیپے میں دستیاب ہوگئی، جس طرح یہودیوں کے بابلی اسیری کے زمانے میں قانون موسوی ایک کنوئیں میں محفوظ رہ گیا تھا۔ لیکن یہ کتابیں ۴۷ ق م اور ۳۹۰ء میں بالکل ضائع ہوگئی تھیں

۲۲۲ ء نائس کی پہلی عیسوی مذہب کی مجلس ہوئی۔ اس زمانے میں علوم ریاضی علانیہ پڑھائے جاتے تھے۔

۲۳۰ ء آرِگلو لکھتا ہے کہ جتنی بھی یہودی اور عیسوی کتابیں ہیں سب محرّف ہیں۔

۲۶۰ ء مانی نے عیسوی اور زردشتی تعلیمات کو ملانا چاہا۔

۲۷۵ ء مانی زندہ جلادیا گیا۔ اور سورج، چاند اور بزرگوں کی مورتیں پورے ایران میں برباد کردی گئیں۔

۲۹۰ ء فرفوریوس فلسفۂ افلاطون کی تعلیم دے رہا ہے (۲۳۳ - ۳۰۵ء)

۳۱۳ ء زردشتی، بدھ اور عیسائی کیپیانا اور بختار یہ میں پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔ اور چین میں زرتشتی مذہب کی اشاعت ہوتی ہے۔

۳۱۵ ء قسطنطین (گو عیسائی نہیں تھا، لیکن) عیسائیوں کی حمایت کرتا ہے۔ فرفوریوس مشرقی بدھ مت کو بیان کرتا ہے۔ چینی کہتے ہیں کہ ۷۰۰ ق م میں زردشت، آتش پرستی کی تعلیم دیتا تھا۔

۳۲۱ - ۳۲۳ء قسطنطین نے حکم دیا، کہ سورج کا دن (اتوار) مقدس مانا جائے۔

۳۲۳ ء سکندریہ کی کلیسائی مجلس نے آریوس (موحد عیسائی) کو ملعون قرار دیا۔

۳۳۰ ء سینٹ صوفیہ کی تعمیر کے سلسلے میں قسطنطین نے قدیم مندروں کو منہدم کردیا۔

۳۳۵ ء قسطنطین بستر مرگ پر عیسائی مذہب تسلیم کر لیتا ہے۔

۳۶۱ ء جولین نصرانیت کو مردود قرار دیتا ہے۔

۳۶۵ ء مشرقی اور مغربی کلیسا الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

۴۰۸ ء نصرانیت ایران میں پھیلتی ہے (فرقہ ڈوناٹسٹ)

۴۲۲ ء سوسا کے آتشکدوں کو عیسائی ڈھا دیتے ہیں۔

۴۳۱ ء اِفی سَس کی تیسری کلیسائی مجلس۔ نسطوریت۔ پلاجیس اور کے لِس ٹِیس کو کافر قرار دیتی ہے۔

۵۱۶ ء دائیونی سی یوس راہب نے مسیحؑ کی تاریخ ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اور عیسوی سنہ رائج کیا۔

۵۳۵ ء خسرو نوشیرواں نے مذہب مزدک کو فنا کر دیا۔

۵۵۰ ء اس وقت سمرقند مشرق کا یونان کہلاتا تھا۔ (اسے ۱۲۱۸ء میں چنگیز خاں نے برباد کر دیا)۔

۵۷۰ ء میلاد محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم)

۵۶۷-۵۷۲ ء نوشیرواں کل یونانیوں کو عرب و عراق سے نکال باہر کرتا ہے۔ افریقہ اور اطالیہ کا ایک حصہ فتح کر لیتا ہے۔ اور یونان، شام، روم و ہند کی بہترین کتابوں کو پہلوی میں ترجمہ کراتا ہے۔

۵۸۰ ء نوشیرواں شکست کھا کر مر جاتا ہے۔

۵۹۱ ء خسرو پرویز (۵۹۰-۶۲۷) عراق، شام و فلسطین کو پھر فتح کر لیتا ہے۔

۵۹۵ ء پرویز، یروشلم کو فتح کر کے صلیب مقدس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ مصر، ایشیائے کوچک لے لیتا ہے اور قسطنطنیہ تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۶۱۰ ء پرویز خالسی دان میں عہد کرتا ہے کہ وہ سورج کے ایک مصلوب دیوتا اور جملہ بُت پرستی کو یکسر مٹا دے گا۔

۶۱۰ ء رسالت محمدی کی ابتداء۔

۶۱۲ ء قیساریہ پر ایرانیوں کا قبضہ۔ رومی مشرقی سلطنت کا شہنشاہ ہرقل۔

۶۲۰ ء بخاریہ میں چار ہزار عرب گھرانوں کی نوآبادی قائم ہوتی ہے۔

۶۲۲ ء ہجرت مسلمین، مدینہ کو۔

۶۲۲ ء بوڑھے خسرو پرویز سے ہرقل اعظم بعض صوبے چھین لیتا ہے۔

۶۲۷ ء خانہ جنگی میں پرویز قتل ہو جاتا ہے۔

۶۲۸ ء فتح مکہ۔

۶۲۹ ء بخاریہ کے بدھ مت کا بیان بزبان ہیون سانگ۔

۶۳۰ ء نسطوری فرقہ وسط ایشیا کی طرف بڑھتا ہے۔

۶۳۲ ء کل عرب مسلمان ہو جاتا ہے۔ وفات نبویؐ

۶۳۴ ء مسلمان دمشق، شام، فلسطین اور مصر کو فتح کر لیتے ہیں۔

۶۳۷ ء خلیفہ عمرؓ بیت المقدس میں مسجد تعمیر کرتے ہیں۔

۶۳۸ ء فتح ایران کی ابتدا

۶۴۳ ء نہاوند پر ایران کو شکست فاش۔

۶۴۴ ء چین، مسلمانوں سے امداد طلب کرتا ہے۔ تبت بدھ مت قبول کر کے انسانی قربانی ترک کر دیتا ہے اور بُت پرستی شروع کرتا ہے۔

۷۱۰ ء عربوں نے بنو اُمیہ کی خلافت کے زمانے میں سندھ اور مکران فتح کر لیا۔

۱۰۳۶ ء ولادت حکیم ابن سینا بخاری۔

۱۱۸۴-۱۲۸۲ء سعدیؒ شیرازی۔

۱۲۰۷-۱۲۷۲ء جلال الدین رومیؒ

۱۲۵۰ ء زوال سلطنت قرطبہ

۱۲۵۸ ء زوال بغداد بدست ہلاکو

۱۴۸۶ ء بہزاد (مصوّر)

۱۴۵۳ ء فتح قسطنطنیہ

۱۴۹۲ ء عرب ہسپانیہ سے نکال دیئے گئے۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔

۱۵۲۶ ء بابر نے پانی پت کی جنگ فتح کی۔ گرو نانک

۱۷۰۷ ء وفات اورنگ زیب عالمگیر۔

۱۸۲۵ ء انگلستان میں پہلی ریلوے۔

۱۸۸۲ ء وفات ڈارون

۱۸۶۹ ء نہر سویز کھولی گئی۔

۱۸۸۳ ء مصر پر انگریزی تسلّط۔

چوتھی فصل

تقویم شمسی - ولادت نبویؐ سے وفات تک

سال میلاد محمدی	سال مسیحی	خلاصہ حالات عالم	خلاصہ حالات محمدیؐ
سنہ۱ ربیع الاول	۵۷۰ (جون)	ولادت باسعادت	حلیمہ سعدیہ نے رضاعت شروع کی
سنہ۲ محرم	۵۷۱ (مارچ)		
سنہ۳ "	۵۷۲ "	خسرو پرویز کی حبشیوں سے لڑائی	حضرت حلیمہ کے ساتھ مکہ واپس لائے
سنہ۴ "	۵۷۳ "		گئے لیکن بوجہ وبا واپس کئے گئے
سنہ۵ "	۵۷۴ "		اور بقول ابن اسحٰق چھ سال بنو
سنہ۶ "	۵۷۵ "		ہوازن میں رہے جو عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا
سنہ۷ "	۵۷۶ "		آپ نے اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ کا سفر کیا
سنہ۸ "	۵۷۷ "		اور واپسی پر حضرت آمنہ کا انتقال بمقام ابواپر ہو گیا اور آپ کے کفیل عبدالمطلب ہوئے
سنہ۹ "	۵۷۸ "	حرب امیہ رئیس خاندان قرار پایا	وفات عبدالمطلب
سنہ۱۰ "	۵۷۹ "		آپ کی کفالت ابوطالب نے شروع کی
سنہ۱۱ "	۵۸۰ "	ترکوں کا ایران پر حملہ	مکہ والوں کی بکریاں اجرت پر چرانے لگے
سنہ۱۲ "	۵۸۱ "		

سال میلاد محمدی		سال مسیحی		خلاصہ حالات عالم	خلاصہ حالات محمدی
سنہ ۱۳	محرم	۵۸۲	(مارچ)		سفر شام مع ابو طالب (ابن سعد ۷۶، ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۵۸ ــ)
سنہ ۱۴	〃	۵۸۳	〃		
سنہ ۱۵	〃	۵۸۴	〃		
سنہ ۱۶	〃	۵۸۵	〃		محرم میں سوق عکاظ میں لڑائی شروع
سنہ ۱۷	〃	۵۸۶	〃		ہو گئی (حرب فجار) آپؐ اس میں
سنہ ۱۸	〃	۵۸۷	〃		شریک ہوئے (بقول بعض) حرب
سنہ ۱۹	〃	۵۸۸	〃		بن اُمیہ سالار فوج تھا۔
سنہ ۲۰	〃	۵۸۹	〃		
سنہ ۲۱	〃	۵۹۰	〃	خسرو ثانی نے قسطنطنیہ میں پناہ لی	حرب فجار بقول ابن ہشام و ابن سعد جبکہ آپؐ بیس سال کے ہو چکے تھے
سنہ ۲۲	〃	۵۹۱	〃		حلف الفضول بعد حرب فجار خطاب الامین۔
سنہ ۲۳	〃	۵۹۲	〃		تعمیر کعبہ میں حجر اسود نصب کیا
سنہ ۲۴	〃	۵۹۳	〃		
سنہ ۲۵	〃	۵۹۴			خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر شام گئے
سنہ ۲۶	〃	۵۹۵			واپسی پر ان سے نکاح کیا (ابن سعد ۸۲؍۸)
سنہ ۲۷	〃	۵۹۶			ولادت زینبؓ (زوجہ ابو العاص) سفر یمن (الحاکم فی المستدرک و ذہبی)
سنہ ۲۸	〃	۵۹۷			سفر بحرین (مسند امام حنبل ۲۰۶) ولادت رقیہؓ (زوجہ عتبہ)
سنہ ۲۹	〃	۵۹۸			سفر شام (۹)

سال میلاد محمدی	سال مسیحی	خلاصہ حالات عالم	خلاصہ حالات محمدی
سنہ ۳۰ محرم	۵۹۹ (مارچ)		ولادت ام کلثوم رضؓ (زوجہ عتبہ)
سنہ ۳۱ 〃	۶۰۰ 〃		
سنہ ۳۲ 〃	۶۰۱ 〃		ولادت فاطمۃ الزہرا رضؓ (؟)
سنہ ۳۳ 〃	۶۰۲ 〃		
سنہ ۳۴ 〃	۶۰۳ 〃	خسرو نے رومن سامراج پر حملہ کیا	ولادت طیب رضؓ (؟)
سنہ ۳۵ 〃	۶۰۴ 〃		
سنہ ۳۶ 〃	۶۰۵ 〃		ولادت طاہر رضؓ (؟)
سنہ ۳۷ 〃	۶۰۶ 〃		
سنہ ۳۸ 〃	۶۰۷ 〃		ولادت قاسم رضؓ (؟)
سنہ ۳۹ 〃	۶۰۸ 〃		
سنہ ۴۰ 〃	۶۰۹ 〃	ہرقل نے سلطنت شروع کی	
سنہ ۴۱ رمضان	۶۱۰ (دسمبر)		(۱) محمدؐ الامام (دور رب) ابتدائے نبوت جب آپ چالیس سال کے ہو چکے تو رمضان کی ۱۷ تاریخ (اکتالیسواں سال) کو غار حرا میں نزول وحی عالم خواب میں ہوئی۔ بقیہ سنہ ۴۱، سنہ ۴۲، سنہ ۴۳ محمدی میں خفیہ طور پر دعوت اسلام دیتے رہے (دعوت سر) یہ زمانہ فترۃ الوحی کا بھی مانا جاتا ہے۔
سنہ ۴۲ محرم	۶۱۱ (مارچ)		
سنہ ۴۳ ذی الحجہ	۶۱۲ (فروری) ۶۱۳ (مارچ)		
سنہ ۴۴ محرم	۶۱۳ (مارچ)		(۲) محمدؐ المنذر و المزکی محمدی سنہ ۴۴ کی ابتدا۔ یعنی محرم سے دعوت جہرا یعنی علانیہ دعوت اسلام شروع کی گئی تا ہجرت حبشہ یعنی رجب سنہ ۴۵م (دور رب۔ الہ۔ اللہ۔ ملک۔ قادر)

سال میلاد محمدی	سال مسیحی	خلاصہ حالات عالم	خلاصہ حالات محمدی
۴۵ سنہ محرم	۶۱۴ (مارچ)	خسرو نے یروشلم لوٹ لیا اور فلسطین فتح کرلیا	محمدؐ المنذر والمزکی
۴۵ سنہ رجب	۶۱۴ (اکتوبر)		″ ″ ″
۴۶ سنہ ختم ذی الحجہ	۶۱۶ (فروری)		محمدؐ المبشر والہادی (دورِ رحمان)
۴۷ سنہ محرم	۶۱۶ (مارچ)		
۴۸ سنہ محرم	۶۱۷ ″	چین میں تنگ خاندان شروع ہوا	(۴) محمدؐ المرسل - شعب ابوطالب
۴۹ سنہ ذی الحجہ	۶۱۸ ″	خسرو ثانی نے مصر، یروشلم اور دمشق فتح کرلیا - اور ایک فوج یونان بھیجی -	
	۶۱۹ ″		
۵۰ سنہ محرم	۶۱۹ ″		
۵۱ سنہ ″	۶۲۰ ″		وفات حضرت خدیجہؓ و ابوطالب
۵۲ سنہ ″	۶۲۱ ″		(۵) محمدؐ رسول اللہ
۵۳ سنہ صفر	۶۲۲ (مئی)		محرم ۵۱ سنہ تبلیغ فی القبائل تا ہجرت یثرب صفر ۵۳ سنہ محمدیؐ

سنین بعد ہجرت

محمدی	عیسوی	ہجری	واقعات عالم	واقعات اسلام
۵۳ سنہ	۶۲۲	۱ سنہ ھ		ہجرت کی اجازت - قتال کا حکم
۵۴ سنہ	۶۲۳	۲ سنہ ھ		
۵۵ سنہ	۶۲۴	۳ سنہ ھ		
۵۶ سنہ	۶۲۵	۴ سنہ ھ		

محمدی	عیسوی	ہجری	واقعات عالم	واقعات اسلام
سنہ ۵۷	۶۲۶	سنہ ۵ھ		
سنہ ۵۸	۶۲۷	سنہ ۶ھ	ایران کو ہرقل نے مغلوب کر لیا	
سنہ ۵۹	۶۲۸	سنہ ۷ھ	کاوہ ثانی نے اپنے باپ خسرو کو قتل کیا اور شاہ بن گیا۔	فتح مکہ
سنہ ۶۰	۶۲۹	سنہ ۸ھ		
سنہ ۶۱	۶۳۰	سنہ ۹ھ		کفار و مشرکین سے برات کا اعلان
سنہ ۶۲	۶۳۱	سنہ ۱۰ھ	حجۃ الوداع	اعلان ہوا کہ نسی شیطانی عمل ہے (مساوات انسانی)
سنہ ۶۳	۶۳۲	سنہ ۱۱ھ		۱۲ ربیع الاول یوم دوشنبہ مطابق ۸ جون آپ نے وفات کی (ابن سعد)

ہجرت نبوی سے وفات تک کی تفصیلی تاریخیں

	عام الاذن بالرحیل من المکہ الی المدینہ یعنی عام الاجازہ	عام الامر بالقتال	عام الامتحان	عام التہنیت علی النکاح	عام الزلزلہ
تاریخ ہجری	سنہ ۱ھ	سنہ ۲ھ	سنہ ۳ھ	سنہ ۴ھ	سنہ ۵ھ
یکم محرم	۱۹-اپریل سنہ ۶۲۲ء	۸-اپریل سنہ ۶۲۳ء	۲۵-اپریل سنہ ۶۲۴ء	۱۵-اپریل سنہ ۶۲۵ء	۴-اپریل سنہ ۶۲۶ء
یکم صفر الاول	۱۸ مئی سنہ ۶۲۲ء	۷ مئی سنہ ۶۲۳ء	۲۵-مئی سنہ ۶۲۴ء	۱۵-مئی سنہ ۶۲۵ء	۴-مئی سنہ ۶۲۶ء
(نسی) یکم صفر الثانی	—	۶ جون سنہ ۶۲۳ء	—	—	۲ جون سنہ ۶۲۶ء
یکم ربیع الاول	۱۵/۱۶ جون سنہ ۶۲۲ء	۵ جولائی سنہ ۶۲۳ء	۲۴ جون سنہ ۶۲۴ء	۱۳ جون سنہ ۶۲۵ء	۲ جولائی سنہ ۶۲۶ء
یکم ربیع الثانی	۱۶ جولائی سنہ ۶۲۲ء	۴-اگست سنہ ۶۲۳ء	۲۴ جولائی سنہ ۶۲۴ء	۱۳ جولائی سنہ ۶۲۵ء	۳۱ جولائی سنہ ۶۲۶ء
یکم جمادی الاول	۱۵-اگست سنہ ۶۲۲ء	۲ ستمبر سنہ ۶۲۳ء	۲۲-اگست سنہ ۶۲۴ء	۱۱-اگست سنہ ۶۲۵ء	۳۰-اگست سنہ ۶۲۶ء
یکم جمادی الثانی	۱۳ ستمبر سنہ ۶۲۲ء	۲-اکتوبر سنہ ۶۲۳ء	۲۱ ستمبر سنہ ۶۲۴ء	۱۰ ستمبر سنہ ۶۲۵ء	۲۸ ستمبر سنہ ۶۲۶ء
یکم رجب	۱۳-اکتوبر سنہ ۶۲۲ء	۳۱-اکتوبر سنہ ۶۲۳ء	۲۰-اکتوبر سنہ ۶۲۴ء	۹-اکتوبر سنہ ۶۲۵ء	۲۸-اکتوبر سنہ ۶۲۶ء
یکم شعبان	۱۱ نومبر سنہ ۶۲۲ء	۳۰ نومبر سنہ ۶۲۳ء	۱۹ نومبر سنہ ۶۲۴ء	۸ نومبر سنہ ۶۲۵ء	۲۶ نومبر سنہ ۶۲۶ء
یکم رمضان	۱۱ دسمبر سنہ ۶۲۲ء	۲۹ دسمبر سنہ ۶۲۳ء	۱۸ دسمبر سنہ ۶۲۴ء	۷ دسمبر سنہ ۶۲۵ء	۲۶ دسمبر سنہ ۶۲۶ء
یکم شوال	۹ جنوری سنہ ۶۲۳ء	۲۸ جنوری سنہ ۶۲۴ء	۱۷ جنوری سنہ ۶۲۵ء	۶ جنوری سنہ ۶۲۶ء	۲۴ جنوری سنہ ۶۲۷ء
یکم ذی القعدہ	۸ فروری سنہ ۶۲۳ء	۲۶ فروری سنہ ۶۲۴ء	۱۵ فروری سنہ ۶۲۵ء	۴ فروری سنہ ۶۲۶ء	۲۳ فروری سنہ ۶۲۷ء
یکم ذی الحجہ	۹ مارچ سنہ ۶۲۳ء	۲۷ مارچ سنہ ۶۲۴ء	۱۷ مارچ سنہ ۶۲۵ء	۶ مارچ سنہ ۶۲۶ء	۲۴ مارچ سنہ ۶۲۷ء

ہجرت یثرب سے وفات کی تفصیلی تاریخیں

	عام السوال	عام الفتح	عام المساوات	عام البرأة	عام الوداع	
تاریخ ہجری	سنہ ۶ھ	سنہ ۷ھ	سنہ ۸ھ	سنہ ۹ھ	سنہ ۱۰ھ	سنہ ۱۱ھ
یکم محرم	۲۳-اپریل سنہ ۶۲۶ء	۱۲-اپریل سنہ ۶۲۸ء	یکم اپریل سنہ ۶۲۹ء	۲۰-اپریل سنہ ۶۳۰ء	۹-اپریل سنہ ۶۳۱ء	۲۹ مارچ سنہ ۶۳۲ء
یکم صفر الاول	۲۳-مئی سنہ ۶۲۶ء	۱۱ مئی سنہ ۶۲۸ء	یکم مئی سنہ ۶۲۹ء	۲۰ مئی سنہ ۶۳۰ء	۹ مئی سنہ ۶۳۱ء	۲۸ اپریل سنہ ۶۳۲ء
(نسی) یکم صفر الثانی	—	—	۳۱ مئی سنہ ۶۲۹ء	—	—	—
یکم ربیع الاول	۲۳ جون سنہ ۶۲۷ء	۱۰ جون سنہ ۶۲۸ء	۲۹ جون سنہ ۶۲۹ء	۱۸ جون سنہ ۶۳۰ء	۷ جون سنہ ۶۳۱ء	۲۷ مئی سنہ ۶۳۲ء
یکم ربیع الثانی	۲۱ جولائی سنہ ۶۲۷ء	۹ جولائی سنہ ۶۲۸ء	۲۹ جولائی سنہ ۶۲۹ء	۱۸ جولائی سنہ ۶۳۰ء	۷ جولائی سنہ ۶۳۱ء	۲۶ جون سنہ ۶۳۲ء
یکم جمادی الاول	۲۰-اگست سنہ ۶۲۶ء	۸-اگست سنہ ۶۲۸	۲۷-اگست سنہ ۶۲۹	۱۶-اگست سنہ ۶۳۰ء	۵-اگست سنہ ۶۳۱ء	۲۵ جولائی سنہ ۶۳۲ء
یکم جمادی الثانی	۱۸ ستمبر سنہ ۶۲۷ء	۶ ستمبر سنہ ۶۲۸ء	۲۶ ستمبر سنہ ۶۲۹ء	۱۵ ستمبر سنہ ۶۳۰ء	۴ ستمبر سنہ ۶۳۱ء	۲۴-اگست سنہ ۶۳۲ء
یکم رجب	۱۸-اکتوبر سنہ ۶۲۶ء	۶-اکتوبر سنہ ۶۲۸ء	۲۵-اکتوبر سنہ ۶۲۹ء	۱۴-اکتوبر سنہ ۶۳۰ء	۳-اکتوبر سنہ ۶۳۱ء	۲۲ ستمبر سنہ ۶۳۲ء
یکم شعبان	۱۶ نومبر سنہ ۶۲۷ء	۴ نومبر سنہ ۶۲۸ء	۲۴ نومبر سنہ ۶۲۹ء	۱۳ نومبر سنہ ۶۳۰ء	۲ نومبر سنہ ۶۳۱ء	۲۲-اکتوبر سنہ ۶۳۲ء
یکم رمضان	۱۶ دسمبر سنہ ۶۲۷ء	۴ دسمبر سنہ ۶۲۸ء	۲۳ دسمبر سنہ ۶۲۹ء	۱۲ دسمبر سنہ ۶۳۰ء	یکم دسمبر سنہ ۶۳۱ء	۲۰ نومبر سنہ ۶۳۲ء
یکم شوال	۱۴ جنوری سنہ ۶۲۸ء	۲ جنوری سنہ ۶۲۹ء	۲۲ جنوری سنہ ۶۳۰ء	۱۱ جنوری سنہ ۶۳۱ء	۳۱ دسمبر سنہ ۶۳۱ء	۲۰ دسمبر سنہ ۶۳۲ء
یکم ذی القعدہ	۱۳ فروری سنہ ۶۲۸ء	۱-فروری سنہ ۶۲۹ء	۲۰ فروری سنہ ۶۳۰ء	۹ فروری سنہ ۶۳۱ء	۲۹ جنوری سنہ ۶۳۲ء	۱۸ جنوری سنہ ۶۳۳ء
یکم ذی الحجہ	۱۳ مارچ سنہ ۶۲۸ء	۲-مارچ سنہ ۶۲۹ء	۲۲ مارچ سنہ ۶۳۰ء	۱۱ مارچ سنہ ۶۳۱ء	۲۸ فروری سنہ ۶۳۲ء	۱۷ فروری سنہ ۶۳۳ء

۸- مارچ سنہ ۶۳۲ء مطابق ۹- ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ اعلان ہوا، کہ:-

اَلنَّسِیُّ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ

اس سال سے نسیّ نہیں ہوئی- اور خالص قمری سال جاری رہا +